تقابلی مطالعہ پروگرام

مسلم دنیا میں پائے جانے والے گروہوں کا تقابلی مطالعہ

ماڈیول CS05: تصوف اور اس کے ناقدین

محمد مبشر نذیر

www.islamic-studies.info

فہرست

اگر آپ نے اس پروگرام کے تعارف کا مطالعہ نہیں کیا تو اس کتاب کے پڑھنے سے پہلے اس کا مطالعہ کر لیجیے۔ تعارف کو ڈاؤن لوڈ کرنے کے لیے وزٹ کیجیے۔

www.mubashirnazir.org/courses/comparative/CS001-01-Introduction.htm

اس پروگرام کا مقصد کیا ہے اور یہ کس کے لیے ہے؟

اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ امت مسلمہ کے مختلف گروہوں اور مکاتب فکر کے مابین جو اختلافات پائے جاتے ہیں، ان کا ایک غیر جانبدارانہ (Impartial) مطالعہ کیا جائے اور ان کے نقطہ نظر کے ساتھ ساتھ ان کے استدلال کا جائزہ بھی لیا جائے۔

اس پروگرام میں ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ تمام نقطہ ہائے نظر کو، جیسا کہ وہیں ہیں، بغیر کسی اضافے یا کمی کے بیان کر دیا جائے۔ ان کے بنیادی دلائل بھی جیسا کہ ان کے حاملین بیان کرتے ہیں، واضح طور پر بیان کر دیے جائیں۔ ہم نے کسی معاملے میں اپنا نقطہ نظر بیان نہیں کیا اور نہ ہی کوئی فیصلہ سنایا ہے کہ کون سا نقطہ نظر درست اور کون سا غلط ہے۔ یہ فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے۔

یہ پروگرام ان لوگوں کے لیے ہے جو:

- وسیع النظر ہوں
- مثبت انداز میں مختلف نقطہ ہائے نظر کو سمجھنا چاہتے ہوں
- منفی اور تردیدی ذہنیت کی رو سے مطالعہ نہ کرتے ہوں
- دلیل کی بنیاد پر نظریات بناتے ہوں نہ کہ جذبات کی بنیاد پر
- اپنے سے مختلف نظریہ کو کھلے ذہن پڑھ سکتے ہوں اور اس میں کوئی تنگی اپنے سینے میں محسوس نہ کرتے ہوں

اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ میں یہ خصوصیات موجود ہیں، تو آپ کا تعلق خواہ کسی بھی مکتب فکر سے ہو، آپ اس پروگرام میں شامل کتب کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ خصوصیات آپ میں موجود نہیں ہیں، تو پھر یہ سلسلہ ہائے کتب آپ کے لیے نہیں ہے۔

حصہ اول: تصوف کا تعارف

باب 1: تصوف کا تعارف

تصوف یا صوفی ازم بالعموم اس فن اور طرز زندگی کو کہا جاتا ہے جس کا تعلق روحانیت سے ہو۔ تصوف سے وابستہ حضرات "صوفی" کہلاتے ہیں۔ اس ماڈیول میں ہم تصوف کا مطالعہ کریں گے اور اس سے متعلق مختلف نقطہ ہائے نظر کا جائزہ لے کر ان کے دلائل پیش کریں گے۔

اس ماڈیول کا اسلوب دوسرے ماڈیولز سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ پچھلے ماڈیولز میں ہم نے مختلف مسائل پر براہ راست مختلف نقطہ ہائے نظر بیان کر کے ان کے دلائل کو بیان کرنا شروع کر دیا تھا۔ مگر اس ماڈیول کو ہم نے دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ پہلے حصے میں ہم اس بات کا مطالعہ کریں گے کہ تصوف یا صوفی ازم دراصل کیا چیز ہے؟ اس کے مقاصد کیا ہیں اور ان مقاصد کے حصول کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا گیا ہے؟ اہل تصوف کے عقائد و نظریات کیا ہیں؟ صوفی حضرات کن امور اور مشاغل میں مصروف رہتے ہیں اور ان کو کس طریقے سے منظم کیا جاتا ہے؟ اس کے بعد دوسرے حصے میں ہم یہ دیکھیں گے کہ تصوف سے متعلق کیا کیا نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں اور ان کے دلائل کیا ہیں؟ اس کا دین اسلام سے کیا تعلق ہے؟

تصوف کیا ہے؟

تصوف کی تعریف

تصوف کی ایک جامع و مانع تعریف ممکن نہیں ہے۔ شام کے ایک بڑے صوفی عالم شیخ عبدالقادر بن عیسی (1991-1919) نے اپنی عربی کتاب "حقائق عن التصوف" میں اس لفظ کے متعدد ماخذ بیان کرتے ہوئے متعدد تعریفیں بیان کی ہیں جو کہ یہ ہیں:

- تصوف اور صوفی، "صفت" سے نکلے ہیں کیونکہ تصوف وہ علم ہے جس میں اچھی صفات پیدا کرنے اور بری صفات دور کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔
- تصوف کا لفظ "صوف" سے نکلا ہے جس کا معنی ہے اون۔ چونکہ قدیم دور کے صوفی حضرات سادگی کے لیے اون یا کھدر کا کھردرا لباس پہنا کرتے تھے، اس وجہ سے وہ صوفی کہلائے۔
- تصوف کا لفظ "صفہ" سے نکلا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہ صحابہ رضی اللہ عنہم جو کہ صفہ نامی چبوترے پر نہایت ہی غربت کے عالم میں رہا کرتے تھے اور آپ سے دین کی تعلیم حاصل کیا کرتے تھے، اصحاب صفہ کہلاتے ہیں۔ اہل تصوف کا کہنا یہ ہے کہ یہی لوگ تصوف کے سرخیل تھے، اس وجہ سے انہی کی مناسبت سے اس فن کا نام تصوف پڑ گیا۔

- تصوف کا لفظ "صفوت" سے نکلا ہے جس کا معنی ہے بہترین لوگ۔ یہ تعریف تصوف کے امام ابو القاسم القشیری (376-465/986-1072) کی ہے۔
- تصوف کا لفظ "صف" سے نکلا ہے۔ چونکہ اہل تصوف نیک لوگوں کی صف اول میں شامل ہیں، اس وجہ سے انہیں صوفی کہا گیا۔

یہ تعریفیں بیان کر کے شیخ عبد القادر عیسی نے درست طور پر لکھا ہے کہ تصوف اتنا مشہور ہے کہ اس کی تعریف کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ تعریف کرنے کی بجائے اگر ہم اہل تصوف کے معاملات کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کچھ امور مشترک ہیں جو کہ یہ ہیں:

- اللہ تعالی سے لو لگانا اور اسی کی یاد میں زندگی بسر کرنا
- دنیا سے بے رغبتی اور بسا اوقات ترک دنیا
- مراقبہ کشی، چلہ کشی اور روحانی نوعیت کی کاوشیں
- کسی شیخ، مرشد، یا پیر سے بیعت کر کے خود کو کامل طور پر اس کے سپرد کر دینا
- تزکیہ نفس یعنی اپنی شخصیت میں اچھے محاسن کو فروغ دینا اور اسے دل کی بیماریوں سے بچانا
- مزارات اور قبور سے قربت
- کرامات اور خارق عادت واقعات پر زور دینا

یہ وہ امور ہیں جو تقریباً تمام صوفیاء میں پائے جاتے ہیں۔ صوفی دو طرح کے ہوتے ہیں: مخلص صوفی اور وہ لوگ جو مخلص نہیں ہوتے مگر انہوں نے دنیاوی مفادات کے لیے صوفیت کا لبادہ اوڑھ رکھا ہوتا ہے۔ ان لوگوں میں "تزکیہ نفس" کا معاملہ نہیں پایا جاتا البتہ دیگر امور میں وہ پیش پیش ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس مخلص صوفیاء میں تزکیہ نفس سمیت اوپر بیان کردہ تمام امور پائے جاتے ہیں۔

ان امور کا اگر بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ امور صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہیں ہیں۔ دیگر مذاہب میں بھی ایسے لوگ بکثرت پائے جاتے ہیں جو دنیا ترک کر کے اپنی زندگی کو خالصتاً اپنے معبود کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ ان میں بھی بالعموم اوپر بیان کردہ تمام چیزیں پائی جاتی ہیں۔ عیسائیوں کی رہبانیت، یہودیوں کا کبالہ، ہندوؤں اور بدھوں کا یوگ اور سنیاس ان مذاہب کا تصوف ہی ہے۔

تصوف کے بعض ناقدین کا کہنا یہ ہے کہ مسلمانوں کے تصوف پر دیگر اقوام کے تصوف کا اثر پڑا ہے مگر اہل تصوف اس بات کی سختی سے تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کا تصوف خالصتاً دین اسلام سے ماخوذ ہے۔

تصوف کی اصطلاحات

مناسب ہو گا کہ آگے بڑھنے سے پہلے ہم اہل تصوف کی چند اصطلاحات کا معنی بیان کر دیں تا کہ بعد کی بحثوں میں ان کا مفہوم سمجھنے میں مشکل نہ ہو۔

- **سیر:** سفر، نقل و حرکت یا پراگریس۔ اہل تصوف کے نزدیک "سیر" انسان کی اس سفر میں پراگریس کا نام ہے، جو اللہ تعالی کی جانب ہو۔ اسی کو "راہ سلوک" بھی کہا جاتا ہے۔ تصوف وہ فن ہے جس کی مدد سے یہ سفر طے کیا جاتا ہے۔
- **سالک:** راہ سلوک پر چلنے والا۔ وہ شخص جو اللہ تعالی کی جانب سفر کرنے کا عزم کرے۔
- **مرشد:** (ش پر زیر کے ساتھ): راہ سلوک میں راہنما۔ اسے ہماری عام زبان میں "پیر" یا "شیخ" بھی کہا جاتا ہے۔
- **مرید:** وہ شخص جو راہ سلوک پر چلنے کے لیے کسی مرشد کی راہنمائی حاصل کرنے کے اس کے ہاتھ پر بیعت کرے۔ اسے تصوف کی زبان میں "مسترشد" بھی کہا جاتا ہے جس کا معنی ہے ہدایت کا طالب۔
- **بیعت:** بیعت کا لفظی معنی ہے بیچنا۔ اصطلاحی مفہوم میں اس کا مطلب ہوتا ہے کسی کے ساتھ ایسا معاہدہ کرنا جس میں اس کی حمایت کا عزم کیا گیا ہو۔ اہل تصوف کی اصطلاح میں بیعت اس معاہدے کو کہتے ہیں جس میں ایک مرید، اپنے پیر کے ساتھ یہ وعدہ کرتا ہے کہ وہ اس کی پیروی کرے گا جبکہ پیر اس سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ راہ سلوک میں اس کی راہنمائی کرے گا۔ اس طرح مرید، گویا خود کو پیر کے ہاتھوں بیچ دیتا ہے۔
- **صحبت:** ساتھ رہنا۔ اہل تصوف کے نزدیک اس کا مطلب صوفی حضرات کے ساتھ رہنا ہوتا ہے۔
- **خانقاہ:** یہ ایک تربیت گاہ یا ادارہ ہوتا ہے جہاں ایک صوفی شیخ اپنے مریدین اور سالکین کی تربیت کرتا ہے۔ برصغیر جنوبی ایشیا میں جو خانقاہیں بنیں، ان میں مسجد، مزار اور رہائشی کمرے موجود ہوتے تھے۔ ہر خانقاہ کا خاص حصہ لنگر ہوا کرتا تھا جو کہ ہر خاص و عام کے لیے جاری ہوتا اور کوئی بھی شخص یہاں آکر کھانا کھا سکتا تھا۔ اب بھی متعدد خانقاہیں پائی جاتی ہیں مگر ان میں تربیت کا وہ سلسلہ اور معیار نہیں رہا جو قرون وسطی کی صوفی خانقاہوں میں ہوا کرتا تھا۔ عربوں کے ہاں خانقاہ کو "رباط" کہا جاتا ہے جبکہ شمالی افریقہ میں اس کا نام "زاویہ" ہے۔
- **شریعت:** دین کے وہ احکام جو ظاہر و باطن دونوں کے لیے ہیں۔
- **طریقت:** شریعت کے علاوہ وہ اضافی طریقے جن کے ذریعے اللہ تعالی تک پہنچا جا سکتا ہے۔ ان میں اذکار و اوراد، وظائف، مراقبہ وغیرہ شامل ہے۔
- **حقیقت:** دل پر بعض اعمال اور اشیاء سے متعلق حقائق کے انکشاف کو حقیقت کہا جاتا ہے۔

- **معرفت:** خدا اور بندے کے درمیان تعلق کا ادراک۔

ان کے علاوہ اہل تصوف کی متعدد اصطلاحات ہیں، جن کی تفصیل ہم اپنے اپنے مقام پر بیان کریں گے۔

تصوف کا مقصد

اہل تصوف، تصوف کا مقصد وہ بیان کرتے ہیں جو قرآن کریم کی ان آیات کریمہ میں بیان ہوا ہے:

وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا (7) فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (8) قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا (9) وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا (10)

نفس کی قسم اور اس [اللہ] کی جس نے اسے سنوارا۔ پھر اس نے اس کی برائی اور اس کا تقوی اس کی جانب الہام کر دیا۔ جس نے اسے پاکیزہ کر لیا، وہ فلاح پا گیا اور جس نے اسے دبا دیا، وہ نامراد ہوا۔ (الشمس)

اہل تصوف کا کہنا یہ ہے کہ اسی نفس انسانی کو سنوارنے اور اس کا تزکیہ کرنے کا نام تصوف ہے۔ تمام دینی احکام کے دو پہلو ہوتے ہیں: ایک ظاہری اور دوسرا باطنی۔ مثال کے طور پر زکوۃ کو لیجیے۔ ایک اس کا ظاہری پہلو ہے جس میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ زکوۃ کب دینی ہے؟ کتنی دینی ہے؟ کس مال پر زکوۃ عائد ہو گی اور کس پر نہیں؟ ان سب سوالات کا جواب "علم الفقہ" میں ملتا ہے۔ زکوۃ کا باطنی پہلو یہ ہے کہ زکوۃ خالصتاً اللہ تعالی کے لیے دی جائے۔ اس میں دکھاوا نہ ہو اور نہ ہی جس شخص کو مال دیا جائے، اسے ذلیل کیا جائے۔ اہل تصوف کا کہنا یہ ہے کہ اس باطنی پہلو کی اصلاح "علم التصوف" کا کام ہے۔ اس نقطہ نظر کی نمائندگی کرتے ہوئے صوفی بزرگ سید شبیر احمد کاکاخیل لکھتے ہیں:

> حقیقت میں کچھ اعمال ایسے ہوتے ہیں جو ظاہراً کرنے کے ہوتے ہیں جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ۔ اور کچھ اعمال ایسے ہوتے ہیں جو کہ دل کے اعمال ہوتے ہیں جن کا پتہ کسی اور کو نہیں چلتا اس کا پتہ صرف اللہ تعالیٰ کو یا کرنے والے کو ہوتا ہے اور ان ہی اعمال پر ظاہری اعمال منحصر ہوتے ہیں۔ اگر کسی کے یہ دل والے اعمال درست نہ ہوں تو چاہے اس کے ظاہر کے اعمال کتنے ہی درست ہوں وہ قبولیت کا درجہ نہیں پاتے۔ یا بعض دفعہ یہ ظاہری اعمال ان باطنی اعمال کی خرابی کی وجہ سے ضائع ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ان باطنی یعنی دل کے اعمال کا درست کرنا بھی ضروری بلکہ اشد ضروری ہوا۔ پس وہ طور طریقے اختیار کرنا جن سے یہ دل والے اعمال درست ہو جائیں تصوف کہلاتا ہے۔ شریعت کے طور طریقوں کو چونکہ فقہ بھی کہتے ہیں لہٰذا ان معنوں میں تصوف کو فقہ الباطن بھی کہا جاتا ہے۔۔۔۔۔
>
> اس کو کوئی زہد کہہ دے یا تقویٰ، احسان کہہ دے یا تصوف، اس میں کام دلوں کی صفائی کا کیا جاتا ہے۔ دل میں کان، زبان، ناک اور ذہن کے ذریعے ہر دم جو آلودگیاں آتی ہیں ان کا تدارک اور تلافی کی جاتی ہے، انسان کو انسان اور مسلمان کو مسلمان بنایا جاتا ہے۔ دلوں سے تکبر، عجب، حسد، کینہ، ریاء، بدگمانی، خود پسندی وغیرہ کو نکال کر اس میں تواضع، مسکینی، اخلاص، نیک گمانی، تفویض، توکل اور خود احتسابی پیدا کی جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسان کے دل کو مادہ پرستی سے نکال کر خدا پرستی کی طرف ڈالا جاتا ہے۔ اس کو ہر دم یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ تو کہاں سے آیا ہے اور کہاں جانا ہے؟ اور جہاں جانا ہے وہاں کیا ہو گا اور اس کے لئے کیا کرنا ہے؟ بس کرنا تو وہی شریعت کی اتباع ہے کہ ہمیں اسی کے لئے تو پیدا کیا گیا ہے لیکن تصوف میں اس پر زور دیا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے کرنا ہے۔[1]

سادہ الفاظ میں فاضل مصنف کے نزدیک تصوف کا معنی ہے، انسانی شخصیت میں موجود چھپی ہوئی برائیوں سے اسے پاک کرنا اور اس میں موجود نیکیوں کو نشوونما دینا۔ اسے قرآن مجید میں "تزکیہ نفس" کا نام دیا گیا ہے اور اسی کو دین اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد قرار دیا گیا ہے۔

تزکیہ نفس کے مفہوم میں غیر صوفی اور صوفی علماء کے مابین کچھ فرق پایا جاتا ہے۔ غیر صوفی علماء کے نزدیک "تزکیہ نفس" سے مراد اپنی اصلاح کرنا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے قلب کو برائیوں سے پاک کر کے ان میں نیکیوں کو نشوونما دے۔ اس کے برعکس صوفی بزرگوں کے نزدیک، "تزکیہ نفس" صرف یہاں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس سے کہیں آگے ہے۔

صوفیاء کے نزدیک تصوف ایک سفر ہے جو کہ اللہ تعالی کی طرف ہے۔ اسے وہ "سیر الی اللہ" کے عنوان سے تعبیر کرتے ہیں جس کا مطلب ہے "اللہ کی جانب سفر"۔ عربی میں "سیر" نقل و حرکت، سفر یا آگے بڑھنے (Progression) کو کہتے ہیں۔ اس سیر کے دوران سالک (یعنی سفر کرنے والا) اپنے مرشد کی نگرانی میں اپنا تزکیہ نفس کرتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے وہ ایک خاص مقام پر پہنچ جاتا ہے تو پھر یہ "سیر فی اللہ" کہلاتی ہے یعنی "اللہ میں سفر"۔ اس کی کوئی حد ان کے نزدیک مقرر نہیں ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر سفر کرنے والا، جو کہ "سالک" کہلاتا ہے، اللہ تعالی کے انوار و تجلیات کا براہ راست مشاہدہ کرتا ہے۔ یہ سیر، صوفی حضرات کے نزدیک تزکیہ نفس کے مفہوم میں داخل ہے۔ سید شبیر احمد کاکا خیل لکھتے ہیں:

> سیر الی اللہ کے بعد قلب کے اندر تزکیہ اور تقویٰ سے ایک خاص جلاء اور نور پیدا ہوتا ہے اور سالک برابر قلب کو ماسواء اللہ [یعنی جو کچھ اللہ کے سوا ہے] سے فارغ کرتا رہتا ہے تو حق تعالیٰ کی ذات و صفات اور افعال نیز حقائق کونیہ [یعنی کائنات کی حقیقتیں] اور حقائق اعمال شرعیہ [یعنی شرعی احکام کی حقیقتیں] سالک کے دل پر منکشف ہو جاتے ہیں، جس سے اس کا خالق کے ساتھ قرب میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور وہ عین الیقین [یعنی دیکھ کر یقین کرنا] سے حق الیقین [یعنی تجربہ کر کے یقین کرنا] تک سفر کرتا رہتا ہے۔ اس کو سیر فی اللہ کہتے ہیں جس کی کوئی حد نہیں جتنا حصّہ جس نے اللہ تعالیٰ کے فضل سے اپنی استعداد کے مطابق پایا وہ اس کا حصّہ ہے۔ موت تک سالک کی یہ سیر جاری رہتی ہے اور تفرید [کسی چیز کو اپنی طرف منسوب نہ کرنا] اور تجرید [دنیاوی و اخروی اغراض کو ترک کر دینا] کے ذریعے قرب میں ترقی کرتا رہتا ہے۔ اس میں چاہے شیخ سے مُرید بڑھ جائے، یہ بھی ممکن ہے۔[2]

صوفی سلسلے

تصوف میں پیر اور مرید کا رشتہ اساسی نوعیت کا حامل ہے۔ اہل تصوف کے نزدیک نسبت اور تعلق کی اہمیت بہت زیادہ ہوا کرتی ہے۔ ایک مرید اپنے مرشد سے وابستہ ہوتا ہے، وہ اپنے مرشد سے، اور وہ اپنے مرشد سے۔ اس طرح یہ سلسلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچ جاتا ہے۔ اسے تصوف کی اصطلاح میں "سلسلہ" کہا جاتا ہے۔ ہر سلسلے کو اپنے کسی مشہور بزرگ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

جنوبی ایشیا کے صوفیاء میں زیادہ تر چار سلسلے پائے جاتے ہیں۔ ان میں سب سے مشہور سلسلہ چشتیہ ہے جو خواجہ معین الدین چشتی (535-627/1141-1230) سے منسوب ہے۔ اس کے علاوہ نقشبندی، قادری اور سہروردی سلسلے بھی پائے جاتے ہیں جو بالترتیب خواجہ بہاء الدین نقشبند (717-791/1318-1389)، شیخ عبدالقادر جیلانی (470-561/1077-1166) اور شیخ شہاب الدین سہروردی (543-632/1148-1234) سے منسوب ہیں۔ چشتی، قادری اور سہروردی سلسلوں کا کہنا یہ ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وساطت سے اپنا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قائم کرتے ہیں جبکہ نقشبندی سلسلہ کے شیوخ کا موقف یہ ہے کہ وہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وساطت سے ایسا کرتے ہیں۔ یہی سلسلہ وسطی ایشیا اور ترکی میں بھی پھیلا ہوا ہے۔

ان میں سے ہر سلسلے کی پھر متعدد شاخیں ہیں۔ مثلاً چشتی سلسلے کی دو بڑی شاخیں ہیں جو صابری اور نظامی کہلاتی ہیں۔ صابری، شیخ صابر کلیری (592-690/1196-1291) سے اور نظامی حضرت نظام الدین اولیاء (635-725/1238-1325) سے منسوب ہیں۔ نقشبندی سلسلے کی مشہور ترین شاخ مجددی ہے جو شیخ احمد سرہندی المعروف بہ مجدد الف ثانی (971-1034/1564-1624) سے منسوب ہے۔ برصغیر کے زیادہ تر نقشبندی حضرات کا تعلق مجددی شاخ سے ہوتا ہے۔ وسطی ایشیا میں اس کی اور شاخیں بھی پائی جاتی ہیں۔

جنوبی ایشیا سے باہر متعدد سلسلے پائے جاتے ہیں جن میں رفاعی، شاذلی، تیجانی، بختاشی، مولوی، سنوسی، تیجانی، نعمت اللہی، قلندری، نوربخشی سلسلے مشہور ہیں۔ شام، لبنان، کویت اور مصر میں بالعموم رفاعی اور شاذلی سلسلے زیادہ پھیلے ہوئے ہیں۔ ترکی میں زیادہ تر مولویہ سلسلہ پایا جاتا ہے جو مولانا روم (603-671/1207-1273) سے منسوب ہے۔ شمالی افریقہ میں سنوسی اور تیجانی، ایران میں نعمت اللہی، مشرقی یورپ میں بختاشی اور انڈونیشیا میں نقشبندی اور قادری سلسلے زیادہ پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں بعض سلسلے، مشہور سلسلوں ہی کی شاخیں ہیں۔

ان معروف سلسلوں کے علاوہ ایک سلسلہ اویسیہ بھی ہے جس میں شامل شیوخ کا کہنا یہ ہے کہ وہ براہ راست حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ کی روح سے فیوض و برکات حاصل کرتے ہیں جو کہ ایک تابعی بزرگ تھے۔ دیگر سلسلوں سے تعلق رکھنے والے افراد بالعموم اسے تسلیم نہیں کرتے۔ اویسی سلسلے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک مرید، صدیوں پہلے کے کسی شیخ سے براہ راست تعلق قائم کرنے کا دعوی کر سکتا ہے جبکہ باقی سلسلوں میں یہ ضروری ہے کہ مرید کسی ایسے شیخ سے تعلق رکھے، جو اس کے زمانے میں موجود ہو۔

ان صوفی سلسلوں میں تصوف کے بنیادی مقاصد کے بارے میں اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔ بعض امور جیسے اوراد و اشغال، ذکر کے طریقے اور روحانی مشقوں کے بارے میں ان میں کچھ فرق پائے جاتے ہیں مگر ان تمام سلسلوں کے لوگ دوسرے سلسلوں کا احترام کرتے ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ اپنے اپنے سلسلوں ہی کو سب سے افضل سمجھتے ہیں۔

تصوف کے مآخذ اور امہات کتب

اہل تصوف کی غالب اکثریت کا موقف یہ ہے کہ ان کے عقائد و نظریات اور اعمال کا ماخذ قرآن و سنت ہی ہے۔ اس کے علاوہ صوفیاء، سابق صوفی بزرگوں کی کتب، حالات زندگی، واقعات، عمل اور ملفوظات (اقوال) کو بھی بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔

صوفیاء کے ہاں کتابیں لکھنے کا رواج کم ہی رہا ہے تاہم بعض بڑے صوفی بزرگوں نے کتابیں بھی لکھی ہیں۔ ان میں سے بعض کتب کو امہات فن (یعنی کسی فن کی اساسی کتب) کا مقام حاصل ہے۔ ان میں سے مشہور یہ ہیں:

قوت القلوب

یہ چوتھی صدی ہجری کے بڑے صوفی بزرگ ابو طالب مکی (d. 386/996) کی تصنیف ہے۔ مصنف نے اس کتاب کو قُوت القلوب یعنی دلوں کی غذا قرار دیا ہے۔ کتاب کے شروع کے ابواب میں فاضلؒ مصنف نے تفصیل سے صوفیاء کے اشغال کا ذکر کیا ہے جن میں نفلی نمازیں، روزے، ذکر اور اوراد شامل ہیں۔ بعد کے ابواب میں انہوں نے صوفیانہ سفر کے مقامات، مراقبہ، عقائد، گناہ کبیرہ، شریعت کی پابندی، اخلاص، ترک دنیا وغیرہ جیسے امور پر روشنی ڈالی ہے۔ آخری ابواب میں انہوں نے دنیاوی زندگی کے اہم امور پر بحث کی ہے جن میں شادی، حمام میں نہانا، خرید و فروخت اور حلال و حرام سے متعلق معاملات شامل ہیں۔ یہ کتاب تصوف کی بنیادی کتب میں سے ایک ہے۔

رسالہ قشیریہ

یہ پانچویں صدی ہجری کے ایک بہت بڑے صوفی بزرگ ابو القاسم القشیری (376-465/986-1072) کی تصنیف ہے۔ انہوں نے کتاب کا آغاز توحید کے مباحث سے کیا ہے، پھر شریعت کی اہمیت کو بیان کیا ہے اور اس کے ضمن میں بہت سے صوفی بزرگوں کے احوال درج کیے ہیں جنہوں نے شریعت کو اپنی زندگی میں اہمیت دی۔ اس کے بعد ایک باب میں انہوں نے تصوف کی اصطلاحات کی شرح و وضاحت کی ہے۔ بعد کے ابواب تزکیہ نفس سے متعلق ہیں جن میں توبہ، مجاہدہ، تقوی، زہد، خوف، رجاء، حسد، غیبت، توکل وغیرہ سے متعلق ابواب ہیں۔ کتاب کے آخر میں انہوں نے اہل تصوف کے آداب بیان کیے ہیں جن میں فقر، ترک دنیا، سماع، کرامات اور شیوخ کے ساتھ تعلق سے متعلق مباحث شامل ہیں۔ یہ کتاب فن تصوف میں بنیادی کتاب مانی جاتی ہے۔

کشف المحجوب

یہ لاہور میں مدفون مشہور بزرگ حضرت علی ہجویری (c. 379-465/990-1072) کی تصنیف ہے جو کہ داتا گنج بخش کے لقب سے مشہور ہیں۔ اصل کتاب فارسی زبان میں ہے۔ یہ تصوف کی مشہور ترین کتب میں سے ایک ہے اور اس میں وہ تمام امور زیر بحث لائے

گئے ہیں جن کی ایک صوفی کو ضرورت پڑتی ہے۔

منازل السائرین

یہ عبداللہ انصاری الہروی (d. 481/1088) کی تصنیف ہے جو کہ شرعی علوم کے ایک بڑے عالم تھے اور شیخ الاسلام کے منصب پر فائز تھے۔ مصنف نے کتاب کو دس حصوں میں تقسیم کیا ہے جن کے لیے وہ "قسم" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ کتاب کا آغاز "قسم البدایہ" نامی حصے سے ہوتا ہے جس میں مصنف توبہ، محاسبہ، تفکر، ریاضت، ذکر جیسے مباحث زیر بحث لائے ہیں۔ دوسرے حصے "قسم الابواب" میں مصنف حزن، خوف، خشوع، زہد جیسے معاملات پر بحث کرتے ہیں۔ پھر "قسم المعاملات" ہے جس میں مراقبہ، اخلاص، استقامت اور توکل جیسے مضامین پر گفتگو ہے۔ اس کے بعد "قسم الاخلاق" ہے جس میں صبر، شکر، حیاء، صدق، تواضع وغیرہ بیان کیے گئے ہیں۔ بقیہ اقسام میں متعدد نفسی امور زیر بحث آئے ہیں۔

اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ یہ ناقدین تصوف کے ہاں بھی بہت مقبول رہی ہے اور مشہور ناقد تصوف علامہ ابن قیم (691-751/1292-1350) نے اس کی شرح "مدارج السالکین" کے نام سے لکھی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ شیخ ہروی، علوم شرعیہ کے بھی بہت بڑے عالم تھے۔

احیاء العلوم الدین

یہ مشہور ترین صوفی عالم، ماہر نفسیات اور فلسفی امام غزالی (450-505/1058-1111) کی تصنیف ہے اور اس درجے کی تصنیف ہے کہ بعد کی صدیوں میں پورے ایک ہزار برس تک امت مسلمہ کے ذہین ترین افراد کے طرز فکر پر یہ کتاب چھائی رہی ہے۔ مصنف ایک اعلی درجے کے ماہر نفسیات تھے، اور ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے انسانی نفسیات سے متعلق اپنے علم کو تزکیہ نفس کے لیے استعمال کیا ہے۔ بعد کے صوفی حلقوں میں جہاں جہاں علم نفسیات کو تزکیہ نفس کے لیے استعمال کیا گیا، اس کی بنیاد اسی کتاب میں ملتی ہے۔ اس کتاب میں غالباً پہلی مرتبہ کسی مصنف نے دین اسلام کو ایک مکمل عقلی نظام کے طور پر پیش کیا۔

فاضل مصنف اپنی کتاب کا آغاز علم کی اہمیت سے کرتے ہیں اور اس سے متعلق مباحث کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد اسلامی عقائد پر گفتگو کرتے ہیں۔ پھر دین کے ایک ایک حکم جیسے نماز، زکوۃ وغیرہ کو لے کر نہ صرف ان کے احکام بیان کرتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان کے اسرار اور حکمتیں بیان کرتے ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کی علمی تاریخ میں غزالی غالباً پہلے عالم ہیں جنہوں نے احکام کی عقلی حکمتوں اور وجوہات کو باقاعدہ موضوع بنا کر اس پر کتاب لکھی۔ اس کے بعد مصنف اپنی کتاب کو فقہ کی کتابوں کے ابواب پر ترتیب دیتے ہوئے زندگی کے ہر ہر گوشے سے متعلق ایسی ہی تفصیلات بیان کرتے چلے جاتے ہیں جن میں نماز، زکوۃ، روزہ، حج، نکاح و طلاق، امر بالمعروف، تجارت، معیشت، سیاست، حکومت، احتساب، خور و نوش وغیرہ تمام معاملات شامل ہیں۔ یہ موضوعات کتاب کی پہلی دو جلدوں پر محیط ہیں۔ مصنف نے ان امور سے متعلق محض فقہی مسائل ہی بیان نہیں کیے بلکہ ان کے ساتھ

ساتھ ان کے فلسفہ، روح اور ان کی اخلاقی حدود و قیود پر بھی بحث کی ہے۔ اس اعتبار سے اس کتاب کا درجہ فقہ کی عام کتابوں سے کہیں بلند ہے۔

کتاب کا تیسرا حصہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اور نفسیات سے متعلق مصنف کے علم کا شاہکار ہے۔ مصنف نہایت تفصیل کے ساتھ قلب انسانی کی بیماریوں کا جائزہ لیتے ہیں اور ان کا علاج تجویز کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس میں وہ تفصیل سے ان روحانی امراض پر بھی گفتگو کرتے ہیں جن میں ان کے دور کے مذہبی علماء گرفتار تھے۔ ان امراض میں تکبر، حسد، غیبت، اقتدار کی خواہش، مال کی محبت، ریاکاری وغیرہ شامل ہیں۔ وہ نہ صرف علماء بلکہ صوفیاء کو بھی نہیں چھوڑتے اور ان کے امراض کا کچا چٹھہ کھول کر بیان کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ معاشرے کے دیگر طبقات جیسے امراء و سلاطین، تاجروں وغیرہ میں پائی جانے والی بیماریوں کو بھی بیان کرتے ہیں۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ ان روحانی امراض کے بیان تک ہی خود کو محدود نہیں رکھتے بلکہ ان امراض کی نفسیاتی وجوہات، علامات، اثرات اور نتائج سبھی پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کرتے ہیں۔ کتاب کا چوتھا حصہ انسانی شخصیت میں مثبت قوتوں کے فروغ سے متعلق ہے۔ ان میں صبر، شکر، خوف خدا، امید، زہد، توکل، اخلاص، محاسبہ اور غور و فکر جیسے اہم موضوعات شامل ہیں۔

احیاء العلوم کو جہاں علمی حلقوں میں غیر معمولی فروغ حاصل ہوا، وہاں اس پر شدید تنقید بھی ہوئی۔ غزالی کے بعض ہم عصر علماء نے تو ان پر کفر کا فتوی تک عائد کیا۔ تاہم بعد میں یہ رجحان کم ہوا اور اس کتاب کو اس درجہ کی مقبولیت عامہ حاصل ہوئی کہ یہ مسلمانوں کی فکری قیادت کے دل و دماغ پر ایک ہزار برس سے چھائی رہی ہے۔ احیاء پر یہ اعتراض اب بھی کیا جاتا ہے کہ اس میں بہت کثیر تعداد میں ایسی احادیث موجود ہیں جنہیں محدثین نے "ضعیف" یعنی غیر مستند قرار دیا ہے۔ ان میں بعض روایات "موضوع" یعنی جعلی بھی ہیں۔ اس کتاب کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ بعض طالع آزماؤں نے اس میں کئی عبارات اپنی طرف سے ملا دی تھیں جس کے نتیجے میں کتاب میں بعض تضادات پیدا ہو گئے ہیں۔ اس کی مثال جلد دوم میں حلال و حرام کی بحث ہے۔ ایک جانب غزالی مشتبہ مال سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں مگر ساتھ ہی یہ بیان کر دیتے ہیں کہ وسوسوں سے بچنا چاہیے اور ان کی بنیاد پر وہم میں نہیں پڑ جانا چاہیے۔ دوسری طرف وہ بعض بزرگوں کے ایسے واقعات کو بطور آئیڈیل بیان کرتے ہیں جو خود اس قسم کی وسوسوں کا شکار تھے۔

عوارف المعارف

یہ سہروردی سلسلہ کے امام شیخ شہاب الدین سہروردی (543-632/1148-1234) کی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے تفصیل سے صوفیاء کے اخلاق پر بحث کی ہے اور دینی احکام کے اسرار پر گفتگو کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ صوفیاء کے مخصوص معاملات جیسے سماع، صحبت اور روحانی احوال کو زیر بحث لائے ہیں۔

فصوص الحکم

یہ ساتویں صدی ہجری کے بہت بڑے صوفی محی الدین ابن عربی (558-638/1164-1240) کی تصنیف ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جس نے

بعد کی صدیوں کے اہل تصوف کے عقائد و نظریات کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا اور کم و بیش سات سو برس تک اہل تصوف کے دل و دماغ پر چھائی رہی۔ یہ ایک نہایت ہی متنازعہ کتاب رہی ہے اور اس کی بعض عبارتوں سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف ختم نبوت کا انکار کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابن عربی پر بعض بڑے علماء، جن میں ابن تیمیہ (661-728/1263-1327) بھی شامل ہیں، نے کفر کا فتوی عائد کیا۔ ابن عربی کے عقیدت مند ان عبارات کو "الحاق" قرار دیتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ ان عبارات کو بعد میں کسی شخص نے مصنف کی کتابوں میں شامل کر دیا ہے۔ ابن عربی اور بھی بہت سی کتب کے مصنف تھے۔ انہوں نے ہی وحدت الوجود کا وہ نظریہ پیش کیا جو کہ اہل تصوف پر تنقید کا باعث بنا۔ اس کی تفصیل کا مطالعہ ہم اگلے ابواب میں کریں گے۔

مثنوی مولانا روم

یہ تصوف کی مقبول ترین کتاب ہے جو کہ مولانا جلال الدین رومی (603-671/1207-1273) نے فارسی زبان میں تصنیف کی۔ پوری کتاب ہزاروں اشعار پر مشتمل ایک طویل نظم پر مشتمل ہے۔ مصنف ترکی کے ایک بہت بڑے صوفی اور عالم تھے۔ انہوں نے نہایت خوبصورت اسلوب میں صوفیانہ نکات کو چھوٹی چھوٹی کہانیوں کی صورت میں بیان کر دیا ہے۔ بہت کم کتابوں کو اس درجے کی مقبولیت حاصل ہوئی ہو گی جو مثنوی کے حصے میں آئی۔ مصنف کے زمانے سے لے کر آج تک اہل تصوف اس کتاب کا درس دیتے چلے آئے ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ غزالی کی احیاء العلوم اور مولانا روم کی مثنوی، پچھلے آٹھ سو برس سے امت مسلمہ کی فکری قیادت کے دل و دماغ پر راج کرتی چلی آ رہی ہیں۔

مکتوبات امام ربانی

یہ شیخ احمد سرہندی (971-1034/1564-1624) کے خطوط کا مجموعہ ہے جو انہوں نے اپنے ساتھیوں اور مریدوں کو وقتاً فوقتاً لکھے۔ شیخ احمد "مجدد الف ثانی" کے نام سے معروف ہیں۔ اس میں تصوف کے بہت سے دقیق مسائل زیر بحث آئے ہیں۔ مصنف ابن عربی کے وحدت الوجود کے مقابلے میں ایک الگ مسلک "وحدت الشہود" کے بانی تھے، اس وجہ سے ان کی اہل تصوف میں ایک خاص اہمیت ہے۔ ان کی کاوشوں سے تصوف کی دنیا میں ایک غیر معمولی انقلاب برپا ہوا اور وحدت الوجود سے ہٹ کر ایک نئے طرز تصوف کی بنیاد پڑی۔ جنوبی اور وسطی ایشیا کے صوفیاء کے طرز فکر پر اس کتاب کے اثرات غیر معمولی ہیں۔

شاہ ولی اللہ کی کتب

شاہ ولی اللہ (1703-1762) نے تصوف کے موضوع پر پانچ کتابیں لکھیں جس میں انہوں نے تصوف کے اہم مباحث اور اور اس کی تاریخ کا خلاصہ کر دیا۔ ان کے پوتے شاہ اسماعیل (1779-1831) نے "عبقات" کے نام سے ان کی تمہید لکھی۔ ان کتب نے بھی برصغیر کے شریعت پسند صوفیاء کی فکر پر غیر معمولی اثرات مرتب کیے ہیں۔

ان کتب کے علاوہ اہل تصوف کے ہاں تقریباً ہر اہم صوفی شیخ کے حالات وواقعات پر مبنی تذکروں کی کتابیں ملتی ہیں۔ ان میں ان بزرگ کے حالات زندگی اور کرامات وغیرہ درج ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف شیوخ کے مریدین ان کی محفلوں میں ان کے قول و فعل کو نوٹ کر لیتے ہیں اور پھر اسے کتاب کی شکل میں شائع کر دیتے ہیں۔ انہیں "ملفوظات" کہا جاتا ہے۔ اہل تصوف عام طور پر اپنے سلسلے کے بزرگوں کے تذکروں اور ملفوظات کی کتب سے عام استفادہ کرتے ہیں۔ برصغیر کے چشتی سلسلہ کے صوفیاء میں حضرت نظام الدین اولیاء(635-725/1238-1325) کے ملفوظات پر مشتمل کتاب "فوائد الفوائد" کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اور اسے دیگر سلسلوں کے صوفیاء بھی تصوف کی امہات کتب میں شمار کرتے ہیں۔

تصوف سے متعلق نقطہ ہائے نظر

تصوف سے متعلق بنیادی طور پر دو نقطہ ہائے نظر کا ہم مطالعہ کریں گے۔ ایک اہل تصوف اور دوسرے ان کے ناقدین۔ اہل تصوف کو بھی ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں: ایک وہ صوفی حضرات جو شریعت کو مانتے ہیں اور اس کے بغیر کسی تصوف کے قائل نہیں ہیں۔ دوسرا گروہ ان صوفیاء کا ہے جو شریعت کو نہیں مانتے اور شرعی احکام کو بسا اوقات نظر حقارت سے دیکھتے ہیں۔ چونکہ ان دونوں گروہوں کا تصوف ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہے، اس وجہ سے ہم ان دونوں گروہوں کے نظریات اور اعمال کا تقابلی مطالعہ بھی کریں گے اور اس کا ان حضرات کے نقطہ نظر سے موازنہ کریں گے جو تصوف پر تنقید کرتے ہیں۔ اس طرح سے ہمارا مطالعہ اس ماڈیول میں تین گروہوں کے عقائد وافکار پر محیط ہو گا:

- مخالف شریعت صوفی
- پابند شریعت صوفی
- ناقدین تصوف

اب ہم ان گروہوں کا کچھ تفصیل سے تعارف کرواتے ہیں۔

مخالف شریعت صوفی

اس میں وہ لوگ شامل ہیں جو تصوف کا دعوی تو کرتے ہیں اور خود کو اللہ تعالی کا نمائندہ قرار دیتے ہیں مگر شریعت کی پابندی نہیں کرتے ہیں۔ ان میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں: ایک وہ غیر مخلص ہوتے ہیں اور تصوف کو محض دنیاداری کے لیے اختیار کرتے ہیں۔ چونکہ صوفی اور پیر فقیر عام لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں اور لوگ ان کے پاس دعا کروانے اور مرید ہونے کے لیے آتے ہیں، اس وجہ سے یہ حضرات تصوف کو اپنی کمائی کا ذریعہ بنا لیتے ہیں اور مریدوں کی آمدنی پر عیش کرتے ہیں۔

دوسری قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں جو اپنی صوفیت میں مخلص تو ہوتے ہیں مگر یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ اصل دین باطنی اعمال، چلے اور مراقبے ہیں جن سے "سیر فی اللہ" میں مدد ملتی ہے اور شرعی احکام محض عام لوگوں کے لیے ہیں۔ یہ حضرات شریعت کے احکام کو "ظاہر" کا نام دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ظاہری احکام عام لوگوں کے لیے ہیں اور جو شخص تصوف کی منازل طے کرلے، اسے ان کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے اس نقطہ نظر کے حق میں یہ اکابر صوفیاء کی کچھ عبارتوں کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں جن میں سے بعض عبارات صراحتاً قرآن و سنت کے خلاف ہوتی ہیں۔

چونکہ نیت کا حال اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے اور ہم کسی کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے، اس وجہ سے اس تحریر میں ہم مخلص اور غیر مخلص کی بحث میں پڑے بغیر سبھی گروہوں کے نقطہ ہائے نظر اور دلائل کا مطالعہ و موازنہ کریں گے۔

پابند شریعت صوفی

یہ وہ صوفیاء ہوتے ہیں جو شریعت کی پابندی کرتے ہیں۔ ان میں بھی مخلص اور غیر مخلص دونوں قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ غیر مخلص لوگوں کا مقصد تو محض دنیا کمانا ہوتا ہے۔ جہاں وہ اس کے لیے اور طرح کے ڈھونگ رچاتے ہیں، وہاں کچھ ظاہری شرعی احکام کی پیروی بھی کرلیتے ہیں۔ مخلص افراد شریعت کی نہ صرف پیروی کرتے ہیں بلکہ اسی کو مدار تصوف قرار دیتے ہیں۔ یہ حضرات مخالف شریعت صوفیاء پر کڑی تنقید کرتے ہیں اور انہیں گمراہ قرار دیتے ہیں۔ ایک جانب یہ قرآن و سنت اور اکابر صوفیاء کی کتب کی بنیاد پر مخالف شریعت صوفیوں پر تنقید کرتے ہیں اور دوسری جانب یہ قرآن و سنت کی بنیاد پر ناقدین تصوف کے دلائل کا جواب دیتے ہیں۔

امت کی تاریخ کے بہت سے دینی علماء کا شمار اسی گروہ میں ہوتا ہے۔ مشہور صوفی علماء میں امام غزالی (450-505/1058-1111)، شیخ احمد سرہندی (971-1034/1564-1624) اور شاہ ولی اللہ (1703-1762) کا شمار ہوتا ہے۔ برصغیر جنوبی ایشیا میں دیوبندی اور بریلوی مکاتب فکر دونوں اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ دیوبندی حضرات، بریلویوں سے کچھ امور پر اختلاف رائے رکھتے ہیں اور ان کے بعض معمولات کو بدعت قرار دے کر ان سے اجتناب کرتے ہیں۔ بریلوی حضرات ان امور کو بدعت حسنہ قرار دیتے ہیں۔ اس کی تفصیل کا مطالعہ آپ ماڈیول CS02 میں کرچکے ہیں۔

بریلوی حضرات کے ہاں تصوف کے حوالے سے دو بڑے گروہ پائے جاتے ہیں۔ مولانا احمد رضا خان بریلوی (1856-1921) کے سلسلہ بیعت سے تعلق رکھنے والے حضرات خود کو "رضوی" کہلاتے ہیں اور دوسرے مکاتب فکر سے متعلق معاملات میں بہت کٹڑ ہوتے ہیں۔ یہ حضرات سماع اور قوالی کو حرام سمجھتے ہیں اور اس کی شدید مخالفت کرتے ہیں۔ دوسرا گروہ چشتی سلسلہ سے تعلق رکھنے والے ان صوفی خانوادوں سے وابستہ ہے جن کا مرکز شمالی پنجاب کا علاقہ ہے۔ ان میں گولڑہ، سیال اور بھیرہ کے آستانوں سے وابستہ حضرات پائے جاتے ہیں۔ ان کی مشہور علمی شخصیات میں پیر مہر علی شاہ صاحب (1859-1937)، خواجہ قمر الدین سیالوی (1906-1981) اور پیر محمد

کرم شاہ الازہری (1917-1998) شامل ہیں۔ اس دوسرے گروہ کی بعض شخصیات نے دوسرے مکاتب فکر کے ساتھ نرم رویہ اختیار کیے رکھا ہے۔ سماع اور قوالی کو بھی یہ جائز سمجھتے ہیں تاہم شریعت کی پابندی کے معاملے میں ان کا موقف بھی دوٹوک ہے۔

دوسری جانب دیوبندی مکتب فکر کی اکثریت بھی برصغیر کی صوفی روایت سے وابستہ ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی (1832-1880) صوفی بزرگ تھے اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (1817-1899) کے صوفی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ حاجی صاحب کا احترام بریلوی اور دیوبندی دونوں حلقوں میں کیا جاتا ہے۔ موجودہ دور کے دیوبندی صوفیوں کی بہت بڑی تعداد مولانا اشرف علی تھانوی (1863-1943) کے حلقہ ارادت سے وابستہ ہے۔ ان کے صوفی علماء میں مولانا احمد علی لاہوری (1887-1961)، مفتی محمد حسن (d. 1961) اور مولانا محمد تقی عثمانی (b. 1943) مشہور شخصیات ہیں۔ دیوبندی حلقوں کے ہاں مولانا تھانوی کو تصوف کا مجدد کہا جاتا ہے۔

ناقدین تصوف

جو لوگ تصوف پر تنقید کرتے ہیں، ان میں بھی مخلص اور غیر مخلص دونوں طرز کے افراد پائے جاتے ہیں۔ غیر مخلص افراد کا مقصد وہی دنیا کمانا ہوتا ہے تاکہ اپنی علمیت کا رعب جھاڑ کر اور کچھ کتابیں لکھ کر کمائی کی جا سکے۔ اس کے برعکس ان میں مخلص افراد وہ ہوتے ہیں جو پورے خلوص نیت سے یہ سمجھتے ہیں کہ تصوف کے کچھ اصول، نظریات اور اعمال، دین اور شریعت سے متصادم ہیں۔ یہ حضرات ان امور پر کڑی تنقید کرتے ہیں۔ بعض اوقات ان کی تنقید صرف مخالف شریعت صوفیاء کے اقوال و افعال تک ہی محدود رہتی ہے اور بعض اوقات اس کی زد میں پابند شریعت صوفیاء کے تصورات بھی آ جاتے ہیں۔

ناقدین تصوف زیادہ تر اہل حدیث مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ماورائے مسلک حضرات کی اکثریت بھی تصوف کی ناقد ہے۔ جن حضرات نے خاص طور پر تصوف کو موضوع بنا کر ان پر تنقید کی ہے، ان میں مولانا عبدالرحمن کیلانی (d. 1995)، احسان الٰہی ظہیر (1945-1987)، پیر محمد بدیع الدین راشدی، مولانا ابو الکلام آزاد (1888-1958)، سید ابو الاعلیٰ مودودی (1903-1979) اور مولانا امین احسن اصلاحی (1904-1997) شامل ہیں۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ خود صوفی حلقوں میں بعض ناقدین تصوف پیدا ہوئے ہیں۔ ان میں مولانا ابو الکلام آزاد اور پیر بدیع الدین راشدی صاحبان کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے جو کہ صوفی خانوادوں کے چشم و چراغ تھے۔

امور تصوف

تصوف چونکہ ایک عملی نوعیت کی چیز ہے، اس وجہ سے اس پر کتابیں کم لکھی گئی ہیں اور زیادہ تر امور کو عملی صورت میں صوفی حلقوں اور خانقاہوں میں جاری کیا گیا ہے۔ اگلے ابواب میں ہم ان امور کا ذکر کریں گے جو کہ اہل تصوف کے علم اور عمل کا موضوع ہیں۔ یہ امور بنیادی طور پر متعدد انواع پر مشتمل ہیں جو کہ یہ ہیں:

- تصوف کا مقصد
- ذرائع: مقصد کے حصول کے لیے جو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں، وہ ذرائع کہلاتے ہیں۔
- توابع: اس سے مراد وہ عارضی یا مستقل کیفیات ہیں جو غیر اختیاری طور پر ایک سالک کو لاحق ہو جاتی ہیں۔
- موانع: یہ وہ امور ہیں، جو مقصد کے حصول میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔

تصوف کے مقصد پر ہم اوپر بحث کر چکے ہیں۔ بقیہ معاملات کو ہم علیحدہ علیحدہ کر کے ان کی تفصیل بیان کریں گے۔ اس معاملے میں ہماری بنیادی معلومات کا ماخذ سید شبیر احمد کاکاخیل کی کتاب "فہم التصوف" اور امام قشیری کی "الرسالۃ القشیریہ" ہے۔

اسائن منٹس

- تصوف کیا ہے؟ ایسی پانچ خصوصیات بیان کیجیے جو اہل تصوف میں پائی جاتی ہیں۔
- تصوف کی امہات کتب کو انٹرنیٹ پر تلاش کیجیے۔
- مخالف شریعت اور پابند شریعت صوفیاء میں کیا فرق ہے؟ ناقدین تصوف کا ان دونوں کے بارے میں کیا موقف ہے؟
- اس باب میں بیان کردہ صوفی سلسلوں سے متعلق معلومات انٹرنیٹ پر تلاش کیجیے۔

تعمیر شخصیت بدگمانی سے بچیے۔ یہی تمام خاندانی اور قومی جھگڑوں کی بنیاد ہے۔

---

[1] سید شبیر احمد کاکاخیل۔ فہم التصوف۔ ص6-5۔ راولپنڈی: خانقاہ امدادیہ۔(www.tazkia.org (ac. 24 Apr 2011

[2] حوالہ بالا۔ ص23۔

باب 2: تصوف کے ذرائع

جیسا کہ ہم پچھلے باب میں بیان کر چکے ہیں کہ تصوف کا مقصد "وصول الی اللہ" یعنی اللہ تعالیٰ تک پہنچنا ہے۔ ذرائع سے مراد وہ عملی اقدامات اور تدابیر ہیں جنہیں اس مقصد کے حصول کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ اہل تصوف کا کہنا یہ ہے کہ وصول الی اللہ کے راستے تین قسم کے ہیں:

- طویل ترین: نماز روزے کی کثرت، تلاوت قرآن مجید، حج، جہاد یعنی شریعت کے احکام کے نتیجے میں انسان اللہ تعالیٰ تک پہنچ جاتا ہے مگر یہ راستہ طویل ترین ہے۔ یہ راستہ اخیار (اچھے لوگوں) کا ہے۔
- اوسط: اس راستے میں سفر جلدی طے ہو جاتا ہے مگر شرعی احکام کے علاوہ کچھ اور مجاہدات کرنا پڑتے ہیں۔ یہ راستہ ابرار (نیک لوگوں) کا ہے۔
- اقل و اقرب: یہ طریق عشق ہے جس میں سالک دنیا کو چھوڑ کر خلق سے دور چلا جائے اور اپنی زندگی ذکر، فکر، درد، شوق اور محبت الٰہی میں گزار دے۔ اس راستے سے سالک بہت جلد اللہ تعالیٰ تک پہنچ جاتا ہے۔ [1]

اس تصور کو سمجھانے کے لیے اہل تصوف ٹرین کی مثال دیتے ہیں۔ بعض ٹرینیں تیز رفتار ہوتی ہیں اور بعض نارمل رفتار سے چلتی ہیں۔ سالک اگر تیز رفتار ٹرین پر سوار ہو جائے تو اس کا سفر جلدی طے ہو جاتا ہے مگر اس کا ٹکٹ زیادہ مہنگا ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح اگر سالک اوسط یا مختصر راستے پر سفر کرتا ہے تو اسے اس کی اضافی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔

وصول الی اللہ کے لیے جو ذرائع اختیار کیے جاتے ہیں، وہ بنیادی طور پر دو قسم کے ہیں: مجاہدہ اور فاعلہ۔ مجاہدے سے مراد نفس کو کنٹرول کرنے کے لیے اسے اذیت دینا ہے اور فاعلہ سے مراد کچھ اضافی تراکیب ہیں جو روحانی قوتوں میں اضافہ کے لیے صوفیاء سرانجام دیتے ہیں۔ ان میں ذکر، شغل اور مراقبہ سرفہرست ہیں۔ اس کے علاوہ سماع، تصور شیخ اور عشق مجازی بھی انہی میں شامل ہیں۔[2] ان سب کی تفصیل یہ ہے:

مجاہدہ

مجاہدہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اپنے جسم کو اذیت دی جائے تاکہ نفس قابو میں آ جائے۔ تمام برائیوں کا منبع چونکہ انسانی نفس اور شیطان ہیں اور یہی دونوں انسان کو برائیوں پر اکساتے ہیں، اس وجہ سے ضروری ہے کہ انہیں کنٹرول کیا جائے۔ انسانی نفس کی خواہشات اندھی ہوتی ہیں، اس وجہ سے یہ آسانی سے شیطان کی آماجگاہ بن جاتی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ انسانی نفس کی تہذیب کر

کے اس پر مکمل کنٹرول حاصل کر لیا جائے تا کہ شیطان اس نفس کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال نہ کر سکے۔

نفس کو کنٹرول کرنے سے متعلق اہل تصوف گھوڑے کو سدھانے کی مثال پیش کرتے ہیں۔ جیسے گھوڑا اگر اڑیل ہو اور انسان کے قابو میں نہ آ رہا ہو تو اس کی تربیت کی جاتی ہے۔ کبھی اسے پیار کیا جاتا ہے تو کبھی مارا جاتا ہے، کبھی دانہ دیا جاتا ہے اور کبھی بھوکا رکھا جاتا ہے، کبھی اسے کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے اور کبھی اس پر بوجھ لادا جاتا ہے تا کہ یہ مالک کے اشاروں پر چلنے لگے۔ بالکل اسی طرح جب نفس قابو میں نہ آئے تو اسے قابو میں لانے کے لیے اسے اذیتیں بھی دی جاتی ہیں اور کبھی اس کی بات مان بھی لی جاتی ہے۔ اسے صوفیاء کی اصطلاح میں "مجاہدہ" کہا جاتا ہے۔

مختلف صوفی سلسلوں میں مجاہدے کی متعدد شکلیں ہوتی ہیں: کبھی نفس کا پسندیدہ کھانا بند کر دیا جاتا ہے، کبھی طویل عرصے تک روزے رکھے جاتے ہیں، کبھی چپ کا روزہ رکھ لیا جاتا ہے، کبھی نیند کم کر دی جاتی ہے، کبھی جنسی تعلق کو منقطع کر دیا جاتا ہے، کبھی ساری ساری رات عبادت کی جاتی ہے، کبھی لاکھوں کی تعداد میں ذکر و درود کا ورد کیا جاتا ہے، کبھی جوتا پہننا چھوڑ دیا جاتا ہے، تو کبھی گرمیوں میں گرم اور سردیوں میں ٹھنڈے علاقے میں بے سرو سامانی میں وقت گزارا جاتا ہے۔ بعض صوفی بزرگ مجاہدے کے تین اصول بیان کرتے ہیں: تقلیل طعام، تقلیل منام (سونا) اور تقلیل کلام۔ ان کا موقف یہ ہے کہ ان چیزوں سے نفس نرم پڑ کر قابو میں آ جاتا ہے۔

صوفیاء کی کتب میں ان کے واقعات پڑھے جائیں تو ان کے ہاں بڑے غیر معمولی مجاہدوں کا ذکر ملتا ہے۔ امام غزالی کی تصانیف ایسے مجاہدوں کے ذکر سے بھری ہوئی ہیں۔ بعض صوفی کئی کئی سال تک سوئے نہیں تو کئی ایسے گزرے ہیں جنہوں نے ایک عرصے تک کبھی بات نہیں کی۔ ایک صوفی ساری عمر ننگے پاؤں رہے۔ ایک اور صوفی کا واقعہ ملتا ہے کہ انہوں نے اپنا پسندیدہ کھانا ترک کر دیا اور ساتھ ہی اپنے نفس سے وعدہ کر لیا کہ اگر وہ انہیں تنگ نہ کرے تو وہ دس سال بعد اسے کھانے کو وہی پسندیدہ کھانا دیں گے۔ دس سال بعد جب وہ اپنا وعدہ پورا کرنے لگے تو نفس نے کہا کہ میں آخر دس سال بعد جیت ہی گیا۔ انہوں نے وہیں اس کھانے کو پھینک دیا اور نفس کی خواہش پوری نہ کی۔

مجاہدات کے ضمن میں صوفیاء کا کہنا یہ ہے کہ سالک کو مجاہدہ خود نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کے لیے اپنے مرشد سے راہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔ مرشد کو بھی چاہیے کہ وہ سالک کی جسمانی صحت، نفسیاتی حالت اور سماجی و معاشی حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے اسے مناسب مجاہدہ تجویز کرے۔

مجاہدے کا یہ تصور دیگر مذاہب کے تصوف میں بھی ہے بلکہ عیسائی، بدھ اور ہندو راہبوں کے حالات زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو ان کے ہاں اس معاملے میں غیر معمولی شدت پائی جاتی ہے۔ کئی کئی سال نہ سونا، خارش کر دینے والا لباس پہنے رکھنا، ہمہ وقت زنجیروں اور بیڑیوں میں جکڑے رہنا، چالیس چالیس دن تک بغیر افطار کیے روزہ رکھنا، سالوں کسی دوسرے شخص کا منہ نہ دیکھنا اور اس قسم کے بے شمار مجاہدات ان کے ہاں ملتے ہیں۔ مسلم صوفیاء کے حالات زندگی کا اگر مطالعہ کیا جائے تو بعض حضرات کے ہاں اسی درجے کے

مجاہدات کا ذکر ملتا ہے مگر کئی صوفیاء کے ہاں اس معاملے میں اعتدال پایا جاتا ہے۔

فاعلہ

فاعلہ سے مراد وہ تراکیب ہیں جن میں اہل تصوف روحانی قوت میں اضافہ کے لیے مشغول رہتے ہیں۔ ان میں ذکر، شغل اور مراقبہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بعض طریقے اور بھی ایسے ہوتے ہیں جن کا شمار فاعلہ میں کیا جاتا ہے مگر ان کے بارے میں پابند شریعت صوفیاء کا کہنا یہ ہے کہ ان سے نقصان بھی ہو جاتا ہے، اس وجہ سے ان کا استعمال مرشد کے حکم سے ہی کرنا چاہیے۔ ان میں سماع، عشق مجازی اور تصور شیخ شامل ہیں۔ مناسب ہو گا کہ انہیں تفصیل سے بیان کیا جائے۔

ذکر

عام علماء کے نزدیک نماز، تلاوت قرآن مجید اور وہ اذکار جن کا ذکر قرآن و حدیث میں آیا ہے، ذکر میں داخل ہیں۔ ناقدین تصوف کے نزدیک یہی اذکار کافی ہیں۔ صوفیاء بھی انہیں "ذکر مسنون" کہتے ہیں مگر ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ تمام اذکار انسان کے لیے غذا کی حیثیت رکھتے ہیں تاہم جو شخص اپنا تزکیہ نفس کرنا چاہے، اسے اضافی اذکار کرنے چاہییں۔ یہ اذکار اس کے لیے دوا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان اذکار میں ذکر کے ساتھ ساتھ کچھ خاص روحانی نوعیت کی مشقیں کی جاتی ہیں۔ یہاں ہم سید شبیر احمد صاحب کی کتاب فہم تصوف میں سے کچھ اذکار کا طریقہ درج کر رہے ہیں:

> ذکر کا مقصد چونکہ بندے کا نفس کی غلامی سے نکل کر نفس کے مالک کا بندہ بننا ہے اس لئے اس میں ترتیب کے ساتھ بندے کو نفس سے نکالنے اور اس کو حق کے پاس لے جانے کا خیال رکھا جاتا ہے جس کے چار مرحلے ہیں۔ بعض حضرات کے نزدیک اول مرحلہ نفی و اثبات لاَ اِلٰہَ اِلاَّ اللہ، دوسرا اثبات اِلاَّ اللہ، تیسرا اللہ، اور چوتھا ھو ہے۔ پہلے کو ناسوتی، دوسرے کو ملکوتی تیسرے کو جبروتی اور چوتھے کو لاہوتی کہتے ہیں۔ جیسا کہ عالم بھی چار ہیں۔ (1) ناسوت (2) ملکوت (3) جبروت (4) لاہوت
>
> بعض مشائخ کے نزدیک پہلے دو ذکر تو اسی طرح ہیں لیکن تیسرا ذکر اللہُ اللہ (پہلے لفظ ذکر کے آخر میں پیش ہے اور دوسرے کے آخر میں جزم) اور چوتھا صرف اسم ذات بسیط بلا تکرار اللہ (جزم کے ساتھ) ہے۔ بعض نے ذکر لسانی کو ناسوتی، ذکر قلبی کو ملکوتی، ذکر روح کو جبروتی اور ذکر سر کو لاہوتی کہا ہے۔ بعض نے ذکر لسانی کو جسمی، فکر کے ذکر کو نفسی، مراقبہ کو ذکر قلبی، مشاہدہ کو ذکر روحی اور معائنہ کو ذکر سرّی کہا ہے۔
>
> ذکر ناسوتی لآ اِلٰہَ اِلاَّ اللہُ ہے کہ اس میں ناسوتی اُمور، شہوات و لذات و خواہشات یعنی جو جو عالم دنیا سے متعلق ہیں اور نفس کو خود میں مشغول رکھتے ہیں، سے نفی ہے۔ اس سے نکل جانا اور اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہونا ہے یعنی لا الہ کی تلوار سے غیر اللہ کو فنا کرنا اور الا اللہ کی ضرب سے اللہ تعالیٰ کی محبت کا حاصل کرنا ہے۔ ذکر ملکوتی یعنی اِلاَّ اللہ سے اس حقیقت کا ادراک حاصل کرنا ہے کہ ہم تو صرف اللہ کے لئے ہیں جیسا کہ فرشتے صرف اللہ تعالیٰ کے امر کے مطابق سب کچھ کرتے ہیں اور ان کا کسی اور طرف دھیان ہی نہیں ہوتا تو اس طرح ہمارا بھی دھیان صرف اللہ کی طرف ہو اور غیر اللہ کی طرف التفات کا شائبہ بھی نہ ہو حتیٰ کی اس کی نفی کی طرف بھی خیال نہ ہو۔

ذکر جبروتی اللہُ اللہُ سے مراقبہ ذات مع صفات عظمت واحسان ورحمت وشفقت وغیرہ ہو یعنی حق کا ادراک دمادم ایسا ہو کہ ہر دم اس ادراک میں ترقی ہو اور قلب و ذہن اس میں مشغول ہو۔ ذکر لاہوتی اللہ کا مقصد محض اللہ کی ذات کی طرف ایسی توجہ ہے کہ اس کی صفات کی طرف بھی دھیان نہ ہو۔ بعض حضرات ذکر جبروتی "اللہ" کے ذکر کو اور ذکر لاہوتی "ہو" کے ذکر کو قرار دیتے ہیں۔ پہلا طریقہ عموماً اہل چشت کے ہاں ہوتا ہے اس کو بارہ تسبیح بھی کہتے ہیں۔ یہ حضرات پہلے دو سو بار ذکر ناسوتی، چار سو بار ذکر ملکوتی، چھ سو بار ذکر جبروتی اور سو بار لاہوتی کراتے ہیں لیکن ذکر لاہوتی میں سالک کی استعداد کے مطابق روز افزوں ترقی کراتے کراتے اس کو بعض اوقات 24 ہزار تک بھی لے جاتے ہیں۔

دوسرا طریقہ عموماً قادریہ حضرات کے نزدیک چلتا ہے۔ ذکر علاجی میں اجتہاد جاری ہے۔ ایک انتہائی ضروری امر کی تشریح یہاں پر کرنا ضروری ہے کہ یہ تمام طریقے اجتہادی ہیں۔ جیسے طب میں ہر حکیم مجتہد ہوتا ہے اس طرح طب روحانی یعنی تصوف میں ہر شیخ مجتہد ہوتا ہے یعنی وہ تصوف کے مسلمہ قواعد سے کام لے کر وقت اور سالک کی استعداد کو پیش نظر رکھ کر اس کے لئے جو مفید سمجھتا ہے تعلیم کرتا ہے اس لئے اس پر اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں البتہ یہ شیخ کے اپنے فائدے کی بات ہے کہ وہ اپنی اس ذمہ داری کو اچھی طرح پوری کرنے کے لئے اگر دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھائے تو اس سے فائدہ ممکن ہے۔ اسی مقصد کے پیش نظر کتابیں لکھی جاتی ہیں جس میں یہ کتاب بھی ہے۔

ذکر نفی واثبات یعنی لا الہ الا اللہ کا طریقہ: کتابوں میں جو طریقہ لکھا ہے وہ یہ ہے کہ لآ اِلٰہَ کے لآ کو ناف سے ذرا طاقت سے کھینچ کر لفظ اِلٰہَ کو داہنے بازو تک لے جاکر سر کو پیٹھ کی طرف تھوڑا سا جھکا کر یہ خیال کرے کہ میں نے غیر سے اپنے دل کو پاک کر کے تمام اغیار کو پس پشت ڈال دیا پھر اِلاَّ اللہُ کی ضرب ذرا زور سے دل پر لگائے یہ دو سو بار کہے اس طرح کہ ہر دس بار یا سانس ٹوٹنے پر محمد الرّسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہے۔ آج کل کے حالات کے پیش نظر ہمارے شیخ مولانا محمد اشرف صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس میں یہ ترمیم فرماتے تھے کہ لا کو ناف سے طاقت کے ساتھ کھینچ کر الا اللہ سے دل کو دائیں بائیں یوں ہلائے کہ جس سے نفی کی قلبی کیفیت پیدا ہو جائے یعنی اس کے ساتھ ہی یہ سوچے کہ میرے دل سے غیر اللہ کی محبت نکل گئی اور الا اللہ سے دل پر سینے کی اندرون سے ایسی ضرب لگائی جائے کہ اس سے یہ کیفیت پیدا ہو جائے کہ میرے دل میں اللہ تعالٰی کی محبت پیدا ہو گئی۔ حضرت فرماتے تھے کہ آج کل لوگ خارجی ضرب کے متحمل نہیں۔

وضاحت

لآ اِلٰہَ کہتے وقت مبتدی [آغاز کرنے والا] لا معبود سوچے، متوسط [درمیانے درجے کا سالک] لا مقصود یا لا مطلوب سوچے اور منتہی کامل [جو اپنے روحانی سفر کی آخری اسٹیج پر ہو] لا موجود کا تصور کرے اور تھوڑی دیر مراقب ہو کر خیال کرے کہ فیوضات الٰہیہ قلب میں مسلسل حاصل ہو رہے ہیں اور تصور کرے کہ فیضان الٰہی عرش سے میرے سینہ میں آ رہا ہے خواہ چوکڑی بھر کر بیٹھے یا دو زانو جس میں سہولت ہو، ذوق کے مطابق کرے۔

ذکر الاّ اللہ کا طریقہ: کتابوں میں اِلاّ اللہ کے ذکر کا طریقہ یہ ہے کہ پہلی بار لآ اَلٰہَ کہتے وقت ناف سے کھینچ کر سر کو دائیں شانہ کی طرف لے جا کر اِلاَّ اللہ کی ضرب دل پر لگائے۔ اور پھر دل پر ہی بائیں جانب ضرب لگاتا رہے۔ یہ ذکر چار سو بار کرے پھر نفی واثبات کی طرح مراقبہ کرے۔ آج کل کے حالات کے پیش نظر یہ مناسب ہے کہ الا اللہ کہتے ہوئے ضرب دائیں شانے کی جانب سے لیکن سینے میں دل کے قریب سے دل پر ضرب لگائی جائے۔ اس میں مراقبہ ملکوتی ہی مناسب ہے کہ ہم تو اللہ ہی کے بندے ہیں۔ اس طریقے سے نہایت آسانی کے ساتھ مطلوبہ کیفیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس لئے بہت زور دار ضرب لگانے کی آج کل ضرورت نہیں بلکہ اس میں نقصان کا اندیشہ ہے۔

ذکر اسم ذات دوضربی

اللہُ اللہُ اول "ہ" پیش کے ساتھ اور دوسری "ہ" جزم کے ساتھ۔ اس کا کتابوں میں لکھا ہوا طریقہ یہ ہے کہ دونوں آنکھیں بند کر کے سر داہنے کندھے کی طرف لے جا کر اللہُ پیش کے ساتھ دل پر ضرب لگایا جائے اور دوسرے لفظ اللہْ (جزم کے ساتھ) سے بھی دل پر ضرب لگایا جائے۔ یہ چھ سو بار ہے۔ پھر اس طرح مراقبہ کرے کہ ہر دس یا زائد کے بعد اللّٰهُ نَاظِرِي اَللّٰهُ حَاضِرِي اَللّٰهُ مَعِي کہتا رہے تاکہ کیفیت و لذت اس کی حاصل ہو۔ اس میں بھی آج کل بہتر یہی ہے سر کو ہلائے بغیر جہاں سے الا اللہ کے ضرب کا بتایا گیا وہیں سے یعنی سینے میں دائیں شانے کی جانب سے مگر قریب سے دل پر ضرب لگائی جائے۔

ذکر اسم ذات یک ضربی

اس کا طریقہ کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ لفظ اللہْ جزم کے ساتھ سر کو بائیں جانب لے کر دل پر ضرب کرے۔ یہ سو بار ہے۔ پھر مراقب ہو کر اس طرح کہے، اللّٰهُ نَاظِرِي [اللہ مجھ کو دیکھ رہا ہے]، اَللّٰهُ حَاضِرِي [اللہ میرے پاس ہے]، اَللّٰهُ مَعِي [اللہ میرے ساتھ ہے]۔ اور معنی کا خیال کرے۔ آج کل اس کے لئے بھی مناسب یہ ہے کہ یہ مراقبہ کرے میرا اللہ میرے دل کو محبت کے ساتھ دیکھ رہا ہے اور میرا دل بھی اس کی طرف متوجہ ہے اور میری زبان کے ساتھ مل کر اللہ اللہ شوق میں کر رہا ہے۔ اس میں اوپر کے مراقبے بھی آ گئے اور اللہ تعالی کی ذات کی طرف توجہ قلبی بھی حاصل ہو گئی۔ جو تصور ذات بحت کا پیش خیمہ بنے گا انشاء اللہ۔

ایک اور تشریح

بعض مشائخ نے اس کی تشریح یوں بھی کی ہے کہ سالک ذکر نفی و اثبات لآ اِلٰہَ اِلاّ اللہُ میں اس قدر مشغول ہو کہ سوائے ذکر کے کچھ نہ رہے۔ کوئی سانس بغیر ذکر نہ نکلے۔ جب اس حالت کو سالک پہنچ گیا تو عالم مادیت، عالم اجسام سے تجاوز کر کے مرتبہ لطیفہ پر پہنچ جائے اور اب بجز اِلاّ اللہ کے اثبات کے تمام کی نفی ہو جاتی ہے۔ اب یہ مرتبہ نفس سے نکل کر لطیفہ قلب کے مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے۔ چونکہ یہ ذکر اِلاّ اللہ دل کا ذکر ہے اس لئے اب اِلاّ اللہ کا تصور بحضور قلب چاہئے کہ اپنی ذات و صفات کو اللہ کی ذات و صفات کے ساتھ ربط ہو جاوے۔ جب سالک اس مرتبہ کو پہنچ جاتا ہے تو مرتبہ دل سے گذر کر مرتبہ روح پر پہنچ جاتا ہے۔ اور روح کا ذکر اسم ذات اللہ کا ذکر ہے اس واسطے اس ذکر اسم ذات میں اس طرح انہماک ہو کہ الف لام جو اللہ پر داخل ہے باقی نہ رہے صرف ھو رہ جائے۔ اس مرتبہ پر پہنچنے سے سالک سراپا ذکر ہو جائے گا اور روح سے ترقی کر کے مرتبہ سر پر پہنچ جائے گا اور مقام فناء الفناء پر فائز ہو جائے گا۔

اب سالک کو اللہ تعالی کے ساتھ ایسا تعلق ہو جاتا ہے کہ اب وہ مصداق حدیث شریف "بِيْ يَسْمَعُ وَبِي يبْصر" ہو گا کہ اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ اب وہ میرے ساتھ سنتا ہے میرے ہی ساتھ دیکھتا ہے "وَبِیْ يَبْطِشُ" میرے ہی ساتھ پکڑتا ہے "وَبِيْ يَمْشِيْ" میرے ہی ساتھ چلتا ہے یعنی اس کا ہر حرکت و سکون خدا کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ [دیکھنے میں بشر ہے لیکن بے شر ہے، سراپا نور ہے] اب اس کو لا الہ الا اللہ کی خوب معرفت ہو جائے گی، عبدیت کاملہ حاصل ہو جائے گی، عبدیت میں درجہ کمال اور بصرف ہمت عبادت میں مشغول ہو گا، حفظ مراتب اور احکام شریعت کا امراً و نہیاً اُمتثال کرے گا۔[3]

صوفیاء عام طور پر ان اذکار کی انفرادی یا اجتماعی طور پر مشقیں کرتے ہیں۔ ذکر کرتے ہوئے عام طور پر ذہن کو ایک خاص نکتے پر مرکوز کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی سر کو گھما کر اس کی ضرب دل پر لگانے سے اس نکتے میں غیر معمولی زور پیدا ہو جاتا ہے۔

مثال کے طور پر جیسے فاضل مصنف نے بیان کیا کہ ابتدائی درجے کا سالک "لا الہ" کہتے وقت، "لا معبود" سوچے۔ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ اپنے ذہن میں پوری توجہ سے "کوئی معبود نہیں، کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے" کی تکرار کر رہا ہو گا۔ اس تکرار کے ساتھ ساتھ دل پر ضرب لگانے سے اس نکتے کی پروگرامنگ اس کے ذہن میں ہوتی چلی جائے گی۔ جب وہ طریقت کے سفر میں کچھ آگے بڑھے گا تو "کوئی مطلوب نہیں سوائے اللہ کے" کی تکرار کرنے لگے گا۔ اعلی لیول پر پہنچ کر وہ "کوئی موجود نہیں سوائے اللہ کے" کی تکرار کرے گا۔ یہ ایک قسم کا ذہن کی پروگرامنگ کا ایک طریقہ ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اعلی سطح پر پہنچ کر سالک کا ذہن اللہ کے سوا ہر چیز سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اسی کیفیت کو "وحدت الوجود" یا "وحدت الشہود" کا نام دیا جاتا ہے۔

ذکر دو قسم کا ہوتا ہے، ایک کو ذکر خفی کہا جاتا ہے اور دوسرے کو ذکر جلی یا ذکر بالجہر۔ ذکر جلی بلند آواز میں ہوتا ہے۔ لا الہ کہتے ہوئے سر کو دائیں جانب سے گھما کر بائیں جانب لایا جاتا ہے اور الا اللہ کی ضرب دل پر لگائی جاتی ہے۔ ذکر خفی میں ذہن کو لا الہ الا اللہ پر مرکوز کرتے ہوئے زبان نہیں ہلائی جاتی بلکہ سانس کی آمد و رفت سے وہی کام لیا جاتا ہے اور سانس باہر نکالتے ہوئے دل پر ضرب لگائی جاتی ہے۔ قادری اور چشتی سلسلوں میں بالعموم ذکر بالجہر رائج ہے اور نقشبندی سلسلے میں ذکر خفی۔

شغل

شغل سے مراد کچھ روحانی نوعیت کی مشقیں ہیں جن کی مدد سے ذہن کو ایک نکتے پر مرکوز کرنے کی مشقیں کی جاتی ہیں تاکہ انسان کو اپنے ذہن پر کنٹرول حاصل ہو اور اس کی توجہ ادھر ادھر نہ بھٹکے۔ یہ مشقیں بڑی حد تک یوگا سے مشابہت رکھتی ہیں۔ اس کی بعض مثالیں بیان کرتے ہوئے سید شبیر احمد لکھتے ہیں:

> شغل کی حقیقت اتنی ہے کہ اگر ذکر میں وساوس تنگ کریں اور کسی طرح دور نہ ہوں تو دل کو کسی تدبیر سے جب کسی ایسی چیز کی طرف مائل کیا جائے کہ اس سے یکسوئی حاصل ہو اور وساوس دور ہوں شغل کہلاتا ہے۔ یاد رکھیئے کہ یہ مقصود نہیں لیکن معاون فی المقصود ہو سکتا ہے۔ اس کی اصل نماز میں نظر کا محبوس کرنا۔ بکاء کی کیفیت کو ضبط کرنا اور سترہ وغیرہ ہے۔ حبس دم بھی اس کی ایک قسم ہے۔ یہ گو کہ جوگیوں سے لیا گیا ہے لیکن یہ ان کا کوئی مذہبی شعار نہیں تھا اس لئے ایک تدبیر کے طور پر اس کا لینا جائز تھا جیسا کہ جنگ خندق میں خندق کا کھودنا۔
>
> شغل اسم ذات
>
> کاغذ کے ایک ٹکڑے پر دل کی تصویر بنا کر اس پر لفظ "اللہ" خوبصورت لکھا جائے اور پھر اس کو بغور مسلسل دیکھا جائے حتی کہ اس کا نقش دل پر جم جائے۔ یا دل پر ایک خیالی قلم سے لفظ اللہ لکھنے کی کوشش کی جائے۔ عموماً اس میں پہلا طریقہ آسان اور دوسرا مشکل ہوتا ہے۔
>
> سلطان الاذکار
>
> اس کے کئی طریقے ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ چھوٹے سے حجرہ میں جہاں شور و غل نہ ہو داخل ہو کر درود شریف اور استغفار اور اعوذ باللہ پڑھ کر "اللھم اَعْطِنْ نُوْراً وَّ اجْعَل لِّي نُوْراً وَّ اَعْظِمْ لِي نُوْراً وَّ اجْعَلْنِي نُوْراً" تین بار حضور قلب وتصور کے ساتھ کہے پھر خواہ لیٹ کر یا بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر بدن کو ہلکا کرے اور مردہ تصور کرے اور پورا متوجہ اور باہمت ہو جاوے اس کے بعد سانس لیتے وقت اللہ کا اور سانس باہر

نکالتے وقت ہو کا تصور کرے اور خیال کرے کہ سانس لیتے وقت اور باہر نکالتے وقت ہر بال بال سے ہو نکل رہا ہے۔ یہاں تک مشغول ہو کے کہ اپنا خیال تک بھی جاتا رہے اور "هو الْحَي الْقَيّومْ" کا ہر وقت تصور قائم ہو جاوے انشاء اللہ تعالیٰ اس طرح سے کچھ عرصہ بعد جسم کا ہر رواں رواں ہر ہر بال ذاکر ہو جائے گا۔ اور انوار تجلی سے منور ہو جائے گا۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ حواس خمسہ کو روئی سے یا انگلیوں سے اس طرح بند کرے کہ دونوں انگوٹھے دونوں کانوں کے سوراخوں میں دے اور دونوں انگلیاں شہادتین کی دونوں آنکھوں کے پپوٹے پر رکھے اور دونوں انگلیاں بیچ کی دونوں نتھنوں پر رکھے اور دونوں انگلی چھنگلی کے پاس کی اوپر کے ہونٹ پر اور چھنگلی نیچے کے ہونٹ پر رکھے اور اکڑوں بیٹھ کر یا جس طرح بیٹھنے کی سہولت ہے بیٹھ کر زبان کو تالوے سے لگائے اور آہستہ آہستہ سانس لے کر حبسِ دم کرے یعنی سانس کو روکے اور لفظ اللہ خیال سے بلا حرکت لسان ناف سے کھینچ کر ام الدماغ یعنی بیچ سر میں روکے ۔جب تک بلا تکلف رک سکے اور وہاں سے دل مُدَوّر میں لے جا کر اسم ذات "اللہ" خیال سے کہتا رہے۔ جب سانس لینے کا تقاضا ہو تو صرف نتھنوں سے انگلیاں ہٹا کر ناک سے آہستہ سانس چھوڑے تین سانس لے کر پھر حبس دم کرے اور پھر ایک ایک سانس بڑھا کر تحمل کی مقدار کو پہنچا دے ۔

شغل سلطاناً نصیراً

اس کا طریقہ یہ ہے کہ صبح شام روبقبلہ دونوں زانوں بیٹھے اور اطمینان خاطر سے دونوں آنکھیں یا ایک آنکھ بند کر کے دوسری آنکھ سے ناک کے نتھنے پر نظر ڈالے اور بغیر پلک جھپکائے جس طرح چراغ یا ستارہ کی روشنی کو دیکھتا ہے غیر معین نور کا تصور کرے اور استغراق ایسا ہو کہ وہ محو ہو جائے۔ ابتداء میں تو آنکھوں میں ضرور تکلیف ہو گی اور پانی بہے گا لیکن چند دن کے بعد جب عادت ہو جائے گی تو یہ تکلیف جاتی رہے گی اور اس کو اپنی صورت جس طرح آئینہ میں نظر آتی ہے نظر آنے لگے گی اور نور الٰہی سے منور ہو جائے گا۔ خواجہ معین الدین چشتی نے فرمایا ہے کہ اس شغل کے فوائد بہت ہیں خصوصاً خطرات کے انسداد میں عجیب و غریب تاثیر رکھتا ہے۔

شغل سلاطاناً محموداً

اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس طرح سلطاناً نصیراً کے ذکر میں نتھنوں پر نظر رکھتے ہیں اسی طرح اس شغل میں دونوں بھنوؤں کے بیچ نظر رکھتے ہیں۔ اس شغل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذاکر کو اپنا سر نظر آنے لگتا ہے اور جب سر نظر آنے لگتا ہے تو عالم بالا کے حالات سے مطلع ہو جاتا ہے۔

شغل سہ پایہ

شغل سہ پایہ "اللّٰہُ سَمِیْعٌ" "اللّٰہُ بَصِیْرٌ" "اللّٰہُ عَلِیْمٌ" کا ذکر ہے۔ طریقہ اس کا یہ ہے کہ چار زانو بیٹھ جائے اور سلطاناً نصیراً کا تصور کرے اور سانس روک کر ناف سے لے کر ام الدماغ تک پہنچائے جب سانس ام الدماغ میں پہنچے تو "اللّٰہُ سَمِیْعٌ" کہے اور " بِیْ یَسْمَعُ " کا تصور کرے پھر "اللّٰہُ بَصِیْرٌ" کہے اور " بِیْ یَبْصُرُ " کا تصور کرے پھر ناف پر "اللّٰہُ عَلِیْمٌ" کہے اور " بِیْ یَنْطِقُ " کا تصور کرے پھر اس کے بعد اس طرح شروع کرے کہ ام الدماغ میں "اللّٰہُ عَلِیْمٌ" اور ناف پر "اللّٰہُ سَمِیْعٌ" عروج و نزول کے طریقہ پر کہے یہاں تک کہ ایک سانس میں ایک سو ایک بار شغل سہ پایہ کرنے لگے۔

تحقیق: یہ شغل لکھ دئے ہیں جس کی صحت عمدہ ہو، اعصاب میں ضعف نہ ہو اور سالک چاہے تو کرے لیکن شیخ کی تجویز ہر حالت میں ضروری اور مقدم ہے، اطلاع اور اتباع اصل ہے۔ ذکر و شغل یک ضربی، چہار ضربی، پنج ضربی شش ضربی اور ہفت ضربی بھی ہے۔ لیکن اب بس یک ضربی اور

دو ضربی پر کفایت ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ حسب بیانِ سابق کافی ووافی ہے۔ [4]

ان اشغال سے متعلق فاضل مصنف نے چھ لطائف کا ذکر بھی کیا ہے۔ لطیفہ سے مراد یہاں ہنسی مذاق والا لطیفہ نہیں بلکہ جسم انسانی کے وہ مخصوص مقامات ہیں جہاں ذکر و شغل کے دوران ضربیں لگائی جاتی ہیں۔ ان میں ناف کے نیچے، عین دل کا مقام، دماغ کا درمیانی حصہ وغیرہ شامل ہیں۔ ان مقامات پر توجہ کرنے اور ضربیں لگانے سے انسانی ذہن کی پروگرامنگ میں مدد ملتی ہے۔ زیادہ مشقوں کے نتیجے میں ان مقامات کی جلد پر کچھ رنگ بھی ظاہر ہونے لگ جاتے ہیں۔

مراقبہ

ذکر اور شغل کے علاوہ اہل تصوف مراقبہ بھی کرتے ہیں۔ یہ بھی ذہن کو کسی مخصوص نکتے پر مرکوز کرنے کی مشق ہوتی ہے۔ مراقبے کے لیے ضروری ہے کہ کسی ایسے مقام پر بیٹھا جائے جہاں سالک کو کوئی چیز ڈسٹرب نہ کر سکے۔ مراقبوں کی بعض مثالوں کو سید شبیر احمد کاکاخیل اس طرح بیان کرتے ہیں:

جب ذکر ضربی یا سری [ذکر جلی یا خفی] کی تکثیر سے سالک منور ہو جاتا ہے اور اس کی رگ رگ، رونگٹے رونگٹے میں ذکر سرایت کر جاتا ہے اور ایک محویت کی سی حالت پیدا ہو جاتی ہے تب مراقبات کی تعلیم کی نوبت آتی ہے۔ اصل یہی ہے۔ لیکن اب عوارض کے سبب ذکر کے ساتھ ساتھ ہی مراقبات بھی تعلیم کر دیئے جاتے ہیں۔ کسی ایسے مضمون کو سوچنا جو اللہ جلّ شانہٗ تک پہنچانے والی ہو اس کے خیال رکھنے کو مراقبہ کہتے ہیں۔ لہٰذا مراقبہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے مد نظر رکھنے کو کہتے ہیں۔

اور مراقبہ خاص یہ ہے کہ خدا کی ذات میں اس قدر فکر کرے کہ اپنے سے بے فکر و بے خبر ہو جاوے۔ کبھی یاد دل سے نہ اترے خواہ جمال کے لحاظ سے ہو یا جلال کے لحاظ سے ہو۔ انس کے طور پر ہو یا خشیت کے ساتھ ہو، خوف کے ساتھ ہو یا رحمت کے ساتھ، محبت کے ساتھ ہو یا اس کے ساتھ ملنے کے شوق کے ساتھ۔

طریقہ اس کا یہ ہے کہ دوزانو نمازی کی طرح سر جھکا کر بیٹھے اور دل کو غیر اللہ سے خالی کر دے اور اللہ جل شانہ کی حضوری میں حاضر کر دے اور اعوذ و بسم اللہ پڑھ کر تین بار اَللّٰہُ حَاضِرِیْ، اَللّٰہُ نَاظِرِی اور اَللّٰہُ مَعِیْ زبان سے کہہ کر ان کے معنوں کو دل میں ملاحظہ کرے، تصور کرے کہ اللہ تعالیٰ حاظر وناظر ہے اور میرے پاس ہے، اس جاننے اور تفور کرنے خیال کرنے میں اس قدرر محو ہو کہ غیر حق کا تصور نہ رہے حتیٰ کہ اپنی بھی خبر نہ رہے۔

مراقبہ کی قسمیں

مراقبہ کے متعدد طریقے ہیں جس طریقے سے جس قسم سے طالب کو نفع ہوا ہو، منزل مقصود تک پہنچائے، اس کے ساتھ کوشش کرے۔ چند اہم قسمیں یہ ہیں۔ مراقبہ رویت، مراقبہ معیت، مراقبہ اقربیت، مراقبہ وحدت، مراقبہ فناء۔

مراقبہ رویت

خدا کی رویت کا تصور کرے "اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰہَ یَرٰیٰ" [کیا نہیں جانا کہ اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے۔] اس پر غور کرے اور اس پر مواظبت [یعنی مسلسل

] کرے اور یہاں تک مشغول ہو کہ یہ مراقبہ پکا ہو جائے۔

مراقبہ معیت

"هو مَعَكُمْ أيْنَمَا كُنْتُمْ" [تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے]اس کے معنی کے ساتھ تصور اور یقین کرے کہ خلوت اور جلوت، بیماری تندرستی ہر حالت میں اللہ میرے ساتھ ہے۔اسی خیال سے مستغرق ہو جاوے۔

مراقبہ اقربیت

"نَحْنُ أَقْرَبُ اِلَيه مِنْ حَبْلِ الْوَرِيد" [ہم انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں]اس آیت پر معنی کے ساتھ غور کرے اور اس خیال میں محو ہو جاوے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے قریب ہے۔

مراقبہ وحدت

"هُوَ الْأَوَّلُ وَالْاٰخِرُ [اس کا وجود ہر جگہ جلوہ فرما ابتداء اور انتہا میں وہی ہے]اس کو زبان سے کہے اور تصور کرے کہ اس کے سوا کوئی نہیں ہے اسی خیال میں مستغرق ہو جاوے۔

مراقبہ فناء

"كُلُّ مَنْ عَلَيهَا فانٍ" [دنیا کی تمام چیزیں فانی ہیں اور اللہ بزرگ و برتر باقی رہے گا۔]اس کے معنی کا تصور کرے کہ تمام چیزیں فناء ہو جائیں گی اور ذات باری ہی ہمیشہ رہے گی اور دل کی آنکھ سے دیکھے اور اس خیال میں محو ہو جائے تا کہ اس کے معنی خوب منکشف ہو جائیں اور اپنے وجود کو فنا اور علم و عقل کو اضمحلال [کمزوری] ہو۔[5]

ذکر، شغل اور مراقبہ کے دوران جب سالک اپنے ذہن کو مخصوص نکات پر مرکوز کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں اسے کچھ انوار و تجلیات نظر آتے ہیں۔ یہ انوار اللہ تعالی کی جانب سے بھی ہو سکتے ہیں اور شیطان کی طرف سے بھی۔ ان سے متعلق فاضل مصنف لکھتے ہیں:

جب ذاکر باہتمام تقویٰ خدا کا ذکر کرنے لگتا ہے اور ذکر تمام اعضاء میں سرایت کر جاتا ہے اور غیر خدا سے دل پاک و صاف ہو جاتا ہے اور روحانیت سے تعلق خاص پیدا ہو جاتا ہے تو انوار الٰہی کا ظہور ہونے لگتا ہے اور وہ انوار کبھی خود اپنے میں دکھائی دینے لگتے ہیں اور کبھی اپنے سے باہر۔ اچھے انوار وہی ہیں جن کو سالک دل سینہ و سر یا دونوں طرف اور کبھی تمام بدن میں پائے یا کبھی داہنے بائیں کبھی سامنے سر کے پاس ظاہر ہوں وہ بھی اچھے ہیں لیکن ان کی طرف توجہ نہ کرنا چاہئے کہ کہیں لطف اندوز و متلذذ ہو کر خسارہ اٹھائے۔[6]

اس کے بعد انہوں نے متعدد علامات ایسی بیان کی ہیں جن سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ یہ انوار اللہ تعالی کی جانب سے ہیں یا شیطان کی طرف سے۔ ان علامات کی بنیاد صوفیاء کے تجربات ہیں۔

تصور شیخ

تصور شیخ کا مطلب ہے آنکھیں بند کر کے شیخ کا اس طریقے سے تصور کرنا کہ گویا انسان شیخ کی مجلس میں بیٹھا اس کی باتیں سن رہا ہے۔ عام

طور پر صوفیاء کے ہاں اس کا جو طریقہ رائج ہے، اسے بیان کرتے ہوئے مشہور صوفیانہ تحریک "دعوت اسلامی" کے مقالہ نگار مولانا احمد رضا خان بریلوی (1856-1921) کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> خلوت [یعنی تنہائی] میں آوازوں سے دور، رو بہ مکان شیخ [یعنی مرشد کے گھر کی طرف منہ کر کے]، اور وصال ہو گیا ہو تو، جس طرف مزار شیخ ہو ادھر متوجہ بیٹھے۔ محض خاموشی، باادب، بکمال خشوع و خضوع، صورت شیخ کا تصور کرے اور اپنے آپ کو ان کے حضور جانے، اور یہ خیال جمائے کہ سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم سے انوار و فیض، شیخ کے قلب پر فائض ہو رہے ہیں۔ اور میرا قلب، قلب شیخ کے نیچے، بحالت دریوزہ گری [یعنی گداگری] میں لگا ہوا ہے۔ اور اس میں سے، انوار و فیوض، ابل ابل کر، میرے دل میں آ رہے ہیں۔
>
> اس تصور کو بڑھائے، یہاں تک کہ جم جائے اور تکلف کی حاجت نہ رہے۔ اس کی انتہا پر، صورت شیخ [یعنی پیر و مرشد کا چہرہ مبارک] خود متمثل ہو کر مرید کے ساتھ رہے گی۔ اور ان شاء اللہ عزوجل [اللہ و رسول عزوجل و صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کی عطا سے] ہر کام میں مدد کرے گی۔ اور اس راہ میں جو مشکل اسے پیش آئے گی اس کا حل بتائے گی۔[7]

بریلوی مکتب فکر کے صوفی حلقوں میں تصور شیخ سے بالعموم کام لیا جاتا ہے اور اسے بڑی برکت کا باعث سمجھا جاتا ہے البتہ دیوبندی مکتب فکر کے حلقوں میں اس سے پرہیز کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ موجودہ حالات میں تصور شیخ بعض خطرات کا باعث ہے، اس وجہ سے اس سے بچنا چاہیے۔ سید شبیر احمد کاکاخیل لکھتے ہیں:

> اس میں خطرہ شیخ کو حاظر ناظر سمجھنے کا ہے۔ کیونکہ سالک اپنے محبوب شیخ کے ساتھ محبت میں بہت کچھ وابستہ کر لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ جب سالک کے اخلاص اور طلب کی وجہ سے کسی موقعہ پر مدد کرتا ہے تو سالک اس کو شیخ کی طرف سے سمجھنے لگتا ہے جو آہستہ آہستہ شرک کی طرف چلا جاتا ہے۔ تصویر کو بھی تو اس لیے حرام قرار دیا گیا ہے کہ یہ آہستہ آہستہ شرک میں بدلنے لگتی ہے۔ یہ محبت ایسی چیز ہے کہ عقل کو سلب کر دیتی ہے اور شیخ کے ساتھ محبت فطری ہے اس لیے اگر اس کی تصویر دل میں بسا لی جائے تو یہ بھی آہستہ آہستہ خطرے کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔[8]
>
> حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے نزدیک یہ شغل خواص کے لیے تو مفید ہے لیکن عوام کے لیے سخت مضر کیونکہ اس میں صورت پرستی تک بات جا سکتی ہے جو کہ شرک کا زینہ ہے۔ کثرت تصور سے بعض اوقات کوئی صورت مثالیہ ظاہر ہو سکتی ہے جو بعض اوقات محض خیال ہوتا ہے اور بعض دفعہ کوئی لطیفہ غیبی اس شکل میں متمثل ہو جاتا ہے جس کا بسا اوقات شیخ کو پتہ بھی نہیں ہوتا، لیکن سالک اس کو حاضر ناظر سمجھ کر اپنا نقصان کر سکتا ہے، اس لیے اس سے بچنا اولی ہے۔ اس کے مقاصد کو حاصل کرنے کا اچھا طریقہ یہ ہے کہ شیخ کے ملفوظات اور کتابیں پڑھے یا پھر اپنے پیر بھائیوں [اپنے پیر کے دوسرے مرید] سے اس کا تذکرہ کرے۔[9]

عشق مجازی

بعض اہل تصوف کے ہاں یہ تصور موجود ہے کہ عشق مجازی، عشق حقیقی کی سیڑھی ہے۔ عشق مجازی سے مراد وہ عشق ہے جو انسان کو کسی اور انسان سے ہو جاتا ہے اور عشق حقیقی سے مراد وہ عشق ہے جو انسان کو اللہ تعالی سے ہوتا ہے۔ عام طور پر عشق مجازی صنف مخالف سے ہوتا ہے مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی جنس کے دو افراد کے مابین ایسا عشق ہو جائے۔ اپنے پیر و مرشد سے سبھی صوفی عشق کی حد تک محبت کرتے ہیں۔ صوفی خانقاہوں میں ہر طبقے اور ہر عمر کے لوگ آتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بڑی عمر کا کوئی شخص

کسی کم عمر خوبصورت لڑکے پر عاشق ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں ان کے شیخ کے لیے ایک مشکل کھڑی ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیانہ تربیت میں امر دپرستی (خوبصورت لڑکوں سے عشق) کی مذمت پر بہت زور دیا جاتا ہے۔

بعض صوفی بزرگوں کے بارے میں یہ منقول ہے کہ وہ کسی خاتون یا لڑکے کے عشق میں گرفتار ہو گئے اور اس کے نتیجے میں انہوں نے زبردست قسم کی شاعری کر دی۔ بعض صوفی بزرگوں سے عشق مجازی کی تعریف میں اشعار بھی منقول ہیں جیسے مولانا جامی کا شعر ہے: متاب از عشق رد گرچہ مجازیست۔۔۔ کہ آن بہر حقیقت کار سازیست۔ یعنی عشق سے اعراض نہ کرو چاہے مجازی ہی کیوں نہ ہو کیونکہ وہ عشق حقیقی کے لیے سبب ہے۔ اس کے متعلق سید شبیر احمد کاکا خیل لکھتے ہیں:

> ان بزرگوں کا عشق مجازی کی تائید سے صرف اتنا مراد ہے کہ اگر خدانخواستہ کسی کو عشق مجازی ہو جائے تو پھر اس سے کام لینا چاہیے تا کہ اس کو ہی عشق حقیقی کا ذریعہ بنایا جائے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس مردار [معشوق] کے ساتھ تو بالکل تعلق نہ رکھا جائے بلکہ ہو سکے تو تعلق توڑ دیا جائے اور اس سے جو سوز و گداز پیدا ہو، اس کو عشق حقیقی کے لیے استعمال کیا جائے۔ سب سے بہتر طریقہ تو اس میں یہ ہے کہ اگر شیخ کامل ہو تو اس کی راہنمائی حاصل کی جائے، ورنہ وضو کر کے خوشبو لگا کر خوب دل کے ساتھ 500 سے ایک ہزار تک ذکر نفی اثبات اس طرح کرے کہ لا الہ کے ساتھ سوچے کہ میں نے اس مردار کی محبت کو دل سے نکال دیا اور الا اللہ کے ساتھ یہ تصور کرے کہ اپنے دل میں اللہ تعالی کا محبت داخل کیا۔ اس میں ضرب بھی ہو۔ [10]

سماع

اہل تصوف بالخصوص چشتی اور سہروردی سلسلے کے صوفیاء میں سماع کو غیر معمولی حیثیت حاصل ہے۔ سماع کا مطلب ہے اچھی آواز میں گانا اور رقص کرنا۔ اس کی مختلف شکلیں رائج ہیں جیسے برصغیر میں سماع عام طور پر قوالی کی شکل میں ہوتا ہے جس میں سازوں کے ساتھ موسیقی بھی ہوتی ہے۔ دعوت اسلامی کے حلقوں میں یہ اجتماعی نعت خوانی کی شکل میں رائج ہے۔ اس سماع میں لوگ بے حال ہو کر رقص بھی کرنے لگتے ہیں اور کبھی بے خود ہو کر تڑپنے لگتے ہیں۔ اسے "حال کھیلنا" کہتے ہیں۔ ترکی کے صوفی درویش لمبے لمبے فراک پہن کر باقاعدہ گردش کرتے ہوئے رقص کرتے ہیں۔ مشہور صوفی بزرگ امیر خسرو (650-725/1253-1325) کو کئی سازوں جیسے ستار وغیرہ کا موجد قرار دیا جاتا ہے۔

سازوں والی موسیقی کے ساتھ سماع کے معاملے میں پابند شریعت صوفیاء کے دو نقطہ ہائے نظر ہیں۔ ان میں سے جو لوگ سازوں کو مطلقاً حرام سمجھتے ہیں، وہ سازوں کے ساتھ قوالی کو بھی حرام ہی قرار دیتے ہیں۔ جن اکابر صوفیاء سے سماع ثابت ہے، ان کے اقوال کی وہ یا تو تاویل کرتے ہیں یا پھر یہ سمجھتے ہیں کہ ان اقوال و افعال کو ان کی جانب غلط طور پر منسوب کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس صوفیاء کا دوسرا گروہ، جس میں زیادہ تر چشتی سلسلہ کے صوفی علماء شامل ہیں، موسیقی کے ساتھ سماع کو جائز سمجھتے ہیں۔ اس کے لیے وہ، وہی دلائل پیش کرتے ہیں جنہیں ہم ماڈیول CS07 میں موسیقی کی بحث میں بیان

کریں گے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ خواجہ معین الدین چشتی (535-627/1141-1230) اور ان کے مریدین نے سماع کی مدد سے بڑی تعداد میں ہندوؤں کو اسلام کی جانب راغب کیا کیونکہ ان کے ہاں موسیقی کو غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے۔

اسائنمنٹس

- اہل تصوف کی ان اصطلاحات کی وضاحت کیجیے: مجاہدہ، شغل، سماع، مراقبہ
- تصور شیخ اور عشق مجازی سے متعلق اہل تصوف کے مختلف گروہوں کا نقطہ نظر کیا ہے؟

تعمیر شخصیت
اچھی ٹائم مینجمنٹ کے لئے غیر ضروری کاموں کو چھوڑنا پڑتا ہے۔

---

[1] سید شبیر احمد کاکا خیل۔ فہم التصوف۔ ص147۔ راولپنڈی: خانقاہ امدادیہ۔ (www.tazkia.org (ac. 24 Apr 2011

[2] حوالہ بالا۔ ص180

[3] حوالہ بالا۔ ص199-203

[4] حوالہ بالا۔ ص204-206

[5] حوالہ بالا۔ ص220-221

[6] حوالہ بالا۔ ص221

[7] مجلس علمی۔ آداب مرشد کامل۔ حصہ 3، ص9۔ www.dawateislami.net

[8] سید شبیر احمد کاکا خیل۔ تصوف کے بارے میں عام پوچھے جانے والے سوالات۔ (www.tazkia.org (ac. 24 Apr 2011

[9] سید شبیر احمد کاکا خیل۔ فہم تصوف۔ ص224

[10] حوالہ بالا۔ ص.224-225

باب 3: تصوف کے دیگر امور

اہل تصوف کو دو طرح کے امور سے واسطہ پڑتا ہے: ایک توابع اور دوسرے موانع۔ ان کی تفصیل یہ ہے۔

توابع

توابع سے مراد وہ امور اور کیفیات ہیں جن سے ایک سالک (راہ تصوف میں سفر کرنے والا) کو واسطہ پڑ سکتا ہے۔ ان میں بعض امور ایسے ہوتے ہیں، جن میں سالک یا کسی اور کو نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے اور بعض امور ایسے ہوتے ہیں جن میں نقصان کا اندیشہ نہیں ہوتا ہے۔ وہ امور یہ ہیں: وحدت الوجود؛ سکر اور صحو؛ کشف اور الہام؛ استغراق؛ تصرف؛ قبض و بسط؛ کرامت؛ مشاہدہ؛ وجد؛ دعاؤں کا قبول ہونا اور فہم و فراست؛ اچھے خواب؛ فناء و بقاء؛ عملیات۔

اب ہم انہیں تفصیل سے بیان کرتے ہیں:

وحدت الوجود

وحدت الوجود ایک فلسفہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ صرف اور صرف ایک ہی وجود حقیقی ہے اور وہ اللہ تعالی کی ہستی ہے۔ اس کے علاوہ جو بھی کائنات ہمیں نظر آتی ہے، یہ سب محض ایک وہم اور دھوکہ ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ فلسفہ درست ہے تو پھر نہ تو انسان کا کوئی حقیقی وجود ہے اور نہ ہی شیطان کا۔ اس کے بعد نہ تو دین کا کوئی تصور باقی رہ جاتا ہے، نہ رسالت کا اور نہ آخرت کی جزا و سزا کا۔ اس کے بعد نعوذ اللہ رحمان اور شیطان بھی ایک ہو جاتے ہیں اور تمام کے تمام انسان، حیوانات، جمادات سبھی اسی ایک وجود باری تعالی کا حصہ بن جاتے ہیں اور نہ کوئی خالق رہتا ہے اور نہ مخلوق۔ اکثر ہندوؤں کا بھی یہی عقیدہ ہے جس کے باعث وہ بہت سے جانوروں کی تعظیم کرتے ہیں اور انہیں بھگوان ہی ایک شکل (Incarnate) قرار دیتے ہیں۔ اسلام کے ساتھ اس کھلے تصادم کے باوجود صوفیاء کے ایک بڑے حلقے میں اس فلسفے کا بڑا زور رہا ہے۔

بعض صوفی بزرگ اس نظریے کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ جب ایک سالک صوفیانہ طریق پر فنا فی اللہ کے مقام پر پہنچتا ہے تو پھر اس پر ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ اسے اللہ کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ معاملہ حقیقت نہیں ہوتا بلکہ محض اس سالک کی کیفیات ہوتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فی الحقیقت ان تمام مخلوقات کا اپنا ایک وجود ہے اور یہ اللہ تعالی کی تخلیق ہیں۔ سالک پر فنا فی اللہ کے مقام پر پہنچ کر ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ اسے اللہ تعالی کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا ہے مگر فی الحقیقت وہ سب موجود ہوتا ہے۔ اس تصور کو مشہور صوفی بزرگ شیخ احمد سرہندی (971-1034/1564-1624) نے "وحدت الشہود" کا نام دیا۔ بعض صوفیاء کہتے ہیں کہ یہ دونوں

اصطلاحات ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔

وحدت الوجود کے بارے میں صوفیاء کے ہاں دو نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں۔ ان کا ایک گروہ تو وحدت الوجود پر ایمان رکھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ فی الواقع صرف ایک ہی وجود ہے۔ یہی تصور ان کی تحریروں میں چھلکتا ہے۔ دوسرا گروہ وحدت الشہود پر یقین رکھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ معاملہ صرف ایک سالک کی کیفیات کا ہے، فی الحقیقت ایک وجود کا یہ گروہ قائل نہیں ہے۔

سکر اور صحو

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک سالک جب فنا کے مقام پر پہنچتا ہے تو اس پر بے خودی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اسے "سکر" کہا جاتا ہے۔ سکر سے باہر نکل کر نارمل ہونے کو "صحو" کہا جاتا ہے۔ اگر سکر کی حالت مستقل رہے تو ایسا صوفی "مجذوب" کہلاتا ہے۔ مجذوب حضرات دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوتے ہیں، کبھی برہنہ ہو کر گلیوں میں گھومتے ہیں اور پوشیدہ اعضاء کی نمائش بھی کر دیتے ہیں، کبھی سخت گرمی میں آگ کے سامنے بیٹھے رہتے ہیں، کبھی غلیظ گالیاں دیتے ہیں اور کبھی ایسی گفتگو کرتے ہیں جو کسی سمجھ میں نہیں آتی۔ ایسے مواقع پر بعض صوفیاء خدا ہونے کا دعوی بھی کر بیٹھتے ہیں۔ صوفیاء کا وہ گروہ جو وحدت الوجود کا قائل ہے، اس بات کو حقیقی سمجھ بیٹھتا ہے اور ان کے خدائی کے دعوے کو درست سمجھ بیٹھتا ہے۔

مشہور صوفی منصور حلاج (244-309/858-922) نے انا الحق یعنی "میں خدائے حق ہوں" کا نعرہ لگایا جس کی پاداش میں انہیں موت کی سزا دی گئی لیکن یہ بات معلوم و معروف ہے کہ وہ حالت سکر میں نہیں تھے ورنہ انہیں یہ سزا نہ دی جاتی کیونکہ اس حالت میں تو بے شمار صوفیاء نے ایسے دعوے کیے ہیں۔ ایک صوفی بزرگ ابو یزید بسطامی (188-260/804-874) کے بارے میں صوفیاء کی کتب میں لکھا ہے کہ انہوں نے "سبحانی ما اعظم شانی" یعنی "میں پاک ہوں، میری شان کیا بلند ہے!" کا اعلان کر دیا۔ جب ان کی کیفیت درست ہوئی تو انہوں نے ان کلمات سے اظہار براءت کیا۔

جو گروہ وحدت الشہود کا قائل ہے، وہ یہ کہتا ہے کہ وحدت الوجود میں اگر کوئی شخص بے خودی یا سکر کی کیفیت میں ہو، تو اسے معذور سمجھنا چاہیے اور اس کی باتوں کو محض "دیوانے کی بڑ" سمجھنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ بے خودی کے عالم میں وحدت الوجود کی کیفیت کو مضر سمجھتے ہیں، ہاں اگر بے خودی کی کیفیت نہ ہو، تو پھر اس کیفیت میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے ہیں۔

کشف اور الہام

کشف الٰہی سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالی کی ذات اور صفات سے متعلق علوم، اسرار و معارف کا انسان کے قلب پر وارد ہونا۔ کشف کونی سے مراد یہ ہے کہ ایسی چیزوں کو حالت کشف یا خواب میں دیکھنا جو عام لوگوں کو نظر نہیں آتیں جیسے مستقبل کا کوئی واقعہ، ماضی کا کوئی پوشیدہ راز وغیرہ۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہوتی ہے جس میں انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ باطن کی آنکھ سے کچھ چیزوں کا مشاہدہ کر رہا ہے

یا پھر ہاتف غیبی سے آنے والی آواز اس کی راہنمائی کر رہی ہے۔ اسے حالت بیداری یا خواب میں مستقبل کے واقعات دکھائے جا رہے ہوتے ہیں، اور غیبی آواز اس سے کلام کر رہی ہوتی ہے۔

بہت سے صوفیاء کو دیکھا گیا ہے کہ وہ کشف کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں۔ جیسا کہ آپ احمدیت سے متعلق ماڈیول میں پڑھ چکے ہیں کہ مرزا غلام احمد قادیانی صاحب نے بھی اپنے دعوی نبوت کی بنیاد کشف پر ہی رکھی تھی۔ پابند شریعت صوفیاء کشف کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور اس بات کو مانتے ہیں کہ کشف کو تبھی درست مانا جائے گا جب یہ شریعت کے مطابق ہو۔ سید شبیر احمد کاکا خیل لکھتے ہیں:

> کشف کسی پردے والی چیز کے ظاہر ہونے کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بہت ساری چیزیں پیدا کی ہیں جن پر پردے پڑے ہوئے ہیں یا بہت سارے واقعات ہوئے ہیں، ہو رہے ہیں یا ہوں گے اور ان پر پردے پڑے ہوئے ہیں اگر اللہ تعالیٰ ان کو کسی پر ظاہر کر دیں تو یہ "کشف کونی" کہلاتا ہے۔ اس میں کافر و مسلمان کی بھی تخصیص نہیں۔ کیونکہ یہ دنیا کی چیزیں ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ بعض کی نظر تیز اور بعض کی کم رکھتے ہیں اسی طرح کسی پر زیادہ چیزوں اور واقعات کو ظاہر کرتے ہیں کسی پر کم۔ اس طرح بہت سے علوم و معارف اور اسرار ہیں جو عام لوگوں کی دسترس سے باہر ہیں اور بعض خوش قسمتوں کو ان میں سے کچھ عطا فرما دیتے ہیں۔ اس کو "کشف الٰہی" کہتے ہیں۔ یہ البتہ ایک عظیم نعمت ہے لیکن غیر اختیاری ہونے کی وجہ سے کوئی اس کے بھی درپے نہ ہو کیونکہ قبولیت کا دارومدار معلوم چیزوں میں خدا کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے پر ہے۔ پس جتنا علم ضروری ہے اس کا تو حاصل کرنا ضروری ہے اور وہ کسبی اور اختیاری ہے اور جو غیر اختیاری ہے اس کے بارے میں فیصلہ اللہ پر چھوڑ دینا چاہیئے۔
>
> عمل شریعت کے مطابق ہونا چاہیئے، چاہے اس کو کشف ہو یا نہ ہو کیونکہ شریعت وحی سے ہے اور ہمارے کشف کا کوئی اعتبار نہیں۔ ٹھیک بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔ پس یقینی کے مقابلے میں ظنی کی کیا حیثیت ہے![1]

استغراق

استغراق ایسی حالت کو کہتے ہیں جس میں سالک خود کو اور اپنے ماحول کو فراموش کر کے اپنے صوفیانہ مشاہدات میں غرق ہوتا ہے۔ ایک صوفی بزرگ عبدالقدوس گنگوہی(d. 943/1537) کے بارے میں آتا ہے کہ وہ اتنے مستغرق رہا کرتے تھے کہ انہیں نماز کے اوقات کا علم بھی نہیں ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنے ایک خادم کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ ہر نماز کے وقت ان کے کان میں "حق، حق" کہے۔ اسے سن کر وہ استغراق سے باہر آتے اور نماز ادا کرتے۔

تصرف

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک صوفی کو یہ قوت حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے ذہن کی طاقت کو مرکوز کر کے کسی دوسرے شخص کے ذہن پر اثر انداز ہو سکے۔ عام طور پر صوفیاء لوگوں کے ساتھ ایسے تصرفات کرتے رہتے ہیں جس سے یہ لوگ ان کے مرید ہو جاتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس توجہ کی مدد سے وہ مرید کا کوئی مسئلہ حل کر دیتے ہیں اور اسے کسی نفسیاتی بیماری سے نجات دلا دیتے ہیں، کبھی وہ اسے کسی مقدس مقام جیسے خانہ کعبہ کا دیدار کروا دیتے ہیں، اور کبھی اس کے خوابوں پر اثر انداز ہو جاتے ہیں۔ جو شخص ان کے

تصرف اور توجہ سے متاثر ہوتا ہے، اسے ان سے غیر معمولی عقیدت ہو جاتی ہے اور وہ انہیں ولی اللہ سمجھنے لگتا ہے۔

پابند شریعت صوفیاء اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ یہ تصرف ہپناٹزم اور مسمریزم کی طرح محض ایک نفسیاتی عمل ہے۔ جو شخص بھی کچھ مخصوص مشقیں کرے، اسے یہ تصرف حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کا ولایت اور بزرگی سے کوئی تعلق نہیں۔ بہت سے غیر مسلم جوگی بھی اس کے ذریعے متعدد کمالات دکھا دیتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ وہ اس تصرف کی قوت کو اس وقت استعمال کرتے ہیں جب مرید کا کوئی مسئلہ حل کرنا مقصود ہو۔ اس کے لیے وہ گاڑی کی مثال دیتے ہیں کہ اگر کوئی گاڑی کسی گڑھے میں پھنس جائے تو دھکا لگا کر اسے نکالا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح مرید اپنے روحانی سفر میں اگر کسی مقام پر پھنس جائے تو اس کی مدد کی جاتی ہے۔

قبض اور بسط

قبض کو سادہ زبان میں ڈپریشن کہا جاتا ہے، بسط اس کا متضاد ہے۔ جیسے دنیاوی امور میں انسان پر ڈپریشن بھی طاری ہوتا ہے اور وہ اس صورتحال سے نکلنے پر بڑا سرور محسوس کرتا ہے، ویسے ہی روحانی امور میں اس کے ساتھ یہی معاملہ پیش آجاتا ہے۔ سید شبیر احمد لکھتے ہیں:

> واردات [یعنی انوار و تجلیات کا وارد ہونا] کا انقطاع جو کسی مصلحت سے ہوتا ہے، قبض کہلاتا ہے اور ان واردات کا حاصل ہونا بسط۔ جب محبوب کی تجلی جلالی سالک کے قلب پر پڑتی ہے تو اس سے سالک دہشت میں آجاتا ہے اور عالم خوف میں دل گرفتہ ہو جاتا ہے جس سے اس کے دل کا سرور اور اطمینان تہس نہس ہو جاتا ہے اور سالک اپنے آپ کو مردود خیال کر کے زندگی سے بیزار ہو جاتا ہے کیونکہ جس کے لیے اس نے سب کو چھوڑا تو اب بظاہر اس کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس محبوب نے مجھے چھوڑ دیا۔ اس سے غموں کا پہاڑ اس کے دل پر آجاتا ہے جس سے بعض اوقات خودکشی تک کی نوبت آسکتی ہے۔ اس وقت شیخ کامل کی بڑی ضرورت ہوتی ہے جو اس کی تسلی اور توجہ سے مدد کرتے رہتے ہیں جب تک کہ وہ اس حالت سے نکل نہ جائے۔[2]

واضح رہے کہ صوفیاء کے ہاں واردات ایک خاص اصطلاح ہے جس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ مخصوص انوار و تجلیات یا خیالات اس کے ذہن پر وارد ہوں۔

کرامت

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ صوفی سے کچھ ایسے امور صادر ہو جاتے ہیں جو کہ خلاف عادت ہوتے ہیں، انہیں کرامت کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایسا بھی ہوتا ہے کہ صوفی ہوا میں چلنے لگتا ہے یا آگ میں سے گزر جاتا ہے۔ بہت سے لوگ ان کرامات کو صوفی صاحب کے ولی ہونے کی نشانی کے طور پر پیش کرتے ہیں تاہم پابند شریعت صوفی مانتے ہیں کہ خلاف عادت امور ولایت کی دلیل نہیں ہوا کرتے کیونکہ غیر مسلم جوگی بھی ایسے بہت سے کام کر دکھاتے ہیں جس کے لیے وہ "استدراج" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ ایک عام شخص کے لیے کرامت اور استدراج میں فرق کرنا ممکن نہیں ہوتا ہے۔

مشاہدہ حق

صوفیاء کے مختلف حلقوں میں مشاہدے کے مختلف مفاہیم پائے جاتے ہیں۔ بعض صوفیاء کے تذکروں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشاہدہ حق سے ان کی مراد اللہ تعالیٰ کا دیدار ہے۔ اس پر تو یہ سوال وارد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار تو اس دنیا میں ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ قرآن مجید میں واضح طور پر ارشاد فرمایا گیا ہے کہ لا تُدْرِكُهُ الأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الأَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ، یعنی "آنکھیں اس [اللہ] کا ادراک نہیں کر سکتیں جبکہ وہ آنکھوں کا ادراک کر لیتا ہے اور وہ نہایت ہی باریک بین اور باخبر ہے۔"[3] اسی طرح سیدنا موسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام جیسے جلیل القدر پیغمبر نے اللہ تعالیٰ کے دیدار کی خواہش کی تو جب ان کے سامنے محض ایک تجلی آئی تو اس سے وہ بے ہوش ہو گئے۔[4] اس کے بعد کون صوفی ایسا ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کا دیدار کر سکے۔

پابند شریعت صوفیاء مشاہدہ حق کا مفہوم یہ بیان کرتے ہیں کہ اس سے مراد ایسی کیفیت ہے جس میں انسان خود کو اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر محسوس کرتا ہے۔ اس کے لیے وہ بخاری و مسلم اس مشہور حدیث کی مثال دیتے ہیں جس میں حضرت جبرائیل علیہ الصلوۃ والسلام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ احسان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ایسی حالت میں نماز کہ گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر یہی کیفیت طاری کر لو کہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔[5] صوفیاء کا کہنا یہ ہے کہ روحانی مشقوں سے یہ کیفیت نماز کے علاوہ بھی انسان پر طاری ہو جاتی ہے جس سے وہ خود کو ہر وقت اللہ تعالیٰ کے حضور میں محسوس کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حضور کی اس کیفیت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان گناہوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

فناء اور بقاء

فناء کا مطلب ہے بالکل ہی ختم ہو جانا۔ اہل تصوف کی اصطلاح میں اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان میں برے اوصاف بالکل ختم ہو جائیں اور نیک اوصاف باقی رہ جائیں۔ ایسا مشاہدہ حق کی کیفیت کی وجہ سے ہوتا ہے جب انسان خود کو اللہ تعالیٰ کے حضور میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ ایسے موقع پر بعض صوفیاء ہوش و حواس کی حدود سے نکل کر مجذوب ہو جاتے ہیں۔ فناء کے مقام پر پہنچ کر بعض صوفیاء نارمل کیفیت میں آ جاتے ہیں تاکہ دیگر لوگوں کی راہنمائی کا کام کر سکیں۔ اس حالت کو بقاء کہا جاتا ہے۔

وجد

وجد سے مراد ایسی کیفیت ہے جس کا اثر جسم پر ظاہر ہو۔ اس میں بے ہوشی، چیخنا چلانا، ناچنا، تڑپنا، اچھلنا اور رونا سبھی شامل ہیں۔ تلاوت قرآن مجید، صوفیانہ کلام کے سماع یا کسی ذکر وغیرہ کے نتیجے میں صوفیاء پر ان میں سے کوئی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ خاص کر سماع کے دوران تڑپنا، اچھلنا اور رقص کرنے کی کیفیت پیش آ جاتی ہے جسے عام زبان میں "حال کھیلنا" کہا جاتا ہے۔ قوالیوں کے دوران یہ کیفیت عام دیکھی جا سکتی ہے۔ بعض لوگوں پر یہ کیفیت فی الواقع طاری ہوتی ہے جبکہ بعض لوگ اس کیفیت کا ڈرامہ رچا رہے ہوتے ہیں۔

اجابت دعا اور فہم و فراست

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی صوفی کی دعائیں بہت زیادہ قبول ہونے لگ جاتی ہیں۔ اگر یہ دعائیں دوسروں کے لیے ہوں تو ایسے صوفی کے پاس دعا کروانے والوں کو بڑا مجمع لگ جاتا ہے۔ اسی طرح کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بعض دینی یا دنیاوی معاملات کا غیر معمولی فہم ایک سالک کو عطا ہو جاتا ہے جسے فراست کہا جاتا ہے۔ اسی فراست کی بدولت وہ لوگوں کے مسائل حل کرنے لگ جاتا ہے۔

اچھے خواب اور الہام

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ صوفیاء کا اچھے خواب آنے لگ جاتے ہیں اور ان کے ذریعے کچھ راہنمائی مل جاتی ہے۔ الہام خواب میں بھی ہو سکتا ہے اور بیداری کے عالم میں بھی کوئی بات اچانک ذہن میں آ جاتی ہے۔ یہ اللہ تعالی کی جانب سے بھی ہو سکتا ہے اور محض ایک شیطانی وسوسہ بھی ہو سکتا ہے۔ بعض صوفیاء الہامات کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور ان پر عمل کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ پابند شریعت صوفیاء اس کے برعکس رحمانی اور شیطانی الہامات میں فرق کرتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ الہام شریعت کے مطابق ہے یا نہیں۔

عملیات

بہت سے صوفی عملیات یعنی تعویذ دھاگے دینے، جن نکالنے اور اسی قسم کے دیگر امور میں مشغول رہتے ہیں۔ بہت بڑی تعداد میں لوگ اپنے مسائل کے حل کے لیے ان کی طرف رجوع کرتے ہیں اور کام پورا ہونے پر ان کے ولی اللہ ہونے پر ایمان لے آتے ہیں۔ کام پورا نہ ہونے کی صورت میں یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اللہ تعالی کی مرضی نہ تھی۔ مخالف شریعت صوفی ان کے ذریعے بہت سے لوگوں کو اپنا مرید بناتے ہیں۔

پابند شریعت صوفیاء کا کہنا یہ ہے کہ عملیات کا دین یا تصوف سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ محض ایک فن ہے اور جو شخص بھی اسے سیکھ لے، اس کی پریکٹس کر سکتا ہے خواہ وہ نیک ہو یا بد، مسلم ہو یا غیر مسلم۔

سیر الی اللہ کے موانع

موانع سے مراد وہ امور ہیں جو کسی سالک کی سیر الی اللہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ ان میں تمام گناہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ چند اور امور ہیں جو رکاوٹ بن جاتے ہیں: تصنع؛ تعجیل یا عجلت پسندی؛ حسن پرستی؛ مخالفت سنت؛ مخالفت شیخ؛ دنیاداری۔

اب ہم سید شبیر احمد کاکاخیل کی کتاب "فہم التصوف" سے ان کی تفصیلات بیان کرتے ہیں:

تصنع

تصنع کا مطلب یہ ہے کہ انسان کسی دنیاوی مفاد کے لیے صوفیاء کے حالات کی نقل کرنے کی کوشش کرے۔ مثلاً کشف و الہام کا دعوی کرے، پیری مریدی کا ڈھونگ رچائے، زبردستی خود پر وجد طاری کرے، الٹے سیدھے شعبدے دکھا کر انہیں اپنی کرامات قرار دے اور مسمریزم وغیرہ کے ذریعے اپنے مریدین پر توجہ ڈال کر انہیں متاثر کرنے کی کوشش کرے۔ مخالف شریعت صوفی زیادہ تر ایسا ہی کرتے ہیں۔

پابند شریعت صوفیاء کا کہنا یہ ہے کہ تصنع کا مقصد اگر محض ڈھونگ رچا کر مریدوں سے مال بٹورنا ہو تو یہ ایک عظیم گمراہی ہے۔ ہاں اگر کسی شخص پر وجد وغیرہ کی کیفیت طاری نہ ہوتی ہو اور وہ محض بزرگوں کی نقل کرنے کی کوشش کرے اور اس کی نیت کسی کو متاثر کرنے کی نہ ہو تو یہ جائز ہے۔

تعجیل یا عجلت پسندی *(Hastiness)*

عجلت پسندی کا مطلب یہ ہے کہ اپنے مجاہدات اور دیگر امور کے نتائج کے حصول میں جلدی کا مطالبہ کرنا۔ یعنی انسان مجاہدہ شروع کرے تو اس کی خواہش ہو کہ چند دن میں اس پر انوار و تجلیات نازل ہونے لگیں اور وہ تصوف کی منازل طے کر کے سیر فی اللہ کے مقام پر پہنچ جائے۔ ایسا کرنا چونکہ اپنے شیخ پر زبردستی کرنا ہے، اس وجہ سے اسے بہت برا سمجھا جاتا ہے۔ پابند شریعت صوفیاء کہتے ہیں کہ شیخ کے بس میں صرف طریقہ بتانا ہوتا ہے، اس کے نتائج اللہ تعالی کے ہاتھ میں ہوتے ہیں، اس وجہ سے جلدی مچانے والے کبھی کامیاب نہیں ہوتے اور اپنے شیخ سے بدظن ہو جاتے ہیں۔ مرید کو جب جلدی جلدی کامیابی حاصل نہیں ہوتی تو وہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ شیخ کسی کام کا نہیں ہے۔

حسن پرستی

حسن پرستی عموماً دو پہلوؤں سے ہوتی ہے: خواتین اور خوبصورت لڑکوں کو تاڑنا، ان سے دوستی کرنا اور پھر معاملے کو آخری مقام پر لے جانا۔ صوفیاء اسے پہلے مرحلے ہی پر منع کر دیتے ہیں تاکہ بات آگے نہ بڑھ سکے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ خوبصورت لڑکوں کا معاملہ خواتین سے بھی زیادہ شدید ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پچھلے وقتوں میں خواتین سے دوستی ایک مشکل کام تھا مگر لڑکوں سے دوستی آسان تھی۔ خانقاہوں سے وابستہ افراد کے لیے اس کے مواقع زیادہ تھے کیونکہ یہاں ہر قسم کے اور ہر عمر کے لوگ آیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیاء ان لڑکوں سے دوستی اور قرب سے سختی سے منع کیا کرتے تھے تاکہ ان کے مریدین کسی برائی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

مخالفت سنت

پابند شریعت صوفیاء کا کہنا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کی مخالفت سے تصوف کی منازل کی راہ میں رکاوٹ پیدا ہو

جاتی ہے۔ اس سے وہ مخالف شریعت صوفیاء پر تنقید کرتے ہیں جو بہت سے خلاف سنت اور غیر شرعی امور میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس مخالف شریعت صوفیاء پابندی سنت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ہیں۔

مخالفت شیخ

صوفیاء خواہ وہ پابند شریعت ہوں یا مخالف شریعت، کا کہنا یہ ہے کہ ایک مرید کو اپنے شیخ پر کامل اعتماد ہونا چاہیے اور اسے آنکھیں بند کر کے اپنے شیخ کی پیروی کرنی چاہیے، اس سے اختلاف نہیں کرنا چاہیے، اس کی بے ادبی سے بچنا چاہیے اور اپنے دل میں کوئی ایسا خیال بھی نہیں لانا چاہیے جو شیخ کو رنجیدہ کرنے کا باعث بنے۔ گویا کہ مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کے الفاظ میں اسے مردہ بدست زندہ بن کر رہنا چاہیے۔ اس میں اگر ذرہ برابر بھی کمی رہ گئی تو منازل سلوک میں بہت نقصان ہوتا ہے۔

اکثر صوفیاء شیخ کے ساتھ ذرہ برابر بھی اختلاف کی اجازت نہیں دیتے ہیں۔ بعض پابند شریعت صوفیاء کا کہنا یہ ہے کہ بعض جزئی مسائل میں شیخ سے ادب کے ساتھ اختلاف رائے کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ شیخ خود اس کی اجازت دے دے۔

دنیاداری

اہل تصوف دنیا داری کی بہت مخالف کرتے ہیں۔ ان کی اکثریت کا کہنا یہ ہے کہ انسان کو دنیا ترک کر کے تنہائیوں میں اللہ تعالی کی عبادت کرنی چاہیے۔ پابند شریعت صوفیاء کا موقف یہ ہے کہ دنیاوی فرائض ادا کرنا جیسے بیوی بچوں کو پالنا ضروری ہے۔ دولت کمانا بھی جائز ہے بشرطیکہ دنیا انسان کے دل میں گھر نہ کرے۔ اس کے لیے وہ کشتی کی مثال دیتے ہیں کہ کشتی اگر پانی کے اوپر رہے تو یہ عین مطلوب ہے لیکن اگر پانی کشتی میں آجائے تو اس کا نتیجہ ہلاکت کی صورت میں نکلتا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ دنیا اگر انسان کے دل میں نہ آئے اور انسان اس سے نفع اٹھالے تو جائز ہے لیکن اگر یہ اس کے دل میں آجائے تو پھر اسے تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

تصوف سے متعلق بعض متفرق امور

تصوف سے متعلق جن امور کا ہم نے دیگر عنوانات کے تحت ذکر نہیں کیا، ان کی تفصیل ہم یہاں بیان کرتے ہیں:

ملامتی فرقہ

صوفیاء کے اندر ایک فرقہ ایسا پایا جاتا ہے جو "ملامتی" کہلاتے ہیں۔ ان پر ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ یہ لوگوں سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کے سامنے یہ جان بوجھ کر ایسی حرکت کرتے ہیں کہ جس سے لوگ ان سے متنفر ہو جائیں مثلاً ایسے طریقے سے چوری کرنا کہ لوگ دیکھ لیں۔ بعض صوفیاء کسی گناہ پر اپنے نفس کو سزا دینے کے لیے ایسی حرکت کرتے ہیں تاکہ لوگ ان سے نفرت کریں، انہیں ماریں پیٹیں اور اس طرح سے یہ خود کو سزا دلواتے ہیں۔

پابند شریعت صوفیاء کا کہنا یہ ہے کہ ملامتی صوفیاء کے افعال بظاہر خلاف شریعت ہوتے ہیں مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس کی مثال میں وہ مشہور صوفی بزرگ بایزید بسطامی کا واقعہ پیش کرتے ہیں کہ وہ رمضان کے مہینے میں سفر سے واپس آ رہے تھے تو لوگ عقیدت میں ان کے استقبال میں اکٹھے ہو گئے۔ انہوں نے ان لوگوں کو متنفر کرنے کے لیے سب کے سامنے روٹی کا ٹکڑا کھا لیا۔ لوگوں نے رمضان کی بے حرمتی دیکھی تو سب انہیں چھوڑ گئے کہ یہ کیسا صوفی ہے جو روزے نہیں رکھتا حالانکہ انہوں نے اس وجہ سے روزہ قضا کیا تھا کہ مسافر پر روزہ فرض نہیں ہے۔

لوگوں کو خود سے متنفر کرنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ یہ ملامتی صوفیاء تنہائی کے طالب ہوتے ہیں اور اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ لوگ ان کے قریب مجمع لگائیں۔ دوسرے یہ کہ وہ اس طریقے سے لوگوں کی ملامت کے ذریعے اپنی نفس کشی کرتے ہیں اور اپنے آپ کو تکلیف دیتے ہیں جو کہ ان کے نزدیک ایک مجاہدہ ہوتا ہے۔

نفس انسانی کی اقسام

صوفیاء کے نزدیک انسانی شخصیت میں تین قسم کی قوتیں پائی جاتی ہیں جنہیں نفس کہتے ہیں: نفس امارہ، لوامہ اور مطمئنہ۔ نفس امارہ انسان کے اندر وہ قوت ہوتی ہے جو اسے برائی پر اکساتی ہے اور پھر اس پر نادم بھی نہیں ہوتی۔ نفس لوامہ وہ قوت ہے جو برائی پر اکساتی بھی ہے مگر اس پر انسان کو سرزنش بھی کرتی ہے۔ نفس مطمئنہ وہ قوت ہے جو اسے نیکی کی طرف بلاتی ہے اور اسی کی ترغیب دیتی ہے۔

اسائن منٹس

- اہل تصوف کی ان اصطلاحات کی وضاحت کیجیے: استغراق، وحدت الوجود، وحدت الشہود، ملامتی فرقہ، مشاہدہ حق، فناء اور بقاء، تصنع، سیر الی اللہ، سکر اور صحو، تصرف۔
- اہل تصوف کے نزدیک سیر الی اللہ میں کون کون سے عوامل رکاوٹ پیدا کرتے ہیں؟

---

[1] سید شبیر احمد کاکا خیل۔ تصوف سے متعلق عام پوچھے جانے والے سوالات۔ www.tazkia.org (ac. 24 Apr 2011)

[2] حوالہ بالا

[3] الانعام 6:103

[4] الاعراف 7:143

[5] بخاری، کتاب الایمان، حدیث 50

حصہ دوم: تصوف پر تنقید

پچھلے تین ابواب میں ہم نے تفصیل سے تصوف اور اس کے معاملات کا مطالعہ کر لیا ہے۔ اب ہم تصوف کی اساسات کو سمجھ چکے ہیں۔ اس باب میں ہم تفصیل سے اس تنقید کا جائزہ لیں گے جو ناقدین تصوف، صوفیانہ امور پر کرتے ہیں اور یہ دیکھیں گے کہ اہل تصوف اس کا کیا جواب دیتے ہیں۔ اس تنقید کو ہم بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں: صوفیانہ عقائد اور تصورات پر تنقید اور عملی تصوف پر تنقید۔

اہل تصوف کے جن عقائد پر تنقید کی جاتی ہے، وہ یہ ہیں:

- وحدت الوجود اور عقیدہ حلول
- اللہ تعالیٰ سے براہ راست تعلق کا دعوی
- امور آخرت کا استخفاف

عملی تصوف پر تنقید ان پہلوؤں سے کی جاتی ہے:

- نفسیاتی غلامی
- رہبانیت اور ترک دنیا
- تزکیہ نفس کے طریقے
- مخالفت شریعت

ان کے علاوہ اور بھی ضمنی اعتراضات ہیں جن کا مطالعہ ہم الگ الگ ابواب میں کریں گے۔

باب 4: عقیدہ وحدت الوجود

صوفیاء کے عقائد میں جو عقیدہ سب سے زیادہ تنقید کا نشانہ بنا ہے، وہ وحدت الوجود کا عقیدہ ہے۔ اسی سے متعلق حلول کا عقیدہ ہے جو بعض صوفیاء کے ہاں پایا جاتا ہے۔

وحدت الوجود اور عقیدہ حلول

جیسا کہ ہم پچھلے ابواب میں بیان کر چکے ہیں کہ وحدت الوجود کا عقیدہ صوفیاء کے اندر تقریباً متفق علیہ نظریہ ہے تاہم اس کی تفصیل کے بارے میں ان کے ہاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ عقیدہ حلول بھی بعض صوفیاء کے اندر پایا جاتا ہے جبکہ بعض اس سے انکار کرتے ہیں۔

وحدت الوجود کے فلسفے کا سادہ الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ صرف اور صرف ایک ہی وجود ہے اور وہ ہے اللہ تعالی۔ اس کی ذات کے علاوہ کوئی اور وجود نہیں پایا جاتا ہے۔ اگر اس بات کو مان لیا جائے تو پھر خالق و مخلوق میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا بلکہ انسان، حیوانات، نباتات، بے جان اشیاء، حتی کہ غلاظت اور شیطان بھی نعوذ باللہ، اللہ تعالی ہی کے وجود کا حصہ قرار پاتے ہیں۔ اس کے بعد اسلام اور کفر اور حلال و حرام میں بھی فرق کرنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کیونکہ حلال و حرام معاذ اللہ سبھی خدا ہی ہیں۔

حلول کے عقیدے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی کسی انسان کے اندر حلول کر جاتا ہے۔ اس عقیدے کو اگر وسیع معنوں میں لیا جائے تو پھر خدا ہر چیز کے اندر حلول کر جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوؤں کے ہاں بہت سے جانوروں جیسے گائے، سانپ اور بندر کا بڑا احترام کیا جاتا ہے کیونکہ ان کے نقطہ نظر کے مطابق بھگوان ان کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے ہاں یہ تصور بھی موجود ہے کہ بھگوان اپنے خاص بندوں کے اندر حلول کر جاتا ہے جو کہ "اوتار" کہلاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو پیروں فقیروں، جوگیوں اور سادھوؤں کی انتہائی تعظیم کرتے ہیں اور ان کی عقیدت کا یہ معاملہ ان کے اپنے بزرگوں تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ وہ دیگر مذاہب کے صوفیاء کی بھی ویسی ہی تعظیم کرتے ہیں۔

پابند شریعت صوفیاء حلول کے عقیدے سے انکار کرتے ہیں اور وحدت الوجود کے عقیدے کی مختلف تشریح کرتے ہیں۔ اس ضمن میں صوفی اکابرین کی جن عبارتوں پر اعتراض کیا جاتا ہے، وہ یا تو ان کی تاویل کرتے ہیں اور یا پھر انہیں الحاقی قرار دیتے ہیں۔ مناسب ہو گا کہ مختلف فریقوں کے نقطہ ہائے نظر بیان کرنے سے پہلے وحدت الوجود اور حلول سے متعلق اکابر صوفیاء کی عبارتیں پیش کر دی جائیں تاکہ اس نظریے کی وضاحت ہو جائے۔ ہم یہاں ترجمے کے ساتھ ساتھ اصل عربی عبارات تاکہ عربی دان حضرات خود ان کا مطالعہ فرما لیں۔

شیخ عبد اللہ الہروی (d. 481/1088) کی کتاب منازل السائرین میں یہ بات لکھی ہوئی ہے:

والتوحيد على ثلاثة وجوه:

الوجه الأول توحيد العامة الذي يصح بالشواهد والوجه الثاني توحيد الخاصة وهو الذي يثبت بالحقائق والوجه الثالث توحيد قائم بالقدم وهو توحيد خاصة الخاصة

فأما التوحيد الأول فهو شهادة أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له الأحد الصمد الذي لم يلد ولم يولد ولم يكن له كفوا أحدَ. هذا هو التوحيد الظاهر الجلي الذي نفى الشرك الأعظم وعليه نصبت القبلة وبه وجبتالذمة وبه حقنت الدماء والأموال وانفصلت دار الإسلام من دار الكفر ...

وأما التوحيد الثاني الذي يثبت بالحقائق فهو توحيد الخاصة وهو إسقاط الأسباب الظاهرة والصعود عن منازعات العقول وعن التعلق بالشواهد وهو أن لا تشهد في التوحيد دليلا ولا في التوكل سببا...

وأما التوحيد الثالث فهو توحيد اختصه الحق لنفسه واستحقه بقدره وألاح منه لائحا إلى أسرار طائفة من صفوته وأخرسهم عن نعته وأعجزهم عن بثه والذي يشار به غليه على ألسن المشيرين أنه إسقاط الحدث وإثبات القدم.

توحید کے تین درجے ہیں:

پہلا درجہ عام لوگوں کی توحید ہے جس کی صحت دلائل پر مبنی ہے۔ دوسرا درجہ خاص لوگوں کی توحید ہے جو کہ حقائق [یعنی روحانی تجربات] سے ثابت ہوتی ہے۔ توحید کا تیسرا درجہ خاص الخاص لوگوں کی توحید ہے جو کہ ذات قدیم [اللہ تعالی] ہی کی بنیاد پر قائم ہے۔

جہاں تک پہلی توحید کا تعلق ہے جو کہ یہ گواہی دینا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کا کوئی بھی شریک نہیں، وہ بے نیاز ہے، نہ وہ کسی کا باپ ہے نہ بیٹا اور اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ یہ ظاہر روشن توحید ہے جو کہ بڑے شرک کی نفی پر مبنی ہے۔ اسی کی بنیاد پر قبلہ کو نصب کیا گیا اور [غیر مسلموں] کو ذمی قرار دیا گیا۔ اسی کی وجہ سے خون اور مال محفوظ ہوتے ہیں اور دار الاسلام، دار الکفر سے الگ ہوتا ہے۔۔۔

دوسری قسم کی توحید وہ ہے جو حقائق پر مبنی ہے۔ یہ خاص لوگوں کی توحید ہے اور اس میں ظاہری اسباب کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور عقلی دلائل اور شواہد کے ساتھ تعلق سے بلند ہو کر دلیل کے بغیر توحید کو مانا جاتا ہے اور توکل کے لیے کسی سبب کو تلاش نہیں کیا جاتا ہے۔۔۔

توحید کا تیسرا درجہ وہ ہے جس حق تعالی نے اپنے لیے خاص کر لیا ہے اور بقدر ضرورت اس کے اسرار کو منتخب افراد پر ظاہر کرتا ہے۔ اس کی صفات بیان کرنے اور [اس کی تفصیلات] پھیلانا ممکن نہیں ہے۔ جس کی طرف اشارہ کرنے والوں نے یہ اشارہ کیا ہے کہ یہ حادث [مخلوق] کی نفی اور قدیم [اللہ تعالی] کا اثبات ہے۔[1]

شیخ ابن عربی (558-638/1164-1240) کی کتاب "فصوص الحکم" میں درج ہے:

وأن نفيها عين إثباتُها، علم أن الحق المنزة هو الخلق المشبه، وإن كان قد تميز الخلق من الخالق. فالأمر الخالق المخلوق، والأمر المخلوق الخالق. كل ذلك من عين واحدة، لا، بل هو العين الواحد وهو العيون الكثيرة. فانظر ما ذا ترى "قال يا أبت افعل ما تؤمر": والولد عين أبيه. فما رأى يذبح سوى نفسه. "وفداه بذبح عظيم" فظهر بصورة كبش من ظهر بصورة إنسان. وظهر بصورة ولد: لا، بل بحكم ولد من هو عين الوالد. "وخلق منها زوجها": فما نكح سوى نفسه.

فمنه الصاحبة والولد والأمر واحد في العدد....

فالحق خلق بهذا الوجه فاعتبروا ....وليس خلقا بذاك الوجه فادكروا

من يدر ما قلت لم تخذل بصيرتهَ.......... وليس يدريه إلا من له بصر

جمع وفرق فإن العين واحدة ....وهي الكثيرة لا تبقي ولا تذر

اس کی نفی عین اثبات ہے۔ وہ جان گیا کہ حق منزہ ہی خلق مشبہ ہے اگرچہ وہ خلق کو خالق سے بظاہر علیحدہ سمجھتا ہو۔ تو معاملہ یہ ہے کہ خالق کا معاملہ مخلوق ہے اور مخلوق کا معاملہ خالق ہے۔ یہ سب ایک ہی سرچشمہ سے ہیں۔ نہیں بلکہ یہی ایک سرچشمہ ہے جو ان سب کثیر حقائق میں موجود ہے۔ دیکھیے آپ کی کیارائے ہے؟ [اللہ تعالی نے ابراہیم و اسماعیل علیہما الصلوۃ والسلام کی قربانی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا] "وہ [اسماعیل علیہ السلام] بولے: اباجان! جس کام کا آپ کو حکم دیا گیا ہے، کر گزریے۔" تو بیٹا عین اپنا باپ ہے، تو انہوں نے کیا دیکھا کہ وہ اپنے آپ کو ذبح کر رہے ہیں۔ "پھر ہم نے اس کے فدیہ میں ایک بڑی قربانی کر دی۔" تو دنبہ کی صورت میں وہی ظاہر ہوا جو کہ انسان کی صورت میں ظاہر ہوا یعنی بیٹے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ نہیں، بلکہ وہ بیٹے کے حکم میں ظاہر ہوا کہ وہ عین وہی تھا جو کہ والد ہے۔"

اور اس (آدم) میں سے اسی کا جوڑا تخلیق کیا"۔ تو انہوں نے اپنے علاوہ کس سے نکاح کیا۔ انہی میں سے ان کی بیوی، اولاد سبھی نکلے۔ تو ان متعدد انسانوں میں اصل معاملہ ایک ہی ہے۔۔۔۔

تو جان لو کہ اس اعتبار سے حق [تعالی] مخلوق ہے اور اُس اعتبار سے مخلوق نہیں ہے۔ اس بات کو یاد کر لو۔ جو میں کہہ رہا ہوں، اسے جو جانتا ہے، وہ اپنی بصیرت کو رسوا نہ کرے گا۔ اسے وہی جانتا ہے جس کے پاس "نگاہ" موجود ہے۔ اس نے اسے اکٹھا اور علیحدہ کیا کہ وہ سرچشمہ ایک ہی ہے اور یہ کثرت باقی نہ رہے گی اور نہ ہی چھوڑ دی جائے گی۔[2]

ابن عربی سے تین صدیاں پہلے منصور حلاج (244-309/858-922) کا واقعہ بہت مشہور ہے اور تمام کتب تصوف میں بیان ہوا ہے کہ انہوں نے خدائی کا دعوی کرتے ہوئے "انا الحق" یعنی "میں حق ہوں" کہا تھا۔ اگر وہ محض ایک آدھ بار غلبہ سکر میں ایسا کر دیتے تو کچھ نہ ہوتا مگر وہ پورے ہوش و حواس کے ساتھ اس دعوے کی باقاعدہ تبلیغ کرتے رہے۔ بادشاہ کے حکم سے انہیں گرفتار کر کے علماء کے سامنے پیش کیا گیا مگر وہ اپنے دعوی پر قائم رہے۔ اس جرم کی پاداش میں انہیں موت کی سزا دی گئی۔ اس وقت سے لے کر آج تک وہ تمام صوفیاء، خواہ وہ مخالف شریعت ہوں یا پابند شریعت، کے ہیرو اور شہید سمجھے جاتے ہیں۔ پنجابی کی ایک مشہور قوالی کا شعر ہے ؎

جیہڑے نشہ عشق وچ رہندے   او انا الحق ہی کہندے

ان کے اس طرز عمل کی توجیہ کرتے ہوئے بعض صوفیاء کہتے ہیں کہ منصور نے یہ دعوی خود نہیں کیا تھا بلکہ وہ ذات باری تعالی کے مشاہدے میں اس درجے میں غرق تھے کہ اللہ تعالی نے ان کی زبان کو آلہ بنا کر خود یہ الفاظ کہے تھے۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا کہ جیسے ریڈیو میں سے آواز نکلتی ہے مگر بولنے والا اس کے اندر نہیں بیٹھا ہوتا۔ اسی طرح منصور کی زبان ایک ایسا ریڈیو تھا جس میں سے اللہ تعالی کی آواز آئی تھی۔

علامہ ابن قیم(691-751/1292-1350) نے حلولی صوفیاء سے متعلق لکھا ہے کہ یہ اصل میں ایرانی النسل تھے اور انہیں "نساک" کہا جاتا تھا۔ یہ زمانہ قدیم سے ہی حلول کے عقیدے کے قائل تھے۔ اسلام لانے کے بعد یہ گروہ مسلم صوفیاء کے ساتھ مل گیا اور ان کے اندر حلول و اتحاد کا نظریہ پیدا کر دیا۔ (دیکھیے مدارج السالکین، باب التوحید)

مخالف شریعت صوفیاء کا نقطہ نظر

مخالف شریعت صوفیاء کے ہاں وحدت الوجود اور حلول کے عقیدے کے وہی نتائج بر آمد ہوتے ہیں جو کہ اس کا منطقی تقاضا ہے۔ جب اس کائنات کی ہر ہر چیز کی کوئی حقیقت نہیں اور وہ ایک ہی وجود کا حصہ ہے تو پھر ہر ہر خدا ہی ہوئی۔ پھر ہر انسان خدا ہی ٹھہرا۔ اس کے بعد نہ تو کسی حلال کی ضرورت رہتی ہے اور نہ حرام کی اور شریعت کی کوئی وقعت نہیں رہتی۔ یہ وحدت الوجود کے عقیدے کا منطقی تقاضا ہے۔ مخالف شریعت صوفیاء نے اس عقیدے کو اسی طرح سمجھا ہے۔ بعض صوفیاء کے متعلق ان کی اپنی کتب میں درج ہے کہ وہ پاخانہ تک کھا لیا کرتے تھے اور ماں اور بہن سے ازدواجی تعلق قائم کرنے میں قباحت محسوس نہیں کرتے تھے اور خود اپنی ذات کو خدا سمجھا کرتے تھے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جب ہر چیز ہی خدا ٹھہری تو پھر خدا کا ایک حصہ دوسرے حصے سے جو بھی معاملہ کرے، وہ درست مانا جاتا ہے۔ ابن عربی کے شاگرد ابن فارض کے چند اشعار صوفیانہ حلقوں میں بہت مشہور ہیں:

لها صلاتي بالمقام أقيمها — وأشهد أنها لي صلت

كلانا مصل عابد ساجد إلى — حقيقة الجمع في كل سجدة

وما كان صلى سواي فلم نكن — صلاتي لغيري في إذاء كل ركعة

وما زلت إياها وإياي لم تزل — ولا فرق بل ذاتي لذاتي أحبت

ففي الصحو بعد المحو لم أك غيرها — وذاتي بذاتي إذا تحلت تجلت

جس مقام پر میں فائز ہوں، اس پر فائز رہتے ہوئے یہ گواہی دیتا ہوں کہ میں نے اس"[اللہ] کے لیے نماز پڑھی اور [نعوذ باللہ] اس نے میرے لیے۔ ہم دونوں ہی نماز پڑھنے والے ہیں، عبادت کرنے والے ہیں، اور ہر سجدے میں ایک متحد حقیقت کو سجدہ کرنے والے ہیں۔ اس نے میرے سوا نماز نہ پڑھی تو ہر رکعت کی ادائیگی میں میری نماز میرے علاوہ کسی کے لیے نہ تھی۔ میں وہ رہا، اور وہ میں رہا۔ کوئی فرق نہیں بلکہ میری ذات میری ہی ذات سے محبت کرتی ہے۔ فنا ہونے کے بعد ہوش میں آ کر بھی میں اس سے الگ نہیں اور میری ذات جب میری ہی ذات میں حلول کرتی ہے تو آشکار ہو جاتی ہے۔[3]

حلول کے عقیدے کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ جس شخص کے بارے میں یہ مان لیا جائے کہ اس میں خدا حلول کر گیا ہے تو پھر اس کے ساتھ وہی معاملہ کیا جانا چاہیے جو کہ اللہ تعالی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ پھر اس کی ویسی ہی تعظیم کی جائے گی، اسے سجدے کیے جائیں گے، اس کے حکم پر بلا چون و چرا عمل کیا جائے گا، اس کے اشارہ ابرو پر جان بھی قربان کی جائے گی، مال و دولت کو اس کی نذر کیا جائے گا اور زندگی کا ہر معاملہ اس کے حکم کے مطابق چلایا جائے گا۔ اہل تشیع میں اسماعیلی حضرات کا یہ نقطہ نظر ہے کہ خدا ان کے امام میں حلول کر

جاتا ہے، چنانچہ وہ اپنے ائمہ کے ساتھ یہی معاملہ کرتے تھے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ بہت سے صوفیاء کا ہے جن کا بظاہر دعوی ہے کہ وہ حلول کے عقیدے کے قائل نہیں ہیں مگر وہ یہ سب معاملات اپنے پیر و مرشد کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان واقعات کے لیے کسی حوالے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ان کا مشاہدہ پنجاب یا سندھ کے کسی بھی آستانے کے بزرگ کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔

پابند شریعت صوفیاء کا نقطہ نظر

وحدت الوجود کے ضمن میں پابند شریعت صوفیاء کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس نظریے کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ یہ حضرات وحدت الوجود اور توحید کے متضاد نظریات کو ہم آہنگ (Reconcile) کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس معاملے میں ان کے ہاں دو نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں۔ ایک نقطہ نظر وحدت الوجود کی ایسی تشریح کا ہے جو خلاف شریعت نہ ہو اور دوسرا نقطہ نظر "وحدت الشہود" کے ماننے والوں کا ہے۔ پہلے نقطہ نظر کے تحت وجود باری تعالی کو حقیقی اور مخلوقات کے وجود کو مجازی مان لیا جاتا ہے۔

اہل تصوف کا دوسرا گروہ "وحدت الشہود" کا قائل ہے۔ اسے وہ "وحدت الوجود" کا حقیقی مطلب قرار دیتے ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ وحدت الوجود کا مطلب یہ ہے کہ ایک سالک کو اللہ تعالی کی عظمت کے مشاہدے میں ایسا محو ہو جاتا ہے کہ پھر اسے کوئی مخلوق نظر ہی نہیں آتی۔ ایسے موقع پر اس کی زبان سے "لا موجود الا اللہ" قسم کے کلمات نکل جاتے ہیں۔ یہ نقطہ نظر شیخ احمد سرہندی (971-1034/1564-1624) نے پیش کیا اور اسے "وحدت الشہود" کا نام دیا۔ اس کے لیے وہ یہ مثال دیتے ہیں کہ جب سورج نکل آئے تو ستارے نظر نہیں آتے۔ بالکل اسی طرح سالک جب مشاہدہ الہی میں غرق ہو جاتا ہے تو پھر اسے مخلوق نظر نہیں آتی۔

صوفیاء کے ایک گروہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ حلول و اتحاد سے متعلق یہ عبارتیں صوفیاء کی کتب میں داخل کی گئی ہیں۔ شامی صوفی شیخ عبدالقادر عیسی (1919-1991) لکھتے ہیں:

> اس میں کوئی شک نہیں کہ [حلول و اتحاد] کا یہ نظریہ صریح کفر ہے اور امت کے عقائد کے خلاف ہے۔ صوفیاء جو اسلام، ایمان اور احسان کے حصول کے لیے سرگرداں تھے اس گمراہی و کفر میں پڑنے والے نہ تھے۔ کسی انصاف پسند صاحب ایمان کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ بغیر تحقیق و ثبوت کے اور ان کی بات کو سمجھے ان پر اس کفر کا الزام لگائے۔[4]

ناقدین تصوف کا نقطہ نظر

ناقدین تصوف وحدت الوجود کے عقیدے پر کڑی تنقید کرتے ہیں اور اسے توحید کا مخالف قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اس نظریے کو کسی بھی طریقے سے توحید سے ہم آہنگ نہیں کیا جا سکتا ہے۔

وحدت الوجود اور عقیدہ حلول سے متعلق دلائل

مخالف شریعت صوفیاء کے دلائل

مخالف شریعت صوفیاء چونکہ شریعت کو محض چھلکا قرار دے کر اپنے صوفیانہ اشغال کو مغز کا درجہ دیتے ہیں، اس وجہ سے وہ قرآن و سنت سے دلائل پیش نہیں کرتے۔ ان کی دلیل زیادہ سے زیادہ کچھ آیات کے باطنی مطالب ہوتے ہیں جو کہ انہوں نے اپنے کشف اور الہام کی بنیاد پر اخذ کیے ہوتے ہیں یا پھر وہ اکابر صوفیاء کے کچھ اقوال کا سہارا لیتے ہیں۔ چونکہ ان صوفیاء کا کشف و الہام، باطنی مطالب اور سابق صوفیاء کے اقوال ناقدین تصوف کے لیے حجت نہیں ہیں، اس وجہ سے انہیں بیان کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

بعض صوفیاء کے دلائل

بعض صوفیاء جو شریعت کی پابندی کی اہمیت دیتے ہیں، کچھ آیات اور احادیث سے استدلال کرتے ہیں جو کہ ہم یہاں پیش کر رہے ہیں۔

۱۔ کلمہ طیبہ

بعض صوفیاء کلمہ طیبہ ہی کو وحدت الوجود کی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں:

لا إِلَهَ إِلاَّ الله.

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

یہاں صوفیاء لفظ "الہ" سے مراد "موجود" لیتے ہیں۔ اس طرح ترجمہ یہ بنتا ہے کہ "اس کے سوا کوئی موجود نہیں۔" اسے صوفیاء اخص الخواص کی توحید قرار دیتے ہیں۔

اس کے جواب میں ناقدین تصوف یہ کہتے ہیں کہ عربی زبان میں کسی چیز کا وہی معنی مراد لیا جا سکتا ہے جو کہ اہل عرب کے ہاں نزول قرآن کے وقت رائج ہو۔ دور جاہلیت کے پورے لٹریچر کا مطالعہ کرتے چلے جائیے تو ان کے ہاں "الہ" کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہوتا تھا جسے ہم اردو میں معبود، خدا، لائق پرستش وغیرہ سے ادا کرتے ہیں۔ کبھی بھی عربی زبان میں اس لفظ کو "موجود" کے معنی میں استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ اگر اس طرح سے قرآن و حدیث کا مطالعہ کیا جائے تو پھر کسی بھی لفظ کا کوئی بھی مطلب بیان کیا جا سکتا ہے۔ فرقہ باطنیہ نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔

۲۔ وجہ اللہ

صوفیاء اپنے نقطہ نظر کے حق میں یہ آیت بھی پیش کرتے ہیں:

فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ.

تم جہاں بھی رخ کرو، تو اللہ کے وجہ کو اسی جانب پاؤ گے۔ (البقرۃ 2:115)

وہ کہتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں بھی رخ کیا جائے، وہی اللہ ہے۔ گویا کہ کائنات کی ایک ایک چیز میں اللہ موجود ہے۔ ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ آیت کریمہ کے سیاق و سباق کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بات ہی بالکل مختلف ہے۔ یہاں اہل کتاب کے باہمی اختلافات زیر بحث ہیں اور ان پر تنقید کی جا رہی ہے کہ وہ معمولی معمولی باتوں پر اختلافات کو کس طرح ہوا دیتے ہیں۔ کبھی ایک دوسرے کی عبادت گاہوں کو تباہ کرتے ہیں، کبھی بیت المقدس کے مشرقی اور مغربی حصے کو قبلہ ٹھہرا کر اس پر مباحثہ کرتے ہیں اور کبھی حضرت عیسی علیہ الصلوۃ والسلام کو اللہ کا بیٹا مان لیتے ہیں۔ آیت کا پورا سیاق یہ ہے:

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسَاجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسَعَى فِي خَرَابِهَا أُوْلَئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلاَّ خَائِفِينَ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ (114) وَلِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ (115) وَقَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَداً سُبْحَانَهُ بَلْ لَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالأَرْضِ كُلٌّ لَهُ قَانِتُونَ (116).

اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ کی مساجد میں اس کا نام لینے سے روکتا ہے اور انہیں برباد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کے لیے تو صرف یہی مناسب تھا کہ وہ ان میں ڈرتے ہوئے داخل ہوں۔ ان کے لیے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں بڑا عذاب ہے۔ مشرق و مغرب اللہ ہی کے لیے ہے، تم جس جانب بھی رخ کرو، اللہ ہی کو پاؤ گے، یقیناً اللہ وسعت اور علم والا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے بیٹا بنالیا ہے۔ وہ اس سے پاک ہے، بلکہ جو کچھ آسمان و زمین میں ہے، اسی کا ہے اور یہ سب اس کے فرمانبردار ہیں۔ (البقرۃ)

۳۔ اول و آخر

صوفیاء اپنے نقطہ نظر کے حق میں یہ آیت بھی پیش کرتے ہیں:

هُوَ الأَوَّلُ وَالآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ.

وہی اول، آخر، ظاہر اور باطن ہے۔ (الحدید 57:3)

صوفیاء کا کہنا یہ ہے کہ اللہ تعالی اول، آخر، ظاہر، باطن سبھی کچھ ہے۔ یہ مخلوقات اللہ تعالی کے وجود ہی کا محض ایک اظہار ہے۔ اس کے جواب میں ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ آیت کریمہ کے پورے سیاق و سباق کا مطالعہ کیا جائے تو یہاں تو اس سے بالکل مختلف بات بیان ہو رہی ہے اور وہ یہ ہے:

سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (1) لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالأَرْضِ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (2) هُوَ الأَوَّلُ وَالآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (3) هُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَى عَلَى الْعَرْشِ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنْ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (4) لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالأَرْضِ

وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الأُمُورُ (5)

ہر وہ چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے، اللہ کی پاکیزگی بیان کر رہی ہے۔ وہی زبردست اور حکمت والا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی حکومت اسی کی ہے، وہی زندہ کرتا اور موت دیتا ہے اور ہر چیز پر قادر ہے۔ وہی اول، آخر، ظاہر اور باطن ہے اور ہر چیز کو جانتا ہے۔ اسی نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق چھ دن میں کی، پھر عرش پر استوا فرمایا۔ جو کچھ زمین میں داخل اور اس سے خارج ہوتا ہے، اور جو کچھ آسمان سے اترتا اور اس کی جانب چڑھتا ہے، وہ اسے جانتا ہے۔ تم جہاں جاؤ، وہ تمہارے ساتھ ہے اور اللہ اس سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔ آسمان و زمین کی بادشاہی اسی کی ہے اور اللہ کی جانب ہی تمام امور لوٹائے جاتے ہیں۔ (الحدید)

ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ ان آیات کا خالی الذہن ہو کر مطالعہ کیا جائے تو یہ پکار پکار کر اللہ تعالی کی تخلیق، علم اور قدرت کو بیان کر رہی ہیں۔ اگر یہ کائنات اللہ تعالی کے وجود ہی کا ایک حصہ ہے تو پھر اسے تخلیق کرنے کا کیا مطلب؟

۴۔ کائنات کا نور

صوفیاء اپنے نقطہ نظر کے حق میں یہ آیت بھی پیش کرتے ہیں:

اللَّهُ نُورُ السَّمَوَاتِ وَالأَرْضِ.

اللہ آسمان و زمین کا نور ہے۔ (النور 24:35)

صوفیاء کا کہنا یہ ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ کائنات کی ہر چیز اللہ کا نور ہے۔

اس کے جواب میں ناقدین تصوف یہ کہتے ہیں کہ پوری آیت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک تمثیل بیان ہوئی ہے جس میں اللہ تعالی کی ہدایت کا نور زیر بحث ہے۔ اسی کے نور ہدایت سے آسمان و زمین درست راستے پر چلتے ہیں۔ یہاں یہ بیان نہیں کیا گیا ہے کہ پوری کائنات معاذ اللہ، اللہ تعالی کے نور کے میٹیریل سے بنی ہوئی ہے۔

اللَّهُ نُورُ السَّمَوَاتِ وَالأَرْضِ مَثَلُ نُورِهِ كَمِشْكَاةٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ الْمِصْبَاحُ فِي زُجَاجَةٍ الزُّجَاجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُوقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُبَارَكَةٍ زَيْتُونِةٍ لا شَرْقِيَّةٍ وَلا غَرْبِيَّةٍ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُورٌ عَلَى نُورٍ يَهْدِي اللَّهُ لِنُورِهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَضْرِبُ اللَّهُ الأَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ.

اللہ آسمان و زمین کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال ایک طاق میں رکھے ہوئے چراغ کی سی ہے۔ وہ چراغ ایک فانوس میں ہو اور فانوس ایسا ہو گویا کہ وہ موتی کی مانند چمکتا ہوا ستارہ ہو۔ وہ چراغ زیتون کے ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو، جو نہ مشرقی ہو نہ مغربی اور جس کا تیل آپ ہی آپ بھڑکا جاتا ہو اگرچہ آگ اس کو نہ لگے۔ یہ نور پر نور ہے۔ اللہ اپنے نور سے جسے چاہتا ہے، ہدایت دیتا ہے۔ اللہ لوگوں کے لیے مثالوں کو بیان کرتا ہے اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ (النور 24:35)

۵۔ روح

حلول کے قائل صوفیاء یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالی نے اپنی روح انسان میں پھونکی، گویا انسان اللہ کی روح پر مبنی ایک وجود ہوا جو کہ وجود باری تعالی کا ایک حصہ ہے:

فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ.

پھر جب میں نے اسے ٹھیک بنالوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو اس کے لیے سجدہ میں گر جانا۔ (ص 38:72)

ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ روح پھونکنے سے مراد انسان میں زندگی پیدا کرنا ہے، معاذ اللہ اس کے اندر حلول کر جانا نہیں ہے۔ آیت کریمہ سے ہی واضح ہے کہ یہاں اللہ تعالی انسان کو تخلیق کرنے کا ذکر فرما رہا ہے، نہ کہ اس میں حلول ہو جانے کا۔

٦۔ اللہ کی بندے سے محبت

صوفیاء اپنے نقطہ نظر کے حق میں یہ حدیث بھی پیش کرتے ہیں:

حدثني محمد بن عثمان بن كرامة: حدثنا خالد بن مخلد: حدثنا سليمان بن بلال: حدثني شريك بن عبد الله بن أبي نمر، عن عطاء، عن أبي هريرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: (إن الله قال: من عادى لي ولياً فقد آذنته بالحرب، وما تقرب إلي عبدي بشيء أحب إلي مما افترضت عليه، وما يزال عبدي يتقرب إلي بالنوافل حتى أحبه، فإذا أحببته: كنت سمعه الذي يسمع به، وبصره الذي يبصر به، ويده التي يبطش بها، ورجله التي يمشي بها، وإن سألني لأعطينَّه، ولئن استعاذني لأعيذنَّه، وما ترددت عن شيء أنا فاعله ترددي عن نفس المؤمن، يكره الموت وأنا أكره مساءته.

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یقیناً اللہ تعالی فرماتا ہے: "جس نے میرے ولی سے دشمنی کی، میں اس سے اعلان جنگ کرتا ہوں۔ میرا بندہ جن جن عبادتوں سے میرے قریب ہوتا ہے، ان میں کوئی عبادت میرے لیے اس سے زیادہ پسندیدہ نہیں ہے جو میں نے اس پر فرض کی ہے۔ میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرے قریب ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ پھر جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو اس کی قوت سماعت بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی قوت بصارت بن جاتا ہوں، جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ جب وہ مجھ سے مانگتا ہے تو میں اس ضرور عطا کرتا ہوں۔ اگر وہ مجھ سے پناہ مانگتا ہے تو میں اسے پناہ دیتا ہوں۔ میں جس کام کر کرنا چاہوں، اس میں مجھے اتنا تردد نہیں ہوتا جتنا مومن کی جان کے بارے میں ہوتا ہے۔ وہ تو موت کو ناپسند کرتا ہے جبکہ مجھے بھی اسے تکلیف دینا برا لگتا ہے۔ (بخاری، کتاب الرقاق، حدیث 6137)

ناقدین تصوف اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ اس حدیث سے کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا ہے کہ معاذ اللہ اللہ بندے کے اندر حلول کر جاتا ہے کیونکہ اسی حدیث میں اس بات کی ترغیب ہے کہ اللہ سے مانگا جائے اور اسی کی پناہ طلب کی جائے۔ ہاتھ، پاؤں بننے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی کی محبت کے باعث اس شخص کے کان، آنکھیں، ہاتھ اور پاؤں اللہ تعالی کی نافرمانی نہیں کرتے۔ اس میں یہ نہیں کہا گیا کہ

معاذ اللہ، اللہ تعالی کی ذات اس شخص کے وجود میں حلول کر جاتی ہے۔

ناقدین تصوف کے دلائل

ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ وحدت الوجود ایسا نظریہ ہے جو توحید سے بالکل متضاد ہے۔ قرآن مجید میں توحید کا بیان اتنا واضح ہے کہ اسے دین اسلام کے بنیادی عقیدے کی حیثیت حاصل ہے۔ اگر وحدت الوجود کو مان لیا جائے تو پھر اسلام کی بنیاد ہی ڈھے جاتی ہے۔ قرآن مجید اس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ کائنات کی ہر چیز اللہ تعالی کی مخلوق ہے اور وہ اس کا خالق ہے۔

اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ (62) لَهُ مَقَالِيدُ السَّمَوَاتِ وَالأَرْضِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ أُوْلَئِكَ هُمْ الْخَاسِرُونَ (63) قُلْ أَفَغَيْرَ اللَّهِ تَأْمُرُونَنِي أَعْبُدُ أَيُّهَا الْجَاهِلُونَ (64)

اللہ ہر چیز کا خالق ہے اور وہی ہر چیز پر وکیل ہے۔ آسمانوں اور زمین کی کنجیاں [کنٹرول] اسی کے پاس ہے۔ جو لوگ اللہ کی آیات سے کفر کرتے ہیں، وہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔ اے جاہلو! کیا تم مجھے تلقین کرتے ہو کہ میں غیر اللہ کی عبادت کروں؟ (الزمر)

ذَلِكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ لا إِلَهَ إِلاَّ هُوَ فَأَنَّا تُؤْفَكُونَ.

یہ ہے اللہ، تمہارا رب، ہر چیز کا خالق۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ تو تم کہاں الٹے پھرے جاتے ہو؟ (المومن 40:62)

ایسی ہی بے شمار آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالی ایک الگ وجود ہے اور اس کی مخلوق اس کی ذات پاک سے الگ وجود ہیں۔ ہر وہ شخص جو یہ دعوی کرتا ہے کہ خدا اس میں حلول کر گیا ہے، محض ایک بکواس اور خرافات سے زیادہ کچھ نہیں ہے اور بات کے کفر ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔

ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کی پوری سیرت اور تاریخ کا مطالعہ کرتے چلے جایئے تو کہیں ایسا نظر نہیں آتا کہ انہوں نے روحانی مشقیں وغیرہ کر کے اللہ تعالی کے انوار و تجلیات کا مشاہدہ کرنے کی کوشش کی ہو اور اس کے ذریعے عالم ناسوت، لاہوت، جبروت، ہاہوت اور نجانے کون کون سے عالم ان پر منکشف ہوئے ہوں۔ نہ ان پر کبھی سکر کی کیفیت طاری ہوئی جس میں انہوں نے اناپ شناپ دعوے کیے ہوں اور نہ انہوں نے کبھی یہ دعوی کیا کہ ان کی زبان سے اللہ تعالی بول رہا ہے۔ اگر ان روحانی مشقوں میں کوئی خیر ہوتی اور اس کے ذریعے اللہ تعالی کے انوار و تجلیات کا مشاہدہ ممکن ہوتا، تو ہمیں نظر آتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ مشقیں صحابہ کو سکھا رہے ہیں اور وہ ان کے مطابق یہ مشقیں کر رہے ہوتے۔ ایسی کسی بات کا ذکر کسی حدیث میں نہیں ملتا ہے۔

اس کے برعکس اللہ تعالی کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم وہ یہ واضح طور پر بیان فرماتے تھے کہ اللہ تعالی نے یہ کلام میری جانب وحی کیا ہے جو میں اس کی جانب سے پیش کر رہا ہوں۔ آپ کے بعد آپ کے صحابہ میں سے کسی نے بھی ایسا دعوی نہیں کیا۔ کیا منصور حلاج اور دیگر صوفیاء کا درجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ سے بھی بلند تھا جو ان کی زبان کو آلہ خداوندی بنایا گیا؟ اللہ تعالی نے

اپنے جلیل القدر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے توعبدیت کا اقرار پہلے کروایا اور پھر رسالت کا: اشھد ان محمد عبدہ ورسولہ۔

اسائن منٹس

- وحدت الوجود کا کیا مطلب ہے؟ وحدت الوجود اور وحدت الشہود میں کیا فرق ہے؟
- وحدت الوجود کے نظریے کے حق میں صوفیاء قرآن مجید کی کن آیات کو پیش کرتے ہیں اور ناقدین تصوف ان کا کیا جواب دیتے ہیں؟
- ناقدین تصوف کے نزدیک وحدت الوجود کے نظریے سے کیا مسائل پیدا ہوتے ہیں؟

تعمیر شخصیت

ایک بخیل اس لئے غربت کی زندگی بسر کرتا ہے تاکہ مرتے وقت وہ امیر ہو۔

---

[1] عبداللہ انصاری الہروی (396-481/1006-1089)۔منازل السائرین. قسم النهایات. باب التوحید. ص135-136۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ (1998)۔ www.al-mostafa.com (ac. 6 May 2011)

[2] ابن عربی (558-638/1164-1240)۔ (تحقیق: ابوالعلاء عفیفی) فصوص الحکم۔ فص ادریسیہ۔ ص79۔ بیروت: دار الکتاب العربی۔ www.islamic-sufism.com (ac. 13 Oct 2011)

[3] طارق عبدالحلیم اور محمد العبدہ (ترجمہ: مدثر احمد لودھی)۔ صوفیت کی ابتدا اور ارتقاء۔ ص54۔ www.kitabosunnat.com (ac. 27 Apr 2011)

[4] عبدالقادر عیسی۔ حقائق عن التصوف۔ ص497۔ حلب: دار العرفان۔ www.daraleman.org (ac. 11 Mar 2006)

باب 5: وحدت الوجود کی توجیہات

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ بعض پابند شریعت صوفیاء نے وحدت الوجود کی توجیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں ان کے دو نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض صوفیاء کا کہنا یہ ہے کہ حقیقی وجود صرف اللہ تعالی کا ہے اور بقیہ ہر چیز کا وجود مجازی ہے۔ اس کے لیے وہ انسانی تخیل اور خواب کی مثال دیتے ہیں۔ دوسرا نقطہ نظر وحدت الشہود کا ہے۔ اب ہم دیکھیں گے کہ ان دونوں نظریات پر ناقدین تصوف کیا تنقید کرتے ہیں؟

وجود کی حقیقی و مجازی تقسیم

صوفیاء کا نقطہ نظر

بعض صوفیاء کا کہنا یہ ہے کہ اللہ تعالی کا وجود حقیقی ہے اور ساری مخلوق کا وجود مجازی ہے۔ اس نقطہ نظر کی نمائندگی کرتے ہوئے سنی بریلوی عالم، علامہ احمد سعید کاظمی (1913-1986) لکھتے ہیں:

> اس پر سوال ہوتا ہے کہ یہ زمین، آسمان، چاند، سورج، چرند، پرند، انسان، حیوان، نور، ظلمت، ہدایت و گمراہی، خیر و شر ان سب کا وجود ہے اور اگر ہم ان کا وجود نہ مانیں تو اللہ کی صفت تخلیق کا انکار لازم آئے گا اور اس طرح ہم شرک سے بچ کر کفر کا شکار ہو جائیں گے۔
>
> اس کے جواب میں عرض ہے کہ وجود حقیقی تو اللہ ہی کا ہے، باقی تمام کائنات کا وجود حقیقی نہیں مجازی ہے۔ حقیقت وجود، وجود واحد کے سوا موجود نہیں۔ آئینہ خانے میں جہاں ہر طرف، ہر سمت بے شمار آئینے جڑے ہوں، ایک شمع روشن ہو تو وہ ہر آئینے میں جگمگاتی نظر آتی ہے، ہر عکس اس ایک شمع کا محتاج ہے، وہ ایک شمع بجھ جائے تو ہر سو اندھیرا چھا جائے۔ ساری جگمگاہٹ اور روشنی اسی ایک شمع کی مرہون منت ہے۔ لیکن اس مثال پر اعتراض ہو کہ آئینوں کا تو اپنا وجود ہے، اس لیے اس بات کو دوسرے انداز میں سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ آپ ایک کمرے میں تشریف رکھتے ہیں، آپ کے سامنے چارپائی ہے، پیچھے دروازہ ہے، دائیں طرف کھڑکی ہے اور بائیں طرف الماری ہے، آپ کے اوپر چھت ہے اور نیچے فرش ہے۔ اگر آپ رخ پھیر لیں تو آگے، پیچھے، دائیں، بائیں کا مفہوم بدل جائے گا اور اسی طرح اگر آپ چھت پر چلے جائیں تو اوپر نیچے کا تصور بھی تبدیل ہو جائے گا۔ یہ آگے، پیچھے، دائیں، بائیں، اوپر، نیچے، ان کا اپنا کوئی وجود نہیں ہے۔ آپ ہیں تو یہ سمتیں اور جہتیں بھی ہیں، اگر آپ نہیں تو یہ بھی نہیں۔ آپ جب کمرے میں داخل ہوئے تو ان سمتوں کو ساتھ لے کر نہیں آئے کہ ان کا اپنا علیحدہ کوئی وجود نہیں ہے، آپ کے وجود کے باعث یہ از خود متصور ہو گئی ہیں۔
>
> اگر ریاضی کے حوالے سے سوچیں تو تمام اعداد "ایک" کے مرہون منت ہیں۔ بلکہ کمپیوٹر میں تو ایک اور صفر، صرف یہی عدد استعمال ہوتے ہیں۔ "ایک" وجود ہے، "صفر" عدم ہے۔ باقی تمام اعداد و شمار اسی ایک وجود کے مرہون منت ہیں۔ وجود حقیقی وہی ایک وجود ہے، باقی سب کچھ اس کی صفات کا جلوہ ہے، اس کی قدرت کی کرشمہ سازی ہے، کہیں اس کی صفت جلال جلوہ نما ہے، کہیں اس کے جمال کی جلوہ آرائی ہے۔

جدت پسند اذہان کی تسکین کے لیے اسی بات کو ایک دوسرے انداز میں عرض کرتا ہوں۔ کسی مسئلہ کی تحقیق کے لیے کچھ چیزیں فرض کر لی جاتی ہیں۔ فرض کرو ایک شخص ہے، اس کے فلاں فلاں اہل خانہ ہیں، فلاں حالات سے وہ گزرتا ہے اور فلاں صورتحال پیش آتی ہے، اس صورت میں اس شخص کے لیے شریعت کا کیا حکم ہے؟ علماء جانتے ہیں کہ مسائل کے استنباط کے لیے اس نوعیت سے چیزیں فرض کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ یا جیسے حساب و کتاب کے معاملات میں سوال حل کرنے کے لیے چند چیزیں فرض کر لی جاتی ہیں۔ الجبرا میں کہتے ہیں کہ اس چیز کی قیمت خرید فرض کر لی جو برابر ہے "لا [X]" کے۔ اب سب جانتے ہیں کہ "لا" کا مفہوم ہے "نہیں"۔ لیکن جب قیمت "لا" فرض کر لی جاتی ہے تو سوال حل ہو جاتا ہے اور جواب تلاش کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔

یہ تمام چیزیں جو ہم فرض کرتے ہیں، ان کا حقیقتاً کوئی وجود نہیں ہوتا۔ لیکن عالم فرض میں ایسی بے شمار اشیاء آن واحد میں متحقق ہو جاتی ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ جب کسی شے کی تخلیق کا ارادہ فرماتا ہے تو فرماتا ہے، "کن" تو وہ چیز ہو جاتی ہے۔ إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئاً أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ۔ "اس کا حکم یہی ہے۔ جب وہ کسی چیز کا ارادہ فرمائے تو اس سے کہے، ہو جا تو وہ (فوراً) ہو جاتی ہے۔"

ظاہر ہے کہ حقیقی اشیاء کے بنانے میں وقت صرف ہوتا ہے، فرضی اشیاء کی تخلیق میں نہیں۔ فرق اتنا ہے کہ جتنی ہماری حیثیت اور وقعت ہے، اتنی حیثیت ہماری فرض کی ہوئی چیزوں کی ہے اور خدا کی تخلیق کردہ اشیاء اس حقیقی وجود کے مقابلے میں فرضی ہونے کے باوجود "موجود" معلوم ہوتی ہیں۔ دیکھیے شاعر بتاتے ہیں اور صوفیاء کرام نے کہا ہے کہ یہ دنیا دراصل عالم خواب ہے۔ جب ہماری موت آئے گی تو یوں کہیے کہ ہماری آنکھ کھلے گی تو اس کائنات کو بھی اسی انداز میں خواب تصور کیجیے۔ لیکن یہ خواب دکھانے والا وہ قادر مطلق ہے۔ اس لیے اس خواب کو خواب سمجھنا بھی خواب و خیال کی بات معلوم ہوتی ہے۔

بہر کیف اس تمام گفتگو کا مقصد یہ ہے کہ یہ تمام کائنات مجاز ہے، فرضی چیز ہے اور حقیقی وجود صرف اس کا ہے۔

اب غور کیجیے کہ وحدت الوجود پر یقین رکھنے والوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے شرک کیا، کہ یہ چونکہ صرف رب کے وجود کو مانتے ہیں، اس لیے انہوں نے گویا ہر موجود شے کو خدا تسلیم کر لیا، ان کے کہنے کے مطابق جب خدا کے سوا کچھ نہیں تو پھر جو کچھ ہے، وہ خدا ہی ہے، پھر ہر شے خدا ہے۔ دراصل یہ مغالطہ ہے، شرک تو اس وقت ہو گا جب خدا کے سوا کسی شے کو مانو گے، تسلیم کرو گے، پھر اسے خدا کی ذات و صفات میں شریک ٹھہراؤ گے، جب تمہارا عقیدہ یہ ہو گا کہ خدا کے سوا کچھ نہیں، یہ کائنات رنگ و بو، یہ عالم آب و گل، یہ زمین و آسمان، یہ ستارے، یہ کہکشاں، یہ نباتات و جمادات، یہ انسانوں کی فوج ظفر موجد، یہ حشرات الارض، یہ سیم و زر کے انبار، یہ اجناس و اثمار، یہ شجر و حجر، یہ سب مجاز ہیں، یہ سب فرضی چیزیں ہیں، یہ ذہن و نظر کا فریب ہے، یہ ساری کائنات اعتباری ہے، حقیقی نہیں، خدا کے سوا کچھ نہیں ہے، جب تم اس کے سوا کسی کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے تو اس کی ذات میں کسی شریک کیسے کر سکتے ہو۔ جس کو تم شریک کرنا چاہو گے، پہلے اس کے وجود کو تو مانو گے، جو چیز ہے ہی نہیں، وہ خدا کی ذات و صفات میں شریک کیسے ہو سکتی ہے؟ [1]

بعض صوفیاء یہ مثال بھی دیتے ہیں جیسے کسی کمرے میں بہت سے آئینے لگے ہوں۔ اس میں اگر ایک چراغ روشن کر لیا جائے تو اس کا عکس ہر آئینے میں نظر آئے گا اور اگر یہ چراغ بجھ جائے تو سبھی عکس غائب ہو جائیں گے۔ یہی معاملہ اللہ تعالیٰ کا ہے کہ تمام اشیاء کا وجود، اللہ تعالیٰ ہی پر منحصر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود کا فنا ہونا ممکن نہیں ہے۔ بقیہ تمام اشیاء مجازی ہیں اور ان کی حیثیت وہی ہے جو آئینے میں عکس کی سی ہوتی ہے۔

ناقدین تصوف کا جواب

ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ اول تو حقیقت و مجاز کی یہ بات قرآن و حدیث میں کہیں بیان نہیں ہوئی۔ اگر اللہ تعالی ہی وجود حقیقی ہے اور باقی سب کچھ محض نظر کا فریب ہے تو پھر اللہ تعالی کو خود ہی یہ بات بتا دینی چاہیے تھی۔ اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ قرآن مجید اس کائنات کی ہر ہر چیز کا وجود تسلیم کرتا ہے اور اس کے بارے میں بتاتا ہے کہ اللہ تعالی ان تمام اشیاء کا خالق ہے۔

اگر اللہ تعالی وجود حقیقی ہے اور بقیہ ساری کائنات وجود مجازی اور محض ایک خواب ہی ہے تو پھر جزا و سزا کے کیا معنی ہیں؟ کیا جزا و سزا ایک فریب نظر ہی ہے؟ کیا جنت و دوزخ کا بھی حقیقی وجود نہیں ہے اور یہ سب محض ایک وہم اور مجاز ہی ہے؟ اللہ تعالی نے جو پیغمبر اس دنیا میں بھیجے، کیا وہ سب کے سب مجاز ہی تھے؟ نیکی اور بدی کی قوتیں جو ہم پر اثر انداز ہوتی ہیں، کیا وہ سب بھی مجاز ہی ہے؟ اگر سب کچھ اللہ تعالی کے ہاں مجازی طور پر ہی میں ہو رہا ہے تو پھر ہمیں کس بات کی جزا یا سزا ملے گی؟ اس توجیہ کو مان لینے کے بعد انسانی ارادہ کی کلیتاً نفی ہو جاتی ہے اور اس سے قیامت اور جزا و سزا کا پورا عقیدہ بھی غلط ہو کر رہ جاتا ہے۔ قرآن مجید اس سے بالکل مختلف مقام پر کھڑا ہوا ہے اور اس کی پوری دعوت اس بات پر مبنی ہے کہ ہر چیز کا ایک الگ وجود ہے اور یہ تخلیق اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کو اللہ تعالی کے سامنے جوابدہ ہونا ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الإِنسَانَ مِنْ سُلالَةٍ مِنْ طِينٍ (12) ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَكِينٍ (13) ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَاماً فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْماً ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقاً آخَرَ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ (14) ثُمَّ إِنَّكُمْ بَعْدَ ذَلِكَ لَمَيِّتُونَ (15) ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُبْعَثُونَ (16) وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَائِقَ وَمَا كُنَّا عَنْ الْخَلْقِ غَافِلِينَ (17) وَأَنزَلْنَا مِنْ السَّمَاءِ مَاءً بِقَدَرٍ فَأَسْكَنَّاهُ فِي الأَرْضِ وَإِنَّا عَلَى ذَهَابٍ بِهِ لَقَادِرُونَ (18) فَأَنشَأْنَا لَكُمْ بِهِ جَنَّاتٍ مِنْ نَخِيلٍ وَأَعْنَابٍ لَكُمْ فِيهَا فَوَاكِهُ كَثِيرَةٌ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ (19) وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُورِ سَيْنَاءَ تَنْبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِلآكِلِينَ (20) وَإِنَّ لَكُمْ فِي الأَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسقِيكُمْ مِمَّا فِي بُطُونِهَا وَلَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ كَثِيرَةٌ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ (21) وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُونَ (22)

ہم نے انسان کو مٹی کی پیسٹ سے بنایا، پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا، پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی، پھر لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا، پھر بوٹی کو ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر اسے ایک دُوسری ہی مخلوق بنا کھڑا کیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، سب کاریگروں سے اچھا کاریگر۔ پھر اس کے بعد تم کو ضرور مرنا ہے، پھر قیامت کے روز یقیناً تم اُٹھائے جاؤ گے۔

اور تمہارے اُوپر ہم نے سات راستے بنائے، تخلیق کے کام سے ہم کچھ نابلد نہ تھے۔ اور آسمان سے ہم نے ٹھیک حساب کے مطابق ایک خاص مقدار میں پانی اُتارا اور اس کو زمین میں ٹھہرا دیا، ہم اُسے جس طرح چاہیں غائب کر سکتے ہیں۔ پھر اس پانی کے ذریعہ سے ہم نے تمہارے لیے کھجور اور انگور کے باغ پیدا کر دیے، تمہارے لیے ان باغوں میں بہت سے لذیذ پھل ہیں اور ان سے تم روزی حاصل کرتے ہو۔ اور وہ درخت بھی ہم نے پیدا کیا جو طُورِ سیناء سے نکلتا ہے، تیل بھی لیے ہوئے اُگتا ہے اور کھانے والوں کے لیے سالن بھی۔

اور حقیقت یہ ہے کہ تمہارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق ہے۔ ان کے پیٹوں میں جو کچھ ہے اسی میں سے ایک چیز ہم تمہیں پلاتے ہیں، اور تمہارے لیے ان میں بہت سے دُوسرے فائدے بھی ہیں۔ اُن کو تم کھاتے ہو اور اُن پر اور کشتیوں پر سوار بھی کیے جاتے ہو۔ (المومنون)

ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ یہ مضمون قرآن مجید میں بکثرت بیان ہوا ہے۔ ان آیات اور اسی مضمون کی دیگر آیات کو پڑھتے چلے جایئے۔ کیا یہ تصور کہیں ملتا ہے کہ یہ سب جو ہمیں نظر آ رہا ہے، محض نظر کا فتور اور دماغ کا فریب ہے؟ اس کے برعکس اللہ تعالی ان سب چیزوں کو اس بات کی دلیل کے طور پر پیش فرما رہا ہے کہ ثُمَّ إِنَّكُمْ بَعْدَ ذَلِكَ لَمَيِّتُونَ. ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُبْعَثُونَ. یعنی "پھر اس کے بعد تم کو ضرور مرنا ہے، پھر قیامت کے روز یقیناً تم اُٹھائے جاؤ گے۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالی کی مخلوقات کا وجود ہے اور یہ سب فریب نظر نہیں ہے۔

وحدت الشہود

صوفیاء کا نقطہ نظر

وحدت الشہود کا نظریہ یہ ہے کہ اپنے روحانی سفر کے دوران ایک سالک اس مقام پر جا پہنچتا ہے کہ اسے سوائے اللہ کے اور کچھ نظر نہیں آتا اور وہ دنیا کی ہر چیز حتی کہ اپنے آپ سے بھی غافل ہو جاتا ہے۔ اس نقطہ نظر کو شیخ احمد سرہندی (971-1034/1564-1624) نے پوری قوت سے پیش کیا اور ان کے بعد صوفیاء کا ایک بڑا طبقہ اسی نظریے کا قائل ہو گیا۔ اس نقطہ نظر کی ترجمانی کرتے ہوئے سنی دیوبندی صوفی، سید شبیر احمد کاکاخیل لکھتے ہیں:

یہ یقین کر لینا کہ خدا کے ارادے کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا توحید کہلاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ خدا کے بغیر کوئی دوسرا موجود نہیں جیسا کہ جو لوگ وحدت الوجود کا دعویٰ کرنے والے کہتے ہیں کیونکہ خدا کو اس کی تمام صفات کے ساتھ ماننا پڑتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ایک صفت خلق بھی ہے اور خالق کوئی تب ہی ہو سکتا ہے جب اس نے مخلوق تخلیق کی ہو اس لئے مخلوق کی موجودگی ماننا خالق کا ماننا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کا ایسا ادراک کسی کو ہو جائے کہ مخلوق کی موجودگی اس کو محسوس ہی نہ ہو جیسے سورج کی موجودگی میں ستارے نظر نہیں آتے۔ اسی کو وحدت الشہود کہتے ہیں۔[2]

پس صوفیہ پر جب حق تعالیٰ کے وجود کی تجلی اتنی غالب ہو کہ ماسوا سے اس کو غافل کر دے تو وہ بزبان حال یہ کہتا ہے کہ صرف وہی موجود ہے۔ اسی کیفیت کو وحدۃ الوجود کہتے ہیں۔ یہ ایک حال ہے جس سے بعض لوگوں نے فلسفہ بنایا۔ نقصان اس سے ہوا کہ لوگوں نے اس کی فلسفیانہ تشریحات شروع کیں حالانکہ یہ بالکل سادہ سی بات ہے کہ جب سورج موجود ہوتا ہے تو تارے ہرگز نظر نہیں آتے اس لئے اگر کوئی اپنا مشاہدہ یہ بتائے کہ صرف سورج موجود ہے تارے نہیں ہیں تو وہ اگرچہ حقیقت کے خلاف ہے لیکن کہنے والا بھی جھوٹا نہیں ہے وہ تو اس وقت یہی کہے گا لیکن جو حقیقت سے واقف ہے وہ اس کی بات کی تاویل تو کرے گا لیکن اس کی بات سے تاروں کی وجود کا انکار نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ خالق ہے اور اس نے مخلوق کو پیدا کیا۔ قُرآن میں ان مخلوقات کا ذکر ہے۔ شریعت کا ایک مستقل نظام ہے جو انسانوں کے لئے ہے پس ان سارے حقائق سے کون انکار کر سکتا ہے۔ دوسری طرف اس کیفیت کا بھی انکار نہیں کہ سالک کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نظر ہی نہ آئے۔ اسی کا نام حضرت مجدد

الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے وحدت الشہود رکھا ہے یعنی ایک کا مشہود ہونا جو کہ اس کیفیت کی زیادہ بہتر تشریح ہے۔اس مسئلے کی اتنی تشریح پر عوام کو قناعت کرنی چاہیئے،اس میں زیادہ خوض کرنے سے نقصان کا اندیشہ ہے۔[3]

ایک اور دیوبندی صوفی بزرگ خواجہ عبدالحکیم انصاری (1893-1977)، جن کا یہ کہنا ہے کہ انہوں نے سلوک کی منازل طے کی ہیں، نے اس مسئلے کی تشریح اس طرح کی ہے:

سالک جس قدر اپنے افکار اور ادوار عبادات و اعمال میں ترقی کرتا جاتا ہے، اسی قدر قانون الٰہی کے مطابق اس کی روح (شعاع) درجہ بدرجہ اور طبقہ بہ طبقہ لطیف، مجلی [تجلی یافتہ]، حساس اور بیدار ہوتی جاتی ہے اور جن طبقات تک یہ لطیف اور بیدار ہوتی ہے، ان کی کیفیات لطیفہ کا احساس اور ماحول کا علم و عرفان بھی اس شعاع کے ذریعہ سالک کو ہوتا رہتا ہے، گو ظاہری آنکھوں سے کچھ نظر نہ بھی آئے۔ جب یہ شعاع ہاہوت کے آخر تک مجلی ہو جاتی ہے اور وہ حصہ بیدار ہونا شروع ہوتا ہے جو عالم ھو میں واقع ہے تو عجب عجب کوائف پیش آتے ہیں۔

اس عالم میں چونکہ صور و اشکال کا وجود بالکل نہیں ہوتا اور صفاتی و ذاتی تجلیات ملی جلی ہیں، اس لیے جب ان کا علم و عرفان سالک کے دماغ پر پرتو فگن ہوتا ہے تو اس پر عجیب عجیب کیفیتیں طاری ہوتی ہیں اور عجب عجب کلمات اس کے منہ سے نکل جاتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں حضرت ابن عربی نے وحدت الوجود کا نعرہ لگایا۔ ہوا یہ کہ ابن عربی کی روح خلقی استعداد کی وجہ سے ذاتی تجلیات سے بہت متاثر ہوئی اور چونکہ یہاں صور و اشکال کا وجود نہ تھا، وہ ان تجلیات کو ذات [خداوندی] یعنی سراب کو حقیقت سمجھ بیٹھے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ "عالم ہی خدا ہے۔ یہ [عالم] تجلی ہے جس میں وحدت نے اپنے آپ کو نمودار کیا ہے۔ ان تجلیات میں وحدت کلیتاً گم ہو گئی ہے لیکن ان کے ماوراء وحدت کا کوئی وجود نہیں۔" ان الفاظ میں حضرت ابن عربی نے اللہ تعالی یا اس کی وحدت کا انکار مطلق نہیں کیا بلکہ صرف یہ ظاہر کیا ہے کہ اشیاء کائنات کے ماوراء اللہ تعالی کا کہیں وجود نہیں ہے۔ یہ ان کے عرفان کی غلطی ہے۔ اللہ تعالی وہاں بھی ہے جہاں عالم مادی، عالم مثال اور عالم امر سب ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ "اس عالم کے بعد عدم [صوفیاء کے نزدیک یہ کائنات عالم اثبات ہے اور اس سے ماوراء ایک اور کائنات ہے جہاں کچھ موجود نہیں ہے، اسے وہ عدم کہتے ہیں] اور سالک کو عدم میں اللہ کی تلاش نہیں کرنی چاہیے کیونکہ وہاں سوائے رنج و تعب کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔"

یہ بات بھی انہوں نے صرف اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر لکھی ہے حالانکہ لطائف کے اصلی عوالم تو شروع ہی عدم سے ہوتے ہیں جیسا کہ ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں۔ یہ بات انہوں نے اس لیے فرمائی کہ جب "ھو" کو طے کرنے کے بعد عدم میں داخل ہوئے تو وہاں انہیں کچھ بھی محسوس نہ ہوا یا یوں کہیے کہ ان کو عدم کی "تجلیات منفی" کا عرفان نہ ہو سکا تو انہوں نے ہمت ہار دی اور اپنا سفر ختم کر دیا۔ اگر وہ عدم کی صعوبات پر صبر کرتے اور اس کو طے کر کے بسائط کے عوالم [عالَم کی جمع] میں پہنچ جاتے تو اس غلطی میں مبتلا نہ ہوتے۔ اس قسم کی بہت باتیں انہوں نے فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم میں تحریر فرمائی ہیں لیکن ان باتوں سے ان پر کفر کا الزام عائد نہیں ہوتا بلکہ اس کو محض عرفانی غلط فہمی کہا جا سکتا ہے۔

حضرت ابن عربی سے پہلے بھی ایسے کلمات کئی بزرگوں کے میں سے بحالت سکر نکلے لیکن بعد میں انہوں نے ان کی تسلی بخش تشریح کر دی، اس لیے زیادہ چرچا نہ ہوا۔ لیکن حضرت ابن عربی نے جس بات کو حق جانا تھا، ایک ضخیم کتاب میں اپنی پوری علمی طاقت و لیاقت سے تحریر کر دیا۔ زیادہ غلطی ان صوفیاء کی ہے جو حضرت ابن عربی کے بعد پیدا ہوئے۔ ان میں سے صرف چند ایسے تھے جن پر حضرت ابن عربی کے مماثل کوائف طاری ہوئے، انہوں نے آنکھ بند کر کے حضرت ابن عربی کے اقوال کی تائید کر دی، لیکن زیادہ صوفی ایسے گزرے ہیں اور اب بھی موجود ہیں جن

پر نہ تو کبھی کوائف طاری ہوئے، نہ وہ ان مقامات تک پہنچے بلکہ صرف حضرت ابن عربی اور ان کے مویدین ومصدقین کے تتبع [پیروی] میں ہمہ اوست [وحدت الوجود] کے قائل ہیں اور ان حضرات کے بے شمار مرید اور معتقد، جن میں بہت سے بالکل ہی بے علم ہوتے ہیں، اپنے پیشواؤں کی اندھی تقلید میں یہ سمجھتے ہیں کہ "ہر چیز خدا ہے" نعوذ باللہ۔ تعجب تو یہ ہے کہ یہ لوگ قرآن کی طرف کیوں نہیں لوٹتے جو پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ بادشاہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔ صرف وہی اس تمام کائنات کا خالق اور اس کی ہر شے پر ہر لحاظ سے قادر ہے۔

قُلْ اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (الرعد 13:16) [آپ کہیے کہ اللہ ہر چیز کا خالق ہے، وہی اکیلا اور زبردست قوت والا ہے۔]

عوام میں اس عقیدے کی اشاعت کا ایک اور بڑا سبب اکبر بادشاہ کی بے دینی اور اس کے ایجاد کردہ مذہب "دین الٰہی" کی تبلیغ بھی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اکبر نے یہ مذہب سیاسی مصلحتوں سے اس لیے جاری کیا تھا کہ اس کی غیر مسلم رعایا جو تعداد میں مسلمانوں سے کہیں زیادہ تھی، اس سے خوش اور راضی رہے۔ دین الٰہی کے سب سے بڑے داعی دربار اکبری کے ارکان خصوصاً ابو الفضل اور فیضی جیسے جید عالم تھے جو منطق اور فلسفہ میں دور دور تک اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ ان کی سحر نگاری کے کئی نتیجے نکلے:

ایک یہ کہ اکبر نے خوش ہو کر ان کو اعزاز و مراتب کے آسمان پر پہنچا دیا۔

دوسرے یہ کہ غیر مسلم خوش ہو گئے کہ مسلمانوں میں بھی روحانیت کا آخری عقیدہ وہی ہے جو ہمارے مذہب میں ہے اور ان پر جو توحید اسلامی کی فضیلت کا رعب طاری تھا، جاتا رہا۔

تیسرے یہ کہ خود مسلمان بھی یہی سمجھنے لگے کہ توحید صرف ہمارے ہاں ہی نہیں، دوسرے مذاہب میں بھی ہے اور ان کے ذہن میں اپنی فضیلت کا جو احساس تھا، ختم ہو گیا۔

چوتھے یہ کہ اکثر مسلمان علماء اور عوام بادشاہ اور امراء کی خوشنودی کے لیے "ہمہ اوست" کا دم بھرنے لگے۔ یہاں تک کہ دو چار نسلیں گزرنے پر "اسلامی تصوف" میں اس عقیدے کو وہی درجہ حاصل ہو گیا جو مذہب "اسلام" میں کبھی "توحید" کو حاصل تھا اور آج جس تصوف زدہ کو دیکھو، وہ یہی کہتا ہے کہ کفر و اسلام میں فرق ہی کچھ نہیں۔[4]

اس نقطہ نظر کا خلاصہ یہ ہے کہ سالک کو اپنے روحانی سفر میں ایک ایسے مقام سے واسطہ پیش آتا ہے جب اسے اللہ تعالیٰ کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا اور وہ ہر چیز سے غافل ہو جاتا ہے۔

شاہ ولی اللہ (1703-1762) نے اپنی کتب لمعات میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود میں تعارض کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ پوری کائنات کی ایک روح ہے جسے وہ "النفس الکلیہ (Universal Soul)" کہتے ہیں اور یہ روح اللہ تعالیٰ کی ذات سے قائم ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب ابن العربی یہ کہتے ہیں کہ ہر چیز خدا ہے تو اس سے ان کی مراد یہی ہوتی ہے کہ خدا کی قائم کردہ یہ روح ہر چیز میں موجود ہے۔ اسی طرح جب شیخ احمد سرہندی کہتے ہیں کہ ہر چیز الگ ہے مگر سالک کو وہ ایک ہی نظر آتی ہیں تو وہ دراصل اسی کی توجیہ پیش کر رہے ہوتے ہیں۔

ناقدین تصوف کا جواب

ناقدین تصوف اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ اگر اس بات کو درست مان لیا جائے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ پر یہ کیفیات طاری کیوں نہیں ہوئیں؟ احادیث کے پورے ذخیرے کا مطالعہ کرتے چلے جائیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے کبھی یہ منازل طے نہ کیں۔ قرآن مجید اور احادیث کے پورے ذخیرے میں کہیں بھی وحدت الوجود یا وحدت الشہود کے الفاظ موجود نہیں ہیں اور نہ ہی ایسی کیفیات کا کہیں بیان ہے جن پر وحدت الوجود یا شہود کا اطلاق کیا جا سکے۔ قرآن و حدیث میں کہیں بھی ایسا بیان نہیں ہے جس میں مسلمانوں کو یہ ترغیب دلائی گئی ہو کہ وہ ایسے روحانی سفر پر نکلیں جس میں وہ اللہ تعالی کا ایسا مشاہدہ کریں جس میں انہیں سوائے اللہ کے کچھ نظر نہ آئے۔ اسی طرح شاہ ولی اللہ کا یہ کہنا کہ کائنات میں ایک روح موجود ہے، قرآن مجید یا صحیح احادیث میں کہیں بیان نہیں ہوا ہے۔

احادیث اور وحدت الشہود

اس کے جواب میں اہل تصوف کچھ احادیث پیش کرتے ہیں جن میں ان کے مطابق وحدت الشہود کی کیفیات کا ذکر ہے۔ احادیث یہ ہیں:

حدیث جبرائیل

یہ ایک مشہور حدیث ہے جو حدیث جبرائیل کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں ذکر ہے کہ جبرائیل علیہ السلام ایک بار انسانی صورت میں آئے اور انہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے ایمان، اسلام، احسان اور قیامت سے متعلق سوالات کیے۔ اسی حدیث میں ہے:

قال: ما الإحسان؟ قال: (أن تعبد الله كأنك تراه، فإن لم تكن تراه فإنه يراك).

[جبرائیل نے] عرض کیا: "احسان کیا ہے؟" [رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے] فرمایا: "وہ یہ ہے کہ آپ اللہ کی عبادت اس طرح کیجیے جیسے آپ اسے دیکھ رہے ہیں۔ اگر آپ اسے نہ دیکھتے ہوں تو وہ تو آپ کو دیکھتا ہی ہے۔" (بخاری، کتاب الایمان، حدیث 50)

ناقدین تصوف یہ کہتے ہیں کہ احسان کوئی مرتبہ نہیں ہے جیسا کہ صوفیاء بیان کرتے ہیں۔ یہ ایک کیفیت کا نام ہے جو کسی مجاہدے، چلے یا مراقبے سے طاری نہیں ہوتی بلکہ انسان اسے عقلی طور پر خود پر طاری کر سکتا ہے۔ نماز پڑھتے ہوئے انسان اپنے ذہن کو اس جانب متوجہ کر لے کہ وہ اللہ تعالی کو دیکھ رہا ہے یا اللہ تعالی اسے دیکھ رہا ہے تو یہ ایک بالکل سادہ، آسان اور عقلی عمل ہے۔ اسلام انسان کو اسی بات کا حکم دیتا ہے جو وہ کر سکتا ہو۔ اس کے لیے نہ تو کسی شیخ کے پاس جانے کی ضرورت ہے اور نہ کسی مجاہدے اور مراقبے کی ضرورت ہے۔ ہر انسان کچھ نہ کچھ مشق سے یہ کیفیت طاری کر سکتا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ نماز کے علاوہ بھی یہی کیفیت اگر انسان پر طاری رہنے لگے تو وہ

گناہوں سے بچ سکتا ہے۔

حدیث حنظلہ رضی اللہ عنہ

دوسری حدیث وہ ہے جس میں حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محفل میں ان کی حالت یہ ہو جایا کرتی تھی کہ وہ جنت و جہنم کو گویا کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ حدیث یہ ہے:

حدثنا يحيى بن يحيى التيمي وقطن بن نسير (واللفظ ليحيى). أخبرنا جعفر بن سليمان عن سعيد بن إياس الجريري، عن أبي عثمان النهدي، عن حنظلة الأسيدي قال (وكان من كتاب رسول الله صلى الله عليه وسلم) قال:

لقيني أبو بكر فقال: كيف أنت؟ يا حنظلة! قال قلت: نافق حنظلة. قال: سبحان الله! ما تقول؟ قال قلت: نكون عند رسول الله صلى الله عليه وسلم. يذكرنا بالنار والجنة. حتى كأنا رأي عين. فإذا خرجنا من عند رسول الله صلى الله عليه وسلم، عافسنا الأزواج والأولاد والضيعات. فنسينا كثيرا. قال أبو بكر: فوالله! إنا لنلقى مثل هذا. فانطلقت أنا وأبو بكر، حتى دخلنا على رسول الله صلى الله عليه وسلم. قلت: نافق حنظلة. يا رسول الله! فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم "وما ذاك؟" قلت: يا رسول الله! نكون عندك. تذكرنا بالنار والجنة. حتى كأنا رأى عين. فإذا خرجنا من عندك، عافسنا الأزواج والأولاد والضيعات. نسينا كثيرا. فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم "والذي نفسي بيده! إن لو تدومون على ما تكونون عندي، وفي الذكر، لصافحتكم الملائكة على فرشكم وفي طرقكم. ولكن، يا حنظلة! ساعة وساعة" ثلاث مرات.

حنظلہ الاسیدی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں ابو بکر رضی اللہ عنہ سے ملا تو انہوں نے پوچھا: "حنظلہ! آپ کیسے ہیں؟" میں نے کہا: "حنظلہ تو منافق ہو گیا۔" فرمایا: "سبحان اللہ! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" میں نے کہا: "ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہوتے ہیں اور آپ ہمیں جہنم اور جنت کی یاد دلاتے ہیں یہاں تک کہ گویا ہم ان دونوں کو کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ پھر جب ہم رسول اللہ کے پاس سے نکلتے ہیں اور اپنے بیوی بچوں اور دیگر امور میں لگ جاتے ہیں تو اس کے اکثر حصے کو بھول جاتے ہیں۔" ابو بکر بولے: "واللہ! میرا بھی ایسا ہی معاملہ ہے۔"

پھر میں اور ابو بکر چل پڑے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ پہنچے۔ میں نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! حنظلہ تو منافق ہو گیا۔" آپ نے فرمایا: "ارے! آپ کو کیا ہوا؟" عرض کیا: "ہم لوگ آپ کے پاس ہوتے ہیں اور آپ ہمیں جہنم اور جنت کی یاد دلاتے ہیں یہاں تک کہ گویا ہم ان دونوں کو کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ پھر جب ہم آپ کے پاس سے نکلتے ہیں اور اپنے بیوی بچوں اور دیگر امور میں لگ جاتے ہیں تو اس کے اکثر حصے کو بھول جاتے ہیں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے! اگر آپ پر وہی کیفیت رہے جو آپ کی میرے پاس ہوتی ہے اور آپ اسے یاد رکھیں تو فرشتے آپ سے آپ کے بستروں اور راستوں پر مصافحہ کریں۔ لیکن حنظلہ! قیامت، قیامت، قیامت [کو یاد رکھیے!] (مسلم، کتاب التوبہ، حدیث 2750)

اس حدیث کے جواب میں بھی ناقدین تصوف یہی کہتے ہیں کہ جنت و جہنم کا انسان کی نگاہوں کے سامنے آ جانا ایک عقلی اور منطقی کیفیت

ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے بلیغ خطیب سامنے ہوں اور جنت و جہنم کا بیان فرمارہے ہوں تو لازماً ایسا ہی ہو گا کہ جنت و جہنم کی گویا ایک تصویر نگاہوں کے سامنے گردش کرنے لگے۔ اب بھی توجہ سے سمجھ کر اگر قرآن مجید کی تلاوت کی جائے یا جنت و جہنم سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کیا جائے تو پڑھنے والے پر یہی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے بھی کسی چلے، مراقبے یا روحانی سفر کی ضرورت نہیں ہے۔

وہ مزید کہتے ہیں کہ اہل تصوف تو جنت و جہنم کو بہت حقیر قرار دیتے ہیں اور ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ اللہ تعالی کا مشاہدہ کیا جائے۔ حدیث میں تو جنت و جہنم کے مشاہدے کا ذکر ہے نہ کہ "مشاہدہ حق" کا۔

شیخ احمد سرہندی کا روحانی سفر

ناقدین تصوف یہ بیان کرتے ہیں کہ شیخ احمد سرہندی نے بھی اسی بات کا ذکر کیا ہے کہ اپنے روحانی سفر میں وہ وحدت الوجود سے آگے، وحدت الشہود کے مقام پر پہنچے اور اس سے بھی آگے ایک اور مقام پر پہنچے جو کہ "مقام عبدیت" کہلاتا ہے۔ اپنے روحانی سفر سے متعلق اسی بات کو انہوں نے اپنے مشہور زمانہ مکتوبات بیان کیا ہے:

> مخدوم و مکرم ! کم عمری کے زمانہ میں فقیر کا اعتقاد بھی توحید وجودی والوں کے مشرب جیسا تھا۔۔ اس طریقہ عالیہ میں محنت کرنے کے بعد تھوڑی مدت کے بعد ہی توحید وجودی منکشف ہو گئی اور اس کشف میں غلو پیدا ہو گیا، اور اس مقام کے علوم و معارف کثرت سے ظاہر فرمائے گئے اور اس مرتبے کی باریکیوں میں سے کوئی کم ہی باریکی ہو گی جو منکشف نہ کی گئی ہو۔ شیخ محی الدین ابن العربی کے معارف کے دقائق [باریک باتیں] پورے طور پر ظاہر واضح کیے گئے اور تجلی ذاتی جسے صاحب فصوص نے فیان فرمایا ہے اور نہایت عروج اسی کو قرار دیا ہے اور اس تجلی کی شان میں فرماتے ہیں: **و ما بعد هذا الا العدم المحض**۔ "اور اس کے بعد صرف عدم محض ہے۔"
>
> مجھے اس تجلی ذاتی سے بھی مشرف فرمایا اور اس تجلی ذاتی کے علوم و معارف جنہیں شیخ نے خاتم الولایت کے ساتھ مخصوص کیا ہے، وہ تفصیل سے معلوم ہوئے اور سکر وقت اور غلبہ حال اس توحید وجودی میں اس حد تک پہنچ گیا کہ بعض خطوط میں جو حضرت خواجہ کی خدمت میں لکھے گئے، یہ دوبیتؔ[اشعار] بھی جو سراسر مسکر [حالت سکر میں لکھے گئے] ہیں، لکھ ڈالے۔
>
> "افسوس یہ شریعت نابینوں کی شریعت ہے، ہماری ملت تو کفر اور عیسائیت کی ملت ہے۔ کفر و ایمان اس زیبا شکل پری کی زلف و چہرہ ہیں، کفر اور ایمان دونوں ہمارے راہ میں برابر ہیں۔"
>
> یہ حال مدت دراز تک رہا، اور مہینوں سے سالوں تک پہنچ گیا۔ اچانک حضرت حق سبحانہ و تعالی کی عنایت بے نہایت غیب کی کھڑکی سے ظہور کے میدان میں آئی اور بے چون و بے چگون کی روپوشی کے پردہ کو اٹھا دیا۔ پہلے علوم جو اتحاد اور وحدت الوجود کی خبر دیتے تھے، زائل ہونا شروع ہو گئے اور احاطہ اور ذات حق کا قلب مومن میں سما جانا اور قرب و معیت ذاتی، یہ سب کچھ جو اس مقام میں منکشف ہوئے تھے، پوشیدہ ہو گئے اور پورے یقین سے معلوم ہو گیا کہ صانع عالم جل شانہ کے لیے عالم کے ساتھ ان مذکورہ نسبتوں میں سے کوئی نسبت بھی ثابت نہیں۔ ذات حق سبحانہ و تعالی کا احاطہ اور رب ذاتی نہیں بلکہ علمی ہے جیسا کہ اہل حق شکر اللہ سعیہم کے ہاں قرار پا چکا ہے اور وہ سبحانہ و تعالی کسی چیز کے ساتھ متحد نہیں اور خدا خدا ہے اور عالم عالم ہے۔ وہ سبحانہ و تعالی بے مثل و بے مثال ہے اور عالم سارے کا سارا مثل و مثال کے داغ سے داغدار ہے۔۔۔

اور جس وقت توحید وجودی کے مشرب کے خلاف علوم و معارف حاصل ہوتے تھے، تو فقیر کو بڑا اضطراب اور بے چینی لاحق ہوتی تھی کیونکہ اس وقت یہ فقیر اس توحید وجودی سے بلند تر کچھ نہیں جانتا تھا اور بڑے عجز وزاری کے ساتھ دعا کرتا تھا کہ یہ معرفت کہیں زائل نہ ہو۔ یہاں تک کہ اس معاملہ کے چہرے سے تمام حجابات دور ہو گئے اور حقیقت جس طرح کہ چاہیے تھی، منکشف اور ظاہر ہو گئی اور معلوم ہو گیا کہ عالم اگرچہ کمالات صفاتی کے آئینے اور اسماء کے ظہور کی جلوہ گاہ ہے، لیکن مظہر عین ظاہر نہیں اور ظل عین اصل نہیں۔[یعنی یہ دنیا اللہ تعالی کے وجود کا ظہور نہیں ہے اور نہ ہی اس کا سایہ ہے]۔۔۔۔

بعض لوگوں کو توحید سے متعلق کثرت مراقبات ان احکام کی طرف کھینچ لاتے ہیں کیونکہ ان مراقبات کی صورت قوت خیالیہ میں نقش ہو جاتی ہے۔[5]

راقم سطور اولاً توحید وجودی کا عقیدہ رکھتا تھا، زمانہ طفولیت سے اس کو اس توحید کا علم حاصل تھا اور اس کے دل میں اس کا یقین راسخ تھا، اگرچہ اس معاملہ میں اس وقت صاحب حال نہ تھا، اس نے راہ سلوک پر قدم رکھا تو اول (توحید وجودی) کا طریق منکشف ہوا اور اس نے مدت تک اس مقام کے منازل و مراتب میں جولانی کی، اور بہت سے علوم جو اس مقام کے مناسب تھے، اس پر فائز ہوئے، اور وہ مشکلات وواردات جو ارباب توحید پر وارد ہوتے ہیں، وہ ان مکاشفات اور علوم فیضانی سے حل ہوئے۔ ایک مدت کے بعد دوسری نسبت کا اس فقیر پر غلبہ ہوا، اور اس غلبہ کی حالت میں اس کو توحید وجودی کے بارے میں توقف لاحق ہوا، لیکن یہ توقف حسن ظن کے ساتھ تھا، انکار کے ساتھ نہیں۔ مدت تک وہ متوقف رہا، آخر الامر معاملہ انکار تک پہنچ گیا اور اس کو دکھایا گیا کہ یہ مرتبہ [وحدت وجود کی منزل] فروتر ہے اور وہ مقام ظلیت تک پہنچا جو اس سے بالاتر ہے۔

اس انکار کے معاملہ میں وہ بے اختیار تھا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس مقام سے باہر نکلے۔ اس لیے کہ بڑے بڑے مشائخ اسی مقام پر طرح اقامت ڈال چکے تھے، لیکن جب وہ مقام ظلیت تک پہنچا اور اس نے اپنے کو اور عالم کو ظل [سایہ] پایا تو اس کو یہ آرزو ہوئی کہ اس کو اس مقام سے جدا نہ کیا جائے، اس لیے کہ وہ کمال وحدت الوجود ہی میں سمجھتا تھا اور یہ مقام فی الجملہ اس سے مناسبت رکھتا ہے لیکن تقدیری بات کہ کمال عنایت اور غریب نوازی سے اس کو اس مقام سے بھی اوپر لے جایا گیا، اور مقام عبدیت تک پہنچایا گیا، اس وقت اس مقام کا کمال نظر میں آیا، اور اس کی بلندی واضح ہوئی اور وہ مقامات گزشتہ سے توبہ و استغفار کرنے لگا۔ اگر اس عاجز کو اس راستہ تک نہ لے جاتے اور ایک مقام کی دوسرے مقام پر فوقیت نہ ظاہر کرتے، تو وہ اس مقام میں اپنا تنزل سمجھتا، اس لیے کہ اس کے نزدیک توحید وجودی سے بالاتر کوئی مقام نہ تھا۔[6]

کشف سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے، وہ شہود ہی شہود ہے اور حقیقت نہیں بلکہ غایت فی الباب یہ ہے کہ خدا کا شہود ہو ہی نہیں سکتا۔ پس ایمان بالغیب کے سوا چارہ نہیں۔[7]

شیخ احمد سرہندی کے ان اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے روحانی سفر کے دوران وہ تین مقامات سے گزرے۔ ایک وحدت الوجود کا مقام تھا۔ اس مقام پر انہوں نے کفر و ایمان کو ایک ہی صف پر لا کھڑا کیا۔ اس کے بعد وہ وحدت الشہود کے مقام پر پہنچے جہاں انہیں یہ معلوم ہوا کہ کائنات اللہ تعالی کے وجود کا محض ایک سایہ ہے۔ اس کے بعد وہ سب سے بلند مقام پر پہنچے جسے انہوں نے "مقام عبدیت" قرار دیا ہے۔

ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ یہی وہ مقام عبدیت ہے جس کی طرف دعوت قرآن مجید نے دی ہے۔ اگر صوفیاء اپنے روحانی سفر کو چھوڑ

کر قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنا شروع کر دیں تو انہیں اس پورے تکلیف دہ روحانی سفر کی ضرورت ہی نہ رہے جس میں وہ برسوں چلے، مراقبے اور مجاہدے کرتے ہیں۔ علامہ عبد الرحمن کیلانی لکھتے ہیں:

> اب دیکھیے کہ مجدد صاحب نے اتنی محنت شاقہ کے بعد جو سربستہ راز تلاش کیا ہے، کیا یہ خدا نے ہمیں بغیر کسی محنت اور دماغ سوزی کے بذریعہ انبیاء، ابتدا سے ہی نہیں بتلا دیا تھا۔ قرآن میں جو یہ آیت ہے کہ لَا تُدْرِكُهُ الأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الأَبْصَارَ "نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کر سکتا ہے۔" اس میں عین کی بجائے بصر کا لفظ استعمال کیا ہے۔ "عین" ظاہری آنکھ کے لیے آتا ہے اور "بصر" ظاہری اور باطنی یا قلبی ہر دو آنکھوں کے لیے آتا ہے۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ نہ تم عقل و فلسفہ کی رو سے خدا کی کنہ کو پا سکتے ہو اور نہ وجدان و مشاہدہ و کشف کے ذریعے۔ پھر یہ بھی بتلا دیا کہ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ "کوئی چیز اس کے مثل نہیں۔"
>
> اس آیت میں انسان کے تخیل و واہمہ کو چیلنج کیا گیا ہے کہ وہ بھی خدا کا تصور پیش نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔ پھر یہ بھی عجیب بات ہے کہ مجدد صاحب نے اتنی ریاضتوں اور محنت شاقہ کے بعد جس عبدیت کے مقام کا اظہار کیا ہے، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اس قدر محنت شاقہ اور تزکیہ نفس کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ وہ تو مجھے اور مجھ جیسے گناہگاروں سب کو حاصل ہے۔ حسب ارشاد باری تعالی: قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَى أَنْفُسِهِمْ لا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ "(اے پیغمبر! میری طرف سے لوگوں کو کہہ دو کہ اے) میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہونا۔" یہ الگ بات ہے کہ مجھ گناہگار کا عبدیت کے لحاظ سے مقام الگ ہے، مجدد صاحب کا بہت اونچا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے اونچا مگر عبد ہونے میں تو مجال انکار نہیں ہو سکتا۔ [8]

ناقدین تصوف کا کہنا ہے کہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر قرآن و حدیث کا علم حاصل کیا جائے تو یہ انسان کے تزکیہ میں سب سے زیادہ مدد و معاون ہے اور تزکیہ نفس کے تمام مراحل کو طے کرنے کے لیے کافی ہے۔

اسائن منٹس

- علامہ احمد سعید کاظمی اور خواجہ عبد الحکیم انصاری نے وحدت الوجود کی کیا تشریحات کی ہیں؟ دونوں کا تقابل کیجیے۔
- وحدت الشہود کے نظریے پر ناقدین تصوف کا اعتراض کیا ہے؟
- شیخ احمد سرہندی کے روحانی سفر کے تین مراحل کیا تھے؟

---

[1] احمد سعید کاظمی۔ وحدت الوجود کیا ہے؟ ص 8-6۔ www.alahazratnetwork.org (ac. 3 Aug 2008)

[2] سید شبیر احمد کاکاخیل۔ تصوف سے متعلق عام پوچھے جانے والے سوالات۔ www.tazkia.org (ac. 24 Apr 2011)

[3] سید شبیر احمد کاکاخیل۔ فہم التصوف۔ www.tazkia.org (ac. 24 Apr 2011)

[4] خواجہ عبد الحکیم انصاری۔ حقیقت وحدت الوجود۔ www.toheedia.net (ac. 3 May 2011)

[5] احمد سرہندی المعروف بہ: مجدد الف ثانی (ترجمہ: محمد سعید احمد نقشبندی)۔ مکتوبات امام ربانی۔ دفتر اول، مکتوب نمبر 31۔ کراچی: مدینہ پبلشنگ کمپنی۔ www.archive.org (13 Oct 2011)

[6] حوالہ بالا۔ دفتر اول، مکتوب نمبر 161

[7] حوالہ بالا۔ مکتوبات دفتر دوم، مکتب 9

[8] عبدالرحمن کیلانی۔ شریعت وطریقت۔ ص104۔ لاہور: مکتبہ السلام (2006)۔ www.kitabosunnat.com (ac. 27 Apr 2011)

باب 6: کشف و الہام اور ختم نبوت

اکثر صوفیاء، خواہ وہ پابند شریعت ہوں یا مخالف شریعت، یہ دعوی کرتے ہیں کہ ان کا رابطہ اللہ تعالی سے براہ راست قائم ہو جاتا ہے۔ اسے وہ کشف یا الہام کا نام دیتے ہیں اور اسے وحی سے مختلف چیز قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ کشف کی صورت میں انہیں اللہ تعالی سے راہنمائی مل جاتی ہے۔ بعض صوفیاء یہی دعوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روحانی رابطے سے متعلق کرتے ہیں اور اسی روحانی رابطے کی بنیاد پر آپ سے براہ راست احادیث بھی روایت کر لیتے ہیں۔ غالی صوفیاء کے ہاں ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ مقام ولایت کو مقام نبوت سے افضل قرار دے بیٹھتے ہیں۔ بعض صوفیاء خود کو اور اپنے اکابرین کو گناہوں سے پاک اور محفوظ قرار دے دیتے ہیں اور بعض صوفیاء رسالت یا اس سے بھی آگے کے کسی مقام کا دعوی کر بیٹھتے ہیں۔

اس کے برعکس ناقدین تصوف کا موقف یہ ہے کہ ختم نبوت کے بعد اللہ تعالی سے کوئی روحانی رابطہ ہونا ممکن نہیں ہے۔ ایسا کوئی تصور بھی کرنا ختم نبوت کے انکار کے مترادف ہے۔ اب اللہ تعالی کے منشا کو جاننے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے قرآن مجید اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت اور قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے ان کے الفاظ کی راہنمائی۔ یہ تشریح کرتے ہوئے دیکھا جائے گا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے انہیں کیسے سمجھا اور ان پر کیسے عمل کیا ہے؟

ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ وہ مانتے ہیں کہ کبھی کشف یا خواب میں کسی انسان کو کوئی راہنمائی مل جائے۔ یہ راہنمائی اللہ تعالی کی جانب سے ہو سکتی ہے اور شیطانی وسوسہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس وجہ سے کشف و الہام میں دی گئی راہنمائی کو قرآن و سنت اور عمل صحابہ پر پرکھا جائے گا۔ اگر یہ ان کے مطابق ہو تو اسے اللہ تعالی کی طرف سے سمجھا جائے گا اور اگر خلاف ہو تو اسے شیطانی وسوسہ قرار دیا جائے گا۔ کشف و الہام اندھے اعتماد کی چیز نہیں ہے بلکہ اس کے بارے میں بہت محتاط رہنا چاہیے اور مشقیں وغیرہ کر کے کشف و الہام کو طلب نہیں کرنا چاہیے۔

اس باب میں پہلے ہم صوفیاء کے ان دعاوی کا مطالعہ کریں گے جو انہوں نے اس ضمن میں کیے اور پھر یہ دیکھیں گے کہ صوفیاء کا ان معاملات میں کیا موقف ہے۔

صوفیاء کے دعاوی

بہت سے صوفیاء نے ایسے دعوے کیے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا روحانی تعلق براہ راست اللہ تعالی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قائم تھا۔ چند مثالیں ہم یہاں بیان کر رہے ہیں۔

اللہ تعالی، انبیاء کرام اور فرشتوں سے براہ راست استفادہ

امام غزالی(1111-450-505/1058) نے تصوف کی جانب اپنے ارتقائی سفر سے متعلق تجربات پر مشتمل مشہور زمانہ کتاب "المنقذ من الضلال" لکھی۔ اس کتاب میں درج ہے:

وهي على التحقيق أول الطريقة، وما قبل ذلك كالدهليز للسالك إليه. ومن أول الطريقة تبتدئ المكاشفات (والمشاهدات)، حتى أنهم في يقظهم يشاهدون الملائكة، وأرواح الأنبياء ويسمعون منهة أصواتا ويقتبسون منهة فوائد.

سو درحقیقت فنا فی اللہ ہونا اس طریق کا پہلا درجہ ہے اور اس سے پہلے کی حالت سالک کے لیے بمنزلہ دہلیز ہے اور اول درجہ طریقت سے ہی مکاشفات و مجاہدات شروع ہو جاتے ہیں حتی کہ یہ لوگ حالت بیداری میں ملائکہ و ارواح انبیاء کا مشاہدہ کرتے ہیں، اور ان کی آوازیں سنتے ہیں اور ان سے فوائد حاصل کرتے ہیں۔[1]

مشہور صوفی ابو طالب مکی(d. 386/996) تصوف کی بنیادی کتاب "قوت القلوب" میں بایزید بسطامی (874-188-260/804) کا یہ بیان نقل کرتے ہیں:

ادخلني في الفلك الأسفل فدورني في الملكوت السفلى فأراني الأرضين وما تحتها إلى الثرى، ثم ادخلني في الفلك العلوى فطوف بي في السماوات وأراني ما فيها من الجنان إلى العرش ثم أوقفني بين يديه فقال لي: سلني أي شيئ رأيت حتى اهبه لك.

اس [اللہ] نے مجھے نچلے آسمان میں داخل کیا اور مجھے نچلے آسمان کا دورہ کروایا۔ پھر اس نے دوزمینیں مجھے دکھائیں اور جو کچھ پاتال میں تھا۔ پھر اس نے مجھے اوپر والے آسمان میں داخل کیا اور مجھے آسمانوں کی سیر کروائی اور مجھے جنتوں سے لے کر عرش تک جو کچھ تھا، دکھا دیا۔ پھر اس نے مجھے اپنے سامنے کھڑا کر کے فرمایا: "تم نے جو کچھ دیکھا ہے، مجھ سے مانگو، میں تمہیں عطا کروں گا۔"[2]

عصمت صوفیاء

بعض صوفیاء کا عقیدہ یہ ہے کہ ان کے بزرگ اور مرشد، پیغمبر کی طرح خطاء سے معصوم ہوتے ہیں۔ تاہم نبی اور غیر نبی میں فرق کے لیے وہ اپنے بزرگوں کے لیے "معصوم" کی بجائے "محفوظ" کا لفظ اختیار کرتے ہیں۔ سہروردی سلسلہ کے بانی شیخ شہاب الدین سہروردی(1234-543-632/1148) کی کتاب "عوارف المعارف" میں درج ہے:

فالشيخ للمريدين أمين الإلهام كما أن جبريل أمين الوحي، فكما لا يخون جبريل في الوحي، لا يخون الشيخ في الإلهام، وكما أن رسول الله صلى الله عليه وسلم لا ينطق عن الهوى فالشيخ مقتد برسول الله صلى الله عليه وسلم ظاهرا وباطنا لا يتكلم بهوى النفس.

سو شیخ اپنے مریدین کے لیے الہام کا امین ہوتا ہے جیسا کہ جبریل وحی کے امین ہیں۔ جیسے جبریل وحی میں خیانت نہیں کرتے، ویسے ہی شیخ بھی اپنے الہام میں خیانت نہیں کرتا۔ جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ہوائے نفس سے بات نہیں کرتے، ویسے ہی ظاہری اور باطنی طور پر شیخ بھی آپ کی پیروی میں ہوائے نفس سے بات نہیں کرتا۔[3]

شیخ نظام الدین اولیاء(635-725/1238-1325) کے ملفوظات پر مشتمل کتاب "فوائد الفوائد" میں ان کی جانب یہ قول منسوب کیا گیا ہے:

اس کے بعد گفتگو عصمت اولیاء کے بارے میں ہوئی۔"آپ نے ارشاد فرمایا کہ انبیاء معصوم ہیں اور نزدیک فقراء کے اولیاء بھی معصوم ہیں لیکن انبیاء واجب العصمت اور اولیا جائز العصمت ہیں۔"[4]

کشف کی بنیاد پر احادیث کی روایت

بعض صوفیاء خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کا دعوی کرتے ہیں اور اس کی بنیاد پر احادیث روایت کرتے ہیں۔ اس طرح سے کشف کی بنیاد پر یہ صحیح حدیث کو ضعیف اور ضعیف حدیث کو صحیح بھی قرار دے لیتے ہیں اور دینی عقائد اور فقہی مسائل میں بھی حسب کشف تبدیلی کر لیتے ہیں۔ فوائد الفوائد میں درج ہے:

اس کے بعد گفتگو فضیلت مولانا رضی الدین صنعانی صاحب مشارق کے بارے میں ہوئی۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ان کی یہ تحریر کہ یہ میری کتاب حجت ہے، میرے اور حق تعالی کے بیچ میں صحیح ہے۔ ان کا حال یہ تھا کہ اگر کسی حدیث میں ان کو مشکل ہوتی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھتے اور آپ سے تصحیح فرما لیتے۔[5]

مقام نبوت کے حصول کا امکان

شیخ ابن عربی(558-638/1164-1240) کی کتاب "فتوحات مکیہ" میں درج ہے:

اعلم أيدنا الله وإياك بروح منه أن هذا الباب يتضمن أصناف الرجال اللذين يحصرهم العدد والذين لا توقيت لهم ويتضمن المسائل التي لايعلمها إلا الاكابر من عباد الله الذين هم في زمانهم بمنزلة الأنبياء في زمان النبوة وهي النبوة العامه فإن النبوة التي انقطعت بوجود رسول الله صلى الله عليه وسلم أنما هي نبوة التشريع لا مقامها فلا شرع يكون ناسخا لشرعه صلى الله عليه وسلم ولايزيد في حكمه شرعا آخر وهذا معنى قوله صلى الله عليه وسلم أن الرسالة والنبوة قد انقطعت فلا رسول بعدي ولا نبي أي لانبي بعدي يكون على شرع يخالف شرعي بل إذا كان يكون تحت حكم شريعتي ولا رسول أي لا رسول بعدي إلى أحد من خلق الله بشرع يدعوهم إليه فهذا هو الذي انقطع وسد بابه لا مقام النبوة فإنه لا خلاف أن عيسى عليه السلام نبي ورسول وإنه لا خلاف إنه ينزل في آخر الزمان حكماً مقسطاً عدلاً بشرعنا لا بشرع آخر ولا بشرعه الذي تعبد الله به بني إسرائيل من حيث ما نزل هو به بل ما ظهر من ذلك هو ما قرره شرع محمد صلى الله عليه وسلم ونبوة عيسى عليه السلام ثابتة له محققة فهذا نبي ورسول قد ظهر بعده صلى الله عليه وسلم وهو الصادق في قوله أنه لا نبي بعده فعلمنا قطعاً أنه يريد الشريع خاصة وهو المعبر عنه عند أهل النظر بالاختصاص.

اللہ ہماری اور آپ کی اپنی روح کی مدد سے تائید فرمائے! اس بات کو جان لیجیے کہ یہ باب انسانوں کی اقسام پر مشتمل ہے جن کی تعداد محدود ہے اور ان کا وقت محدود نہیں ہے۔ یہ ایسے مسائل پر مشتمل ہے جسے اللہ کے بندوں میں سے بڑے لوگ ہی جانتے ہیں۔ وہ اپنے زمانوں میں اس مقام پر ہوتے ہیں جس پر انبیاء نبوت کے زمانہ میں ہوا کرتے تھے۔ یہ عام نبوت ہے جبکہ وہ نبوت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود پر ختم ہو گئی،

تشریعی نبوت ہے۔ اس کے مقام کی کوئی شریعت نہ آئے گی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو ختم کرے اور نہ ہی اس کے حکم میں کوئی اور شریعت اضافہ کرے گی۔ یہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب ہے کہ "رسالت اور نبوت ختم ہو گئی، میرے بعد کوئی نبی نہیں" یعنی میرے بعد کوئی ایسا نبی نہ آئے گا جو کہ میری شریعت کا مخالف ہو۔ بلکہ جب بھی ایسا ہو گا تو وہ میری شریعت کے حکم کے تحت ہو گا۔ میرے بعد کوئی رسول نہ ہو گا، کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی مخلوق میں کوئی ایسا نہ ہو گا جو شریعت لے کر آئے اور اس کی جانب دعوت دے۔ یہ ہے وہ جو کہ منقطع ہو گئی اور جس کا دروازہ بند ہو گیا۔

نبوت کا مقام ختم نہیں ہوا کیونکہ اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ عیسی علیہ السلام نبی اور رسول ہیں اور اس میں بھی اختلاف نہیں کہ وہ عادل حکمران کے طور پر آخر زمانہ میں نازل ہوں گے۔ ہماری شریعت کے مطابق فیصلے کریں گے نہ کہ اس شریعت کے مطابق جو اللہ نے بنی اسرائیل پر لازم کی تھی۔ اس اعتبار سے نہیں کہ وہ اسے لے کر نازل ہوں گے بلکہ اس وقت جو غالب ہو گی اور وہ شرع محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اقرار کریں گے۔ عیسی علیہ السلام کی نبوت ثابت اور اتفاقی ہے۔ یہ وہ نبی و رسول ہیں جو آپ کے بعد ظاہر ہوئے۔ آپ اپنے ارشاد میں سچے ہیں کہ فرمایا کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہو گا۔ ہم قطعی طور پر جان گئے کہ آپ کی مراد خاص شریعت ہے اور اہل نظر کے نزدیک وہی مراد ہے۔ ان [اہل نظر] کے اس قول کہ نبوت حاصل نہیں کی جا سکتی کا یہی مطلب ہے۔[6]

جیسا کہ آپ احمدیت سے متعلق ماڈیول میں پڑھ چکے ہیں کہ ابن عربی ہی کے نقطہ نظر کو بنیاد بنا کر مرزا غلام احمد قادیانی (1835-1908) نے اپنی نبوت کا دعوی کیا تھا۔ مرزا صاحب لکھتے ہیں:

اس جگہ ہم اس بات کا لکھنا بے محل نہیں سمجھتے کہ الہام اور کشف کی حجت اور دلیل ہونے کے قائل اگرچہ بعض خشک متکلمین اور اصولی نہ ہوں لیکن ایسے تمام محدث اور صوفی جو معرفت کامل اور تفقہ تام کے رنگ سے رنگین ہوئے ہیں، بذوق تمام قائل ہیں۔۔۔۔

امام (عبدالوہاب شعرانی) اپنی کتاب میزان کے صفحہ 13 میں فرماتے ہیں کہ صاحب کشف مقام یقین میں مجتہدین کے مساوی ہوتا ہے اور کبھی بعض مجتہدین سے بڑھ جاتا ہے کیونکہ وہ اسی چشمہ سے چلو بھرتا ہے جس سے شریعت نکلتی ہے۔

اور پھر امام صاحب اس جگہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ صاحب کشف ان علوم کا محتاج نہیں جو مجتہدوں کے حق میں ان کی صحت اجتہاد کے لیے شرط ٹھہرائے گئے ہیں اور صاحب کشف کا قول بعض علماء کے نزدیک آیت اور حدیث کے مانند ہے۔

پھر صفحہ 33 میں فرماتے ہیں کہ بعض حدیثیں محدثین کے نزدیک محل کلام ہوتی ہیں مگر اہل کشف کو ان کی صحت پر مطلع کر دیا جاتا ہے۔۔۔۔

شیخ محی الدین ابن عربی نے جو فتوحات میں اس بارے میں لکھا ہے، اس میں سے بطور خلاصہ یہ مضمون ہے کہ اہل ولایت بذریعہ کشف آنحضرت صلعم [صلی اللہ علیہ وسلم] سے احکام پوچھتے ہیں اور ان میں سے جب کسی کو کسی واقعہ میں حدیث کی حاجت پڑتی ہے تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہو جاتا ہے۔ پھر جبرائیل علیہ السلام نازل ہوتے ہیں اور آنحضرت جبرائیل سے وہ مسئلہ جس کی ولی کو حاجت ہوتی ہے، پوچھ کر اس ولی کو بتا دیتے ہیں۔ یعنی ظلی طور پر وہ مسئلہ بہ نزول جبرائیل منکشف ہو جاتا ہے۔ پھر شیخ ابن عربی نے فرمایا کہ ہم اس طریق سے آنحضرات صلعم [صلی اللہ علیہ وسلم] سے احادیث کی تصحیح کرا لیتے ہیں۔ بہتیری حدیثیں ایسی ہیں جو محدثین کے نزدیک صحیح ہیں اور ہمارے نزدیک صحیح نہیں اور بہتیری حدیثیں موضوع ہیں اور آنحضرت کے قول سے بذریعہ کشف صحیح ہو جاتی ہیں۔ تم کلام۔[7]

ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ کشف و الہام کے وجود سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے مگر کشف و الہام کے اللہ تعالی کی جانب سے ہونے پر یقین ایسا امر ہے جو صرف اور صرف کسی پیغمبر ہی کو ہو سکتا ہے۔ کوئی بھی غیر نبی، اگر اس بات کا یقین سے دعوی کرے کہ اس کا کشف اللہ تعالی کی طرف سے ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نبوت کا نام لیے بغیر اس کا دعوی کر رہا ہے۔ مرزا صاحب اس معاملے میں ذرا زیادہ نمایاں ہو گئے کہ انہوں نے نبوت کا باقاعدہ نام لے کر اس کا دعوی کر دیا۔ اگر وہ نبوت کا نام نہ لیتے اور ولایت کے نام پر اپنا سلسلہ چلا لیتے تو ان کے مریدین کی تعداد کہیں زیادہ ہوتی۔

مرشد کا کلمہ

بعض صوفیاء کا یہ خیال ہوتا ہے کہ ان کے مرشد کی شکل میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں۔ شیخ عبد الکریم جیلی (-767 826/1365-1423) کی کتاب "انسان کامل" میں یہ بات درج ہے کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مرشد کی شکل میں تشریف لائے ہیں تاہم انہوں نے خود اس کی وضاحت فرما دی ہے کہ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تجلیات انہیں ان کے مرشد سے ملتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض صوفیا کے بارے میں منقول ہے کہ وہ اپنے مریدوں سے اپنا کلمہ پڑھواتے ہیں۔ تذکرہ غوثیہ، جو کہ شیخ محمد غوث گوالیاری (d. 969/1562) کے ملفوظات پر مشتمل ہے، میں یہ واقعہ درج ہے:

> ایک روز ارشاد ہوا کہ حضرت ابو بکر شبلی علیہ الرحمہ کی خدمت میں دو شخص بہ ارادہ بیعت حاضر ہوئے۔ ان میں سے ایک کو فرمایا کہ کہو لا الہ الا اللہ شبلی رسول اللہ۔ اس نے کہا: لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ آپ نے بھی یہی کلمہ پڑھا۔ اس نے پوچھا: آپ نے لاحول کیوں پڑھی۔ آپ نے استفسار کیا کہ تم نے کیوں پڑھی؟ بولا کہ میں نے تو اس واسطے پڑھی کہ ایسے بے شرع کے پاس مرید ہونے آیا۔ آپ نے فرمایا کہ ہم نے اس لیے پڑھی کہ ایسے جاہل کے سامنے راز کی بات کہہ دی۔ اس کے بعد دوسرے شخص کو بلایا اور وہی فرمایا کہ کہو لا الہ الا اللہ شبلی رسول اللہ۔ اس نے جواب دیا کہ حضرت میں تو آپ کو کچھ اور ہی سمجھ کے آیا تھا۔ آپ تو ورے ہی گر پڑے، رسالت ہی پر قناعت کی۔ آپ نے ہنس کر فرمایا کہ اچھا تم کو تعلیم کریں گے۔
>
> پس ہر شخص کا مہم و حوصلہ جدا ہوتا ہے، ورنہ بات ایک ہی تھی جو ایک کے دل میں نہ سمائی اور انکار پیدا کیا، دوسرے کا حوصلہ اس بات سے بھی اعلی تھا۔ حضرت شبلی کا یہ مطلب نہ تھا جو شخص ظاہر بیں نے سمجھا۔ بات یہ تھی کہ جو شخص تعلیم و تلقین اور ہدایت و ارشاد کرتا ہے، طالب کے لیے وہی رسول ہے اور رسالت الہی کا کام انجام دیتا ہے۔[8]

اس سے ملتا جلتا ایک واقعہ مشہور دیوبندی عالم مولانا اشرف علی تھانوی (1863-1943)، جنہوں نے تصوف کی تجدید کی کوشش کی تھی، سے منسوب ہے۔ ان کے ایک مرید اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں:

> ایک دفعہ ریاست رام پور جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں ایک مسجد میں ایک مولوی صاحب جو طالب علم تھے کے پاس ٹھہرنے کا اتفاق ہوا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ مولوی صاحب حضور [اشرف علی] سے بیعت یافتہ ہیں۔ اس طرح ان سے اور بھی محبت ہو گئی تو اثنائے گفتگو معلوم ہوا کہ ان کے پاس تھانہ بھون سے دو رسالے الامداد اور حسن العزیز بھی ماہوار آتے ہیں۔ بندہ نے ان کے دیکھنے کی درخواست کی تو ان طالبعلم مولوی صاحب

نے مجھ کو دیکھنے کے واسطے دے دیئے۔ الحمدللہ جو لطف ان سے اٹھایا بیان سے باہر ہے۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ حسن العزیز دیکھ رہا تھا اور دوپہر کا وقت تھا کہ نیند نے غلبہ کیا اور سو جانے کا ارادہ کیا رسالہ حسن العزیز کو ایک طرف رکھ دیا لیکن جب بندہ نے دوسری کروٹ بدلی تو دل میں خیال آیا کہ کتاب کو پشت ہو گی اس لئے رسالہ حسن العزیز کو اٹھا کر اپنے سر کی جانب رکھ لیا اور سو گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد خواب دیکھتا ہوں کہ کلمہ شریف لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھتا ہوں لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ حضور [اشرف علی] کا نام لیتا ہوں اتنے میں دل کے اندر خیال پیدا ہوا کہ تجھ سے کلمہ شریف پڑھنے میں غلطی ہوئی، اس کو صحیح پڑھنا چاہیے۔ اس خیال سے دوبارہ کلمہ شریف پڑھتا ہوں دل پر تو یہ ہے کہ صحیح پڑھا جائے لیکن زبان پر بے ساختہ بجائے رسول اللہ کے نام کے اشرف علی نکل جاتا ہے۔

حالانکہ مجھ کو اس بات کا علم ہے کہ اس طرح درست نہیں لیکن بے اختیار زبان سے یہی کلمہ نکلتا ہے دو تین بار جب یہی صورت ہوئی تو حضور [اشرف علی] کو اپنے سامنے دیکھتا ہوں اور بھی چند شخص حضور کے پاس تھے لیکن اتنے میں میری یہ حالت ہو گئی کہ میں کھڑا کھڑا بوجہ اس کے کہ رقت طاری ہو گئی، زمین پر گر گیا اور نہایت زور کے ساتھ چیخ ماری اور مجھ کو معلوم ہوا کہ میرے اندر کوئی طاقت باقی نہیں رہی۔ اتنے میں بندہ خواب سے بیدار ہو گیا لیکن بدن میں بدستور بے حسی تھی اور وہ اثر ناطاقتی بدستور تھا لیکن حالت خواب اور بیداری میں حضور ہی کا خیال تھا لیکن بیداری میں کلمہ شریف کی غلطی پر جب خیال آیا تو اس بات کا ارادہ ہوا کہ اس خیال کو دل سے دور کیا جائے اس واسطے کہ پھر کوئی ایسی غلطی نہ ہو جائے بایں خیال بندہ بیٹھ گیا اور پھر دوسری کروٹ لیٹ کر کلمہ شریف کی غلطی کے تدارک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھتا ہوں لیکن پھر بھی یہ کہتا ہوں۔ اللهم صل على سيدنا و نبينا و مولانا أشرف علي۔ حالانکہ بیدار ہوں، خواب نہیں لیکن بے اختیار ہوں، زبان اپنے قابو میں نہیں اس روز ایسا ہی کچھ خیال رہا تو دوسرے روز بیداری میں رقت رہی۔ خوب رویا اور بھی بہت سی وجوہات ہیں جو حضور کے ساتھ باعث محبت ہیں کہاں تک عرض کروں۔"

وہ لکھتے ہیں کہ جب انہوں نے اپنا خواب اپنے مرشد مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کو بتایا تو انہوں نے اسے ایک شیطانی خواب قرار دینے کی بجائے یہ کہا:

اس واقعہ میں تسلی تھی کہ جس طرف تم رجوع کرتے ہو [یعنی خود مولانا] وہ بعونہ تعالیٰ متبع سنت ہے [یعنی اللہ کی مدد سے سنت کا پیروکار ہے۔][9]

ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ کشف اور الہام اعتبار کی چیز ہر گز نہیں ہیں۔ یہ شیطان کی جانب سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس وجہ سے اسے ہر حال میں شریعت پر پیش کیا جائے گا، اگر مطابق شریعت ہو تو اسے قبول کیا جائے گا ورنہ مسترد کر دیا جائے گا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ مشہور صوفی ریاض احمد گوہر شاہی صاحب (1941-2002)، جنہوں نے کشف و الہام ہی کی بنیاد پر ایک صوفی تحریک کی بنیاد رکھی ہے، نے بھی یہی نقطہ نظر بیان کیا ہے:

طالب حق کے لئے ہر حال میں شریعت کی پابندی ضروری ہے۔ بعض آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جو کسی کامل کی مدد سے محروم رہتے ہیں بعض کے دلوں پر اللہ تعالیٰ کی مہر لگی ہوتی ہے انہیں یہ عمل کرنے سے کوفت ہوتی ہے دوران عمل شیطانی خیالات میں گھر جاتا ہے اور خوف آنے لگتا ہے ایسے حضرات کو چاہیے کہ اس کے مقابلہ میں کوئی اچھا شگون نہ ملے تو اس عمل کو ترک کر دیں ورنہ نقصان کا اندیشہ ہے کیونکہ ہر شجر باثمر نہیں اور ہر بوٹی کیمیاء نہیں ہے۔

جب طالب حق اس عمل سے بڑھتا ہے تو اسے خواب یا کشف ہونے لگتا ہے تو کبھی شہیدوں کی ارواح یا اولیاء کے جُسوں یا ملائک کی طرف سے خوشخبری کا اشارہ ہوتا ہے اور کبھی شیاطین ان کے روپ میں اشارہ کرتے ہیں جسے ابتداء میں طالب نہیں سمجھ سکتا اکثر انہی اشاروں کو صحیح سمجھ کر راتوں رات بغیر تزکیہ و تصفیہ کے ولی بن جاتے ہیں۔ اور جھوٹے دعووں سے رُجوعات خلق اور غلط الہامات یا اشاروں سے تکبر و حرص اور گمراہی میں پھنس کر خاتمہ ایمان ہو جاتا ہے۔

ایسے موقعہ پر طالب حق کو چاہیے کہ جو بھی اشارہ شریعت کے خلاف ہو تو اس پر قطعاً عمل نہ کرے اسی میں سلامتی ہے۔ شیطان ہر ولی کی شکل، ہر دربار حتیٰ کہ سیاروں اور ستاروں کی بھی شکل میں آسکتا ہے لیکن صرف تین شکلوں میں نہیں آسکتا۔ اگر ایسا بھی ہو جائے تو دنیا سے حق و باطل کی تمیز اٹھ جائے۔ ایک تو قرآن پاک کی اصل میں، لیکن قرآن مجید کی طرح موٹی کتاب بن سکتا ہے اور عربی میں بجائے آیات شریفہ کے کوئی اور تحریر ہوگی۔ دوسرا خانہ کعبہ کی اصلی شکل میں نہیں آسکتا لیکن مصنوعی خانہ کعبہ بنا کر دھوکہ دے سکتا ہے۔ تیسرا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلی شکل میں نہیں آسکتا مگر تمیز وہی کر سکتا ہے جس نے اس سے قبل بھی خواب یا مراقبہ مکاشفہ میں دیدار سے شرف حاصل کیا ہو۔

جس کو یہ ملکہ حاصل نہیں، وہ دھوکہ کھا سکتا ہے بلکہ اس زمانہ میں ہزاروں لوگ دھوکہ کھا کر ولی بن بیٹھے ہیں۔ جیسا کہ مُلاّ جیون کا خواب کہ میں نے تین دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تھانوی کی شکل میں دیکھا۔ (صدق الرویاء) یا مولوی حسین علی کا خواب کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پل صراط سے گرنے سے بچا لیا۔ (بلغة الحیران) اور ! یہ لوگ اسی حدیث شریف کے حوالہ سے مطمئن ہیں کہ: من راٰنی فقد راءی الحق۔ یعنی "جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے سچ مچ دیکھا کیونکہ شیطان میری شکل میں نہیں آسکتا۔" (بخاری و مسلم)

یہ حدیث شریف آپ نے صحابہ کرام کو ارشاد فرمائی کیونکہ وہ بچشم دید مشاہدہ سے مشرف تھے۔ انہوں نے جب بھی خواب میں دیدار کیا سچ کیا لیکن جن لوگوں کو یہ شرف حاصل نہیں تو وہ خواب میں کیسے تمیز کر سکیں گے!"[10]

ظاہری و باطنی علوم کا تصور

صوفیاء کا نقطہ نظر

صوفیاء کے ہاں ظاہر اور باطن کے فرق کا تصور موجود ہے۔ اس کا مطلب وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ قرآن و حدیث کا ایک ظاہری معنی ہے جو کہ اس کے الفاظ سے نکلتا ہے۔ اس کی حیثیت محض چھلکے کی سی ہے۔ اس کے علاوہ ان کا ایک باطنی معنی بھی ہے جو کہ اصل مغز ہے۔ مشہور صوفی، مولانا جلال الدین رومی (603-671/1207-1273) کا ایک شعر ہے جو ان کی مشہور زمانہ مثنوی میں درج ہے:

من ز قرآن مغز ابر داشتم۔۔۔۔۔۔استخوان بیش سگاں انداختم

یعنی میں نے قرآن سے مغز [اصل مطالب] اخذ کر لیے ہیں اور جو ہڈیاں بچ گئی ہیں وہ میں نے کتوں [ظاہری علماء] کے آگے پھینک دی ہیں۔

صوفیاء کا یہ دعوی ہے کہ یہ معنی ظاہری الفاظ سے سمجھ میں نہیں آتا بلکہ بذریعہ الہام اولیاء کاملین کے دلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض صوفیاء قرآن مجید کی مختلف تفسیر کرتے ہیں جو کہ اس کی ظاہری تفسیر سے مختلف ہوتی ہے۔ بعض پابند شریعت صوفیاء کہتے

ہیں کہ تفسیر کی دو اقسام ہیں: عالمانہ یا ظاہری تفسیر اور صوفیانہ یا باطنی تفسیر۔

یہی وجہ ہے کہ اکثر صوفیاء کے ہاں قرآن مجید کا استعمال محض تلاوت کر کے ثواب حاصل کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ ان کے ہاں قرآن مجید کو سمجھ کر ترجمے کے ساتھ پڑھنے سے سختی سے منع کیا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ خبردار! قرآن کو سمجھنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ گمراہ ہو جاؤ گے کیونکہ یہ تمہارا کام نہیں ہے۔ اس کے لیے طویل عرصے تک ظاہری و باطنی علوم حاصل کرنا پڑتے ہیں، پھر قرآن سمجھ میں آتا ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ حدیث کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ صوفیاء میں یہ مقولہ بہت مشہور ہے: **العلم حجاب الاکبر** یعنی علم سب سے بڑا حجاب ہے۔

صوفیاء کے ہاں "علم لدنی" کا تصور عام ہے۔ علم لدنی سے ان کی مراد وہ علم ہوتی ہے جو وہ براہ راست اللہ تعالی سے حاصل کرتے ہیں۔ حضرت خضر علیہ الصلوۃ والسلام سے متعلق قرآن مجید میں **وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا** کے الفاظ آئے ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ "ہم نے انہیں اپنی جانب سے علم سکھایا تھا۔" صوفیاء کا یہ دعوی ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کی طرح ان صوفیاء کو بھی اللہ تعالی سے براہ راست علم لدنی حاصل ہوتا ہے۔ ایک صوفی بزرگ سائیں توکل شاہ انبالوی لکھتے ہیں:

> علم دو قسم کا ہے۔ ایک کسبی دوسرا لدنی۔ کسبی کی مثال ایک جوہڑ کی سی ہے، جس میں جتنا پانی بھر دیا جائے، اسی قدر اس میں رہے گا۔ لوگ علم پڑھتے ہیں، جتنا پڑھتے ہیں، اسی قدر رہتا ہے اور یہ مسائل بتاتے ہیں تو اسی میں سے دیکھ کر بتاتے ہیں۔ اور علم لدنی کی مثال ایک چشمہ کی سی ہے، جس میں سے نہر کاٹ لی جائے، تو اب اس میں سے خود پیو، جانوروں کو پلاؤ، خواہ کسی جگہ صرف کرو، پانی اس میں سے کم نہیں ہوتا۔ یعنی جب دل کی طاق کھل جاتی ہے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایک نور کا منبع دل میں آتا ہے اور خود بخود ساری باتیں دل کے اندر سے اس کی سمجھ میں آتی رہتی ہیں۔ کسی سے پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ پھر فقیر، مولویوں سے نہیں بلکہ اپنے دل سے فتوی لیتا ہے۔ [11]

دیوبندی صوفی، مولانا اللہ یار خان لکھتے ہیں:

> صوفیائے کرام میں فقہاء مجتہدین کے مقابلہ میں ایک قوت زائد ہوتی ہے کہ وہ صاحب کشف و الہام ہوتے ہیں۔ فقہاء محض ذاتی رائے سے مسائل کا استخراج کرتے ہیں اور یہ لوگ کشف و الہام کی روشنی میں اور کشف و الہام، اعلام و اطلاع من اللہ ہوتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اعلام من اللہ محض ذاتی رائے سے افضل ہے۔ جس طرح قیاس ورائے کی صحت کا معیار یہ ہے کہ کتاب و سنت کے مخالف نہ ہو، اسی طرح کشف و الہام کی صحت کا معیار بھی کتاب و سنت کی موافقت ہے۔ بہر حال اس کی فوقیت مسلم ہے۔۔۔۔ میں ذاتی طور پر فقہائے مجتہدین کے اجتہاد کو صوفیاء کے کشف و الہام پر مقدم سمجھتا ہوں۔ اس کی دلیل صوفیاء کا تعامل ہے۔ تمام صوفیاء محققین، مجتہدین کے مقلد رہے ہیں۔ پس فقیہ کے اجتہاد کا مقدم ہونا ثابت ہو گیا۔ [12]

بہت سے صوفیاء یہ دعوی کرتے ہیں کہ ان کی ملاقات حضرت خضر علیہ الصلوۃ والسلام سے ہوئی اور انہوں نے علم لدنی ان صوفیاء کو منتقل کیا۔ بعض صوفیاء تو اس حد تک دعوی کرتے ہیں کہ حضرت خضر خود انہیں ڈھونڈتے ہوئے ان تک پہنچے۔ اسی باطنی علم کی بنیاد پر صوفیاء قرآن مجید اور احادیث کی تفسیر، علماء سے مختلف کرتے ہیں۔ بعض صوفیاء براہ راست اللہ تعالی یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث

روایت کرتے ہیں۔ ان میں بعض تو محدثین اور ان کی کتب سے احادیث اخذ کرنے ہی کو غلط قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مردوں کی بجائے زندہ خدا سے براہ راست حدیث روایت کرو۔ ابن عربی (1240-1164/638-558) کی کتاب فتوحات مکیہ میں درج ہے:

قال أبو يزيد البسطاميّ رضي الله عنه في هذا المقام وصحته يخاطب علماء الرسوم أخذتم علمكم ميتاً عن ميت وأخذنا علمنا عن الحيّ الذي لا يموت يقول أمثالنا حدثني قلبي عن ربي وأنتم تقولون حدثني فلان وأين هو قالوا مات عن فلان وأين هو قالوا مات وكان الشيخ أبو مدين رحمه الله إذا قيل له قال فلان عن فلان عن فلان يقول ما نريد نأكل قديداً هاتوا ائتوني بلحم طريّ يرفع همم أصحابه هذا قول فلان أيّ شيء قلت أنت ما خصك الله به من عطاياه من علمه اللدني أي حدثوا عن ربكم واتركوا فلاناً وفلاناً فإن أولئك أكلوه لحماً طرياً والواهب لم يمت وهو أقرب إليكم من حبل الوريد والفيض الإلهيّ والمبشرات ما سد بابها وهي من أجزاء النبوّة والطريق واضحة.

ابویزید بسطامی اس مقام اور اس کی صحت کے بارے میں ظاہری علماء کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں: تم نے اپنا علم [حدیث] مردوں سے حاصل کیا اور ہم اپنا علم زندہ [خدا] سے حاصل کرتے ہیں جو کبھی نہ مرے گا۔ ہمارے قول کی مثال یہ ہے: "میرے دل نے میرے رب سے حدیث روایت کی" اور تم کہتے ہو: "فلاں نے فلاں کے حوالے سے مجھ سے حدیث بیان کی۔" جب پوچھا جائے کہ وہ فلاں کہاں ہے تو وہ کہتے ہیں، وہ تو مر گیا۔ پھر وہ دوسرا فلاں کہاں ہے، تو کہتے ہیں کہ وہ بھی مر گیا۔

شیخ ابو مدین سے جب کہا جاتا تھا کہ فلاں نے فلاں سے روایت کی تو وہ کہتے تھے: بھئی ہم مردار کا گوشت نہیں کھاتے، ہمارے لیے تو تازہ گوشت لاؤ۔ وہ اپنے ساتھیوں کی ہمت بڑھاتے ہوئے کہتے تھے: یہ کہنا کہ "یہ فلاں کا قول ہے" کیا چیز ہے۔ میں کہتا ہوں کہ تم تو وہ ہو جنہیں اللہ نے اپنے علم لدنی کی عطا سے مخصوص کیا ہے۔ یعنی تم اپنے رب سے حدیث روایت کیا کرو اور فلاں اور فلاں کی روایتوں کو چھوڑ دو۔ اس طرح تم تازہ گوشت کھاؤ گے۔ عطا کرنے والا [اللہ] کبھی نہیں مرے گا اور وہ تمہاری شہ رگ سے زیادہ قریب ہے۔ اللہ کا فیض اور مبشرات کا دروازہ بند نہیں ہے اور وہ نبوت کے اجزاء میں سے ہے اور ایک واضح طریقہ ہے۔[13]

تصوف کی بنیادی کتاب "قوت القلوب" میں حضرت جنید بغدادی (910-830/297-214) سے منسوب یہ قول درج ہے:

أحب للمبتدي أن لا يشتغل قلبه وإلا تغيرت حاله: الكسب وطلب الحديث والتزوج وأحب للصوفي أن لا يقرء ولا يكتب.

مبتدی [ابتدائی درجے کے صوفی] کے لیے مستحب ہے کہ اس کا دل تین چیزوں میں مشغول نہ ہو ورنہ اس کے حال میں تغیر ہو جائے گا: کمائی کرنا، علم حدیث طلب کرنا اور نکاح کرنا۔ صوفی کے لیے یہ بھی پسندیدہ ہے کہ وہ لکھنا پڑھنا ترک کر دے۔[14]

واضح رہے کہ تمام صوفیاء کا یہ نقطہ نظر نہیں ہے۔ بہت سے صوفیاء ایسے بھی ہیں جو قرآن و حدیث کی پوری تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ مخالف شریعت صوفیاء ہی زیادہ تر قرآن و حدیث کی تعلیم سے منع کرتے ہیں۔

بہت سے صوفیاء کا یہ دعوی بھی ہے کہ ان کی نظر لوح محفوظ پر ہوتی ہے اور وہ وہاں سے تمام معلومات نہ صرف حاصل کر لیتے ہیں بلکہ اللہ تعالی کے فیصلوں میں بھی ان کی دعا سے تبدیلی ہو جاتی ہے۔ مولانا روم لکھتے ہیں:

لوح محفوظ است پیش اولیا۔۔۔۔۔ از چہ محفوظ است محفوظ از خطا

حال تو دانند یک یک مو بہ مو۔۔۔۔۔۔ زانکہ پر ستند از اسرار ہو

بلکہ پیش از دادن تو سال ہا۔۔۔۔۔۔۔ دیدہ باشند ت بچندیں سالہا

لوح محفوظ اولیاء کے سامنے ہوتی ہے، وہ کس چیز سے محفوظ ہے؟ وہ خطاء سے محفوظ ہے [اولیاء سے نہیں]۔ یہ اولیاء تیرے ایک ایک لمحہ اور بال کا حال جانتے ہیں کیونکہ وہ اللہ سے اسرار پوچھ سکتے ہیں بلکہ حال انہوں نے سالہاسال پہلے تمہاری پیدائش سے پہلے ہی دیکھ لیا ہوتا ہے۔

ناقدین تصوف کی تنقید

ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ اگر صوفیاء کی اس ظاہری اور باطنی تقسیم کے دعوی کو درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر قرآن و سنت کے ظاہری الفاظ کی بھی کوئی اہمیت باقی نہیں رہ جاتی ہے اور صوفی اپنے کشف یا الہام کی بنیاد پر اس کی تاویل و توجیہ کر سکتا ہے۔ اس کے بعد قرآن و حدیث کے ظاہری الفاظ کی کوئی اہمیت باقی نہ رہے گی اور ہر صوفی کشف اور الہام کی بنیاد پر ان کی من مانی تاویلات کرے گا۔ کشف و الہام ایسی چیز ہیں جن میں شیطانی اثرات شامل ہو سکتے ہیں اور ایک شخص دوسرے کے کشف کو کسی طرح بھی چیک نہیں کر سکتا ہے۔ اس کے بعد یہی ہو گا کہ دین بازیچہ اطفال بن کر رہ جائے گا اور کشف او ر صوفیت کے نام پر گمراہیوں کا دروازہ کھل جائے گا۔ ڈاکٹر طارق عبد الحلیم اور محمد العبدہ لکھتے ہیں:

> [شریعت، طریقت اور حقیقت کی] ان اصطلاحات کو صوفیاء بار بار دوہراتے ہیں اور انہیں اپنی دیگر اصطلاحات ظاہر و باطن سے لاحق کر دیتے ہیں۔۔۔ شریعت ان کی نگاہ میں عملی اور تکلیفی احکام کے مجموعے کا نام ہے جسے فقہ اسلامی کہتے ہیں اور حقیقت [طریقت] ان احکام سے ورے اسرار و رموز کا نام ہے۔ فقہاء لوگوں کو نماز کے ارکان اور سنتیں سکھاتے ہیں جبکہ صوفیاء دل کے افعال جیسے محبت و خشیت کا اہتمام کرتے ہیں۔ یہ معتدل صوفیاء کی رائے ہے۔
>
> غالی صوفیاء کہتے ہیں کہ یہ احکام عام مسلمانوں کے لیے ہیں جن کی عقلیں اور دل معانی علویہ کا ادراک چند مخصوص شعائر اور اشکال کی پابندی کے بغیر نہیں کر سکتے۔ جیسے نماز پانچ مرتبہ ایک خاص شکل اور ترتیب سے پڑھی جاتی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کچھ اساتذہ اپنے طلباء پر کچھ درسی ذمہ داریاں عائد کرتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کے طلباء ایسا کیے بغیر ان سے علمی استفادہ نہیں کر سکیں گے۔ مقصد علم ہوتا ہے تو اگر کچھ خواص شرائع کے بنیادی مقصد یعنی [حقیقت و طریقت] کا ادراک رکھتے ہوں تو مقصد حاصل ہو رہا ہے، انہیں نماز کی پابندی کی ضرورت نہیں۔ نماز اللہ سے تعلق کا ذریعہ ہے، اگر یہ تعلق ہمیشہ برقرار رہتا ہو تو نماز کی ضرورت صرف شرعی احکامات کے احترام کے اعتبار سے رہ جاتی ہے، اس کا کوئی فائدہ حاصؒل نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض صوفیاء نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ حقیقت کا ادراک رکھنے والے سے تمام شرعی ذمہ داریاں ساقط ہو جاتی ہیں۔
>
> شریعت و طریقت میں فرق ہی اس انحراف کی ابتداء ہے جبکہ اہل السنۃ کے نزدیک شریعت ہی حقیقت و طریقت ہے۔ نماز اگرچہ مخصوص حرکات کا نام ہے لیکن خشیت و انابت کا بھی ذریعہ ہے۔ ایسے دیگر تمام احکامات شرعیہ ہیں جبکہ انہیں مکمل طور پر اس طرح ادا کیا جائے جیسا اللہ چاہتا ہے۔
>
> اس چیز نے صوفیاء کو ایک دوسری اصطلاح، ظاہر اور باطن پر شیر کر دیا۔ صوفیاء نے دعوی کیا کہ قرآن کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے۔ ظاہر وہ ہے جو اس کے الفاظ سے فہم عربی اور سیاق و سباق اور دیگر تفسیری اصول کے مطابق لیا جائے۔ اس کا اہتمام علمائے ظاہر کرتے ہیں جنہیں صوفیاء

بطور تحقیر "رسمی علماء" کہتے ہیں۔ باطن ان الفاظ کے پیچھے مخفی علم ہے۔ حقیقی مراد وہی ہے، ان پر صرف بلند مقام والے خواص [خاص لوگ] ہی مطلع ہوتے ہیں جنہیں صوفیاء [اشارات یعنی باطنیات] کہتے ہیں۔ یہ فقہاء دین پر تنقید کرتے ہیں کہ وہ اعمال قلوب کا اہتمام نہیں کرتے۔

جب ان میں سے کسی سے زکوۃ کا نصاب [یعنی شرح] پوچھا جائے تو کہتا ہے کہ عوام کے لیے چالیسواں حصہ ہے اور ہم پر سارا خرچ کرنا فرض ہے۔[15]

علامہ ابن قیم (691-751/1292-1350) لکھتے ہیں:

ان میں سے ہر طبقہ دعوی کرتا ہے کہ اس کا علم، علم لدنی ہے اور وہ ایمان و سلوک کے حقائق، اور اسماء وصفات کے بارے میں جو پسند آئے، گفتگو کرنے لگتا ہے۔ شیطان اس کے دل میں یہ خیال ڈال دیتا ہے کہ اس کا علم تو لدنی ہے۔ [حلول و] اتحاد کے قائل ملحد اور ایسے زندیق جو کہ سلوک سے اپنی نسبت کرتے ہیں کہتے ہیں کہ ان کا علم، لدنی ہے۔۔۔۔ اللہ تعالی نے ایسے لوگوں کی سخت مذمت فرمائی ہے جو اس کی جانب ایسی بات منسوب کرتے ہیں جو کہ اس کی جانب سے نہیں ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالی نے فرمایا: "وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے جبکہ یہ اللہ کی جانب سے نہیں ہے۔ وہ اللہ سے متعلق جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہیں۔[16]

ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ شریعت و طریقت اور ظاہر و باطن کے اس فرق کو مان لینے کا لازم نتیجہ یہ ہے کہ انسان قرآن و سنت اور شریعت کی تحقیر کرے، ان کی من مانی تاویلات کرے اور اصل اہمیت باطن کو قرار دے۔ مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ شیخ الاسلام [ابو اسماعیل ہروی] نے شریعت کے علم کو کشف، مشاہدہ اور الہام کے ذریعہ سے حاصل ہونے والے علم کے مقابل میں حصول معرفت کے نقطہ نظر سے فروتر [کمتر] ٹھہرایا ہے، حالانکہ یہ بات بالبداہت غلط ہے۔ علم شریعت کی بنیاد وحی پر ہے اور وحی میں کسی وہم، کسی وسوسہ، کسی نفسانی خیال آرائی اور کسی شیطانی در اندازی کا کوئی امکان نہیں ہے کیونکہ انبیاء بالکل معصوم ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جس علم کی بنیاد وجدان اور کشف و مشاہدہ یا الہام وغیرہ پر ہو، اس میں ہر قسم کی شیطانی اور نفسانی مداخلت کا امکان ہوتا ہے کیونکہ کسی بڑے سے بڑے عارف اور کسی بڑے سے بڑے صوفی کے متعلق بھی عصمت کا دعوی نہیں کیا جا سکتا۔

شیخ الاسلام نے علم لدنی کے بارہ میں نہ صرف یہ دعوی کیا ہے کہ وہ فکر و استنباط سے بالاتر ہے بلکہ اس کو بجائے خود دلیل کی حیثیت دے ڈالی ہے۔ جس کے معنی یہ ہے کہ اس کی صحت و صداقت کسی دوسری دلیل کی تصدیق و تائید کی محتاج نہیں رہی۔ جس طرح ایک نبی کو وحی کے ذریعہ سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے، اس کی تصدیق و تائید کے لیے وہ کسی خارجی شہادت کا محتاج نہیں رہتا۔ اسی طرح ایک عارف بھی اپنے وجدان یا اپنے کشف یا مشاہدہ یا الہام کے ذریعہ سے جو علم لدنی پاتا ہے، اس کو کسی اور کسوٹی پر اس کو جانچنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بلکہ جیسا کہ شیخ الاسلام نے فرمایا ہے "اس کا وجود ہی اس کی سند ہے۔"

ہمارے نزدیک شیخ الاسلام کی یہ بات دین میں ایک شدید قسم کا فتنہ ہے۔ علم خفی ہو یا علم لدنی، اس کو بجائے خود دلیل تسلیم کر لینے کے معنی تو یہ ہوئے کہ عارفین کو انبیاء کا درجہ دے دیا جائے اور ان کے کشف و مشاہدہ اور ان کے الہام کو بالکل ہم پایہ وحی بنا دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات کسی شخص کے لیے اسلام پر قائم رہتے ہوئے تسلیم کرنا ناممکن ہے، کشف و الہام کے ذریعہ سے علم کے حصول کے ہم منکر نہیں ہیں لیکن یہ علم قابل قبول صرف اسی حالت میں ہونا چاہیے جب یہ شریعت کے مطابق ہو۔ اگر یہ شریعت کے خلاف ہو تو لازماً یہ شیطانی وسوسہ ہے اور اسکو قبول کر لینا دیدہ دانستہ اپنی باگ شیطان کے ہاتھ میں دے دینا ہے۔"[17]

کیا کشف سے حاصل کردہ علم قطعی ہوتا ہے؟

ناقدین تصوف مزید کہتے ہیں کہ کشف و الہام سے حاصل ہونے والا علم کبھی بھی قطعی نہیں ہوتا۔ بہت مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان کو اپنے ماحول سے جو معلومات ملتی ہیں، اسے کشف میں بھی وہی نظر آجاتی ہیں۔ یہاں ایک مثال پیش کی جارہی ہے۔

جدید سائنسی تحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ سورج نظام شمسی کا مرکز ہے اور بالترتیب عطارد، زہرہ، زمین، مریخ، مشتری، زحل، یورینس، نیپچون اور پلوٹو اس کے گرد گردش کرتے ہیں۔ یہ جدید سائنس کی دریافت ہے۔ دور قدیم میں نظام شمسی کا تصور کچھ مختلف تھا۔ بڑے بڑے فلسفی اور سائنسدان یہ سمجھا کرتے تھے کہ زمین کائنات کا مرکز ہے اور سورج، چاند اور تمام سیارے اس کے گرد گردش کرتے ہیں۔ مشہور صوفی عبدالکریم الجیلی (767-826/1365-1423) نے اپنی کتاب "الانسان الکامل فی معرفۃ الاواخر و الاوائل" میں اسی تصور کو بیان کیا ہے۔ یہ کتاب تصوف کی "امہات کتب" میں سے ہے۔ اس کتاب میں کائنات کی ایک ڈایاگرام دی گئی ہے جو کہ سات آسمانوں پر مشتمل ہے۔ یہ کچھ یوں ہے:
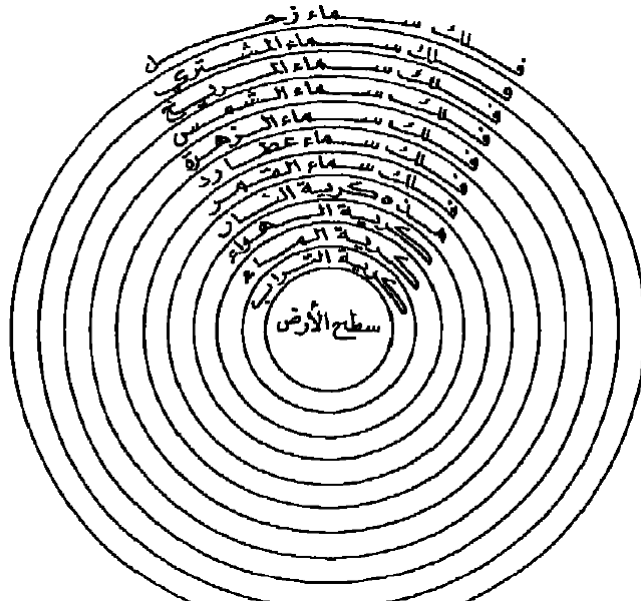
فاضل مصنف بیان فرماتے ہیں کہ کائنات کا مرکز زمین ہے۔[18] سطح زمین کے اوپر مٹی کا کرہ ہے، اس کے اوپر پانی کا، اس کے اوپر ہوا کا، پھر اس کے اوپر آگ کا۔ جہاں آگ کا دائرہ ختم ہوتا ہے، وہاں سے پہلا آسمان شروع ہوتا ہے جو کہ چاند کا مدار (Orbit) ہے۔ اس کے اوپر عطارد (Mercury) کا مدار ہے جو کہ دوسرا آسمان ہے۔ پھر زہرہ (Venus)، سورج (Sun)، مریخ (Mars)، مشتری (Jupiter) اور زحل (Saturn) کے مدار ہیں جو کہ علی الترتیب تیسرا، چوتھا، پانچواں، چھٹا اور ساتواں آسمان ہے۔ مصنف یہ دعوی کرتے ہیں کہ ان میں سے ہر ہر آسمان پر ان کی ملاقات فلاں فلاں نبی سے ہوئی اور کس جگہ انہیں کیا نظر آیا۔ لکھتے ہیں:

> جان لیجیے کہ آسمان ایک دوسرے کے گرد محیط ہیں۔ سب سے بڑا آسمان زحل کا ہے اور سب سے چھوٹا آسمان چاند کا ہے جو کہ اس صورت میں ہے [مذکورہ ڈایاگرام۔] ہر مدار اپنے آسمان کے نیچے سے گزرتا ہے اور یہ ایک معنوی چیز ہے اور اسی وجہ سے ہر آسمان کا نام اس پر سب سے زیادہ

واضح ستارے کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اگر ہم اس موضوع پر دقائق، اوقات، گردش، حلول، راستہ اور سیر کو بیان کریں اور اس کے خواص کو بیان کریں تو اس کے لیے کثیر جلدوں پر مشتمل کتاب چاہیے ہو گی لیکن ہم اس سے اعراض کرتے ہیں کہ یہ چیز اللہ تعالی کی معرفت کے لیے ضروری نہیں ہے۔ اس معاملے میں ہم ظاہری اشیاء کو بیان نہیں کرتے سوائے اس کے کہ اسرار الٰہیہ کے تحت کسی رمز کے طور پر بیان کریں جسے اس نے اس چھلکے کا مغز بنایا ہو۔

دوسرا آسمان ایک شفاف لطیف جوہر ہے جس کا رنگ سرخ ہے۔۔۔۔ یہ عطارد کا مدار ہے۔۔۔۔ میں نے نوح علیہ السلام کو اس آسمان پر دیکھا کہ آپ حمد و ثنا کرنے والوں کے درمیان کبریائی نور کے ایک پلنگ پر بیٹھے ہیں۔ میں نے آپ کو سلام کیا۔۔۔۔ تیسرا آسمان زرد رنگ کا ہے اور زہرہ کا آسمان ہے۔۔۔۔ اس آسمان میں یوسف علیہ السلام کا اجتماع ہوتا ہے اور میں نے انہیں نورانی پلنگوں میں سے ایک پلنگ پر بیٹھے دیکھا۔[19]

ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ صوفیا کو کشف میں وہی کچھ نظر آتا ہے جو ان کے ماحول میں ہوتا ہے۔ اگر عبد الکریم الجیلی موجودہ دور میں ہوتے تو شاید انہیں کائنات کا کچھ اور ہی تصور دکھائی دیتا۔ انہیں نظر آتا کہ کائنات صرف انہی چھ سات سیاروں پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ نظام شمسی (Solar System) تو اس کائنات کا محض ایک چھوٹا سا حصہ ہے، کجا یہ کہ ساتوں آسمانوں کو نظام شمسی کا حصہ مان لیا جائے۔ پھر اس میں ان چھ سیاروں کے علاوہ اور بھی سیارے یورانس، نیپچون وغیرہ ہیں۔ سورج زمین کے گرد گردش نہیں کرتا بلکہ زمین ایک سیارہ ہے جو کہ سورج کے گرد گردش کرتا ہے اور زہرہ اور مریخ کے درمیان میں ہے۔ ایسی صورت میں انہیں کشف میں ان آسمانوں اور مداروں کی بجائے کچھ اور نظر آتا۔

ناقدین مزید کہتے ہیں کہ قدیم دور کے صوفیاء کے کشف کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہیں مثلاً یہ دکھائی دیتا ہے کہ وہ اڑنے والے گھوڑے یا کسی اڑن کھٹولے پر بیٹھ کر شیاطین پر تیر چلا رہے ہیں۔ انہیں کبھی دور جدید کے خلائی جہاز اور میزائل نظر نہیں آتے۔ ہو سکتا ہے کہ موجودہ زمانے کے صوفیاء کو کشف میں آج کل کی چیزیں نظر آئیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کشف انسان کے اپنے ماحول، علم اور حالات کے تابع ہے۔ یہ ایک ظنی ذریعہ علم ہے اور اس میں غلطی کا بہت امکان موجود ہے۔

پابند شریعت صوفیاء کا جواب

وہ صوفیاء، جو شریعت کی پابندی کا التزام کرتے ہیں، اس بات کی سختی سے تردید کرتے ہیں کہ وہ ختم نبوت کے قائل نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ اور ان کے بزرگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی مانتے ہیں اور قطعاً یہ نہیں کہتے ہیں کہ کسی بزرگ کا کشف و الہام وحی کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کشف میں شیطانی اثرات کی آمیزش ہو سکتی ہے۔ رہیں اوپر بیان کردہ عبارات تو ان سے متعلق مختلف جوابات دیتے ہیں، جن میں سے یہ اہم ہیں:

عبارات کی تاویل

بعض صوفی عالم ان عبارات کی ایسی توجیہ و تاویل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جس سے عقیدہ ختم نبوت پر حرف نہ آئے۔ کہیں یہ

توجیہ ٹھیک طریقے سے فٹ بیٹھ جاتی ہے اور کہیں صاف محسوس ہوتا ہے کہ کھینچ تان کر بات بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

حالت سکر میں کہی گئی باتیں

بعض صوفیاء کا کہنا یہ ہے کہ ان بزرگوں سے حالت سکر یا استغراق میں ایسی باتیں زبان سے نکل گئیں۔ جب انہیں ہوش آیا تو انہوں نے ان کی تردید کی۔ اس کے جواب میں ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ حالت سکر یا استغراق تو ایسی حالت ہوتی ہے کہ جس میں انسان کو اپنا ہوش نہیں ہوتا۔ پھر ان بزرگوں نے یہ باتیں اپنی تصانیف میں کیسے درج کر دیں؟

الحاقی عبارات

صوفی علماء کے ایک گروہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ عبارات الحاقی ہیں یعنی کسی نے بعد میں ان بزرگوں کی کتب میں ایسی عبارات شامل کر دی ہیں۔ اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ صوفیاء کی کتب حدیث اور فقہ کی کتب کی طرح زیادہ پھیلی ہوئی نہ تھیں۔ مخصوص لوگ ہی انہیں پڑھا کرتے تھے۔ یہ اس دور میں لکھی گئیں جب پرنٹنگ پریس ابھی ایجاد نہ ہوا تھا اور کتاب کی ایک ایک نقل ہاتھ سے تیار کی جاتی تھی۔ بعض مخصوص فرقوں خصوصاً فرقہ باطنیہ کے پیروکاروں نے خود کو صوفی ظاہر کر کے صوفیاء کے حلقوں میں رسائی حاصل کی اور ان کتابوں میں اپنے افکار داخل کر دیے۔ اس نظریے کو ایک صوفی بزرگ پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب، جو علامہ اقبال کے قریبی ساتھی تھے، نے بڑی تفصیل سے اپنے مقالے "اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش" میں گفتگو کی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے مستشرق ڈاکٹر جے این ہالسٹر کی کتاب "شیعان ہند" سے تفصیلی اقتباسات پیش کیے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> قرامطہ [اسماعیلی شیعوں کا ایک ذیلی فرقہ جو اب معدوم ہو چکا ہے] کا یہی طریق کار تھا کہ جس طرح ہو سکے، خصوصاً تصوف کے پردے میں مسلمانوں کے اندر الحاد اور بے دینی کی اشاعت کی جائے، اور اس مقصد میں وہ کامیاب ہو گئے، یعنی انہوں نے تصوف کے پردے میں مسلمانوں کے دلوں میں غیر اسلامی عقائد جاگزیں کر دیے۔۔۔۔
>
> قرامطہ نے صوفیوں اور پیروں کے لباس میں غیر اسلامی عقائد کی تبلیغ کی اور اس طرح غیر اسلامی تصوف عالم وجود میں آ گیا، جس میں تمام غیر اسلامی عقائد مثلاً تثلیث، تجسم، کفارہ، حلول، الوہیت علی، رجعت، بداء، اتحاد، تناسخ ارواح اور قدامت مادہ وغیرہ داخل ہیں۔ عوام بے چارے یہ سمجھے کہ یہ یہی اصلی تصوف ہے جو قرامطہ صوفیوں کے لباس میں پیش کر رہے ہیں۔ اناللہ!
>
> اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ایک طرف قرامطہ نے صوفیوں کے لباس میں مسلمانوں کو غیر اسلامی تصوف سے مانوس کر دیا۔ دوسری طرف مسلمان صوفیوں کی تصانیف میں نہایت چابک دستی کے ساتھ اپنے عائد داخل کر دیے۔ عربی میں اس کو تدسیس کہتے ہیں۔ چنانچہ [مشہور صوفی] امام عبدالوہاب شعرانی نے الیواقیت و الجواہر میں لکھا ہے کہ: "باطنیہ، ملاحدہ اور زنادقہ نے سب سے پہلے امام احمد بن حنبل، پھر امام غزالی کی تصانیف میں اپنی طرف سے تدسیس کی۔ نیز اس فرقہ باطنیہ نے ایک کتاب جس میں اپنے عقائد کی تبلیغ کی تھی، میری زندگی میں میری طرف منسوب کر دی اور میری انتہائی کوشش کے باوجود یہ کتاب تین سال تک متداول [Circulated] رہی۔[20]

چشتی صاحب کے اس نقطہ نظر کو اگر درست مان لیا جائے تو پھر اکابر اہل تصوف پر یہ اعتراض ہی ختم ہو جاتا ہے کہ وہ ختم نبوت کے بعد

بھی اللہ تعالی سے براہ راست رابطے پر یقین رکھتے تھے۔ تاہم موجودہ دور کے صوفیاء کے اندر یہ تصور اس درجے میں پھیلا ہوا ہے کہ انہیں اس بات پر قائل کرنا بہت ہی مشکل کام ہے کہ ان کا یہ عقیدہ ختم نبوت کے تصور سے متصادم ہے اور ان کے بزرگوں کی کتابوں میں یہ باتیں بعد کے اضافے ہیں۔ اگر ان صوفیاء سے یہ بات کہی جائے تو وہ کہنے والے پر کفر کا فتوی عائد کر دیں گے۔ ان عبارات کو ان بزرگوں کی کتب سے نکالنا یا فٹ نوٹ وغیرہ میں انہیں اس سے بری قرار دینا ایک مشکل کام ہے۔ خود چشتی صاحب لکھتے ہیں:

> [باطنیہ نے] تصوف کی کتابوں میں حذف و اضافہ کا "مقدس فریضہ" انجام دے کر لاکھوں مسلمانوں کی گمراہی کا سامان مہیا کر دیا ہے اور ان کی داخل کردہ روایات مرور ایام سے مسلمان صوفیوں کے دماغوں میں اس طرح پیوست ہو چکی ہیں کہ ان کا جدا کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اگر کوئی مسلمان، مسلمانوں کی مجلس میں ان جھوٹی روایات کو جھوٹا کہہ دے تو تمام سنی مسلمان اس کو سنگسار کر دیں گے۔۔۔۔
>
> ان صوفیوں کی کمزوری یہ تھی کہ یہ لوگ نہ محدث تھے، نہ مورخ تھے۔ اس پر مستزاد یہ امر ہوا کہ ان لوگوں کے نزدیک تحقیق و تدقیق و تنقیدی، یہ سب باتیں سوء ادب میں داخل ہو گئی تھیں۔ جنید کا تصوف یہ تھا کہ "ہم ہر بات کو قرآن و سنت کی کسوٹی پر آزما کر دیکھیں گے، اگر کوئی بات کتاب و سنت کے خلاف ہو گی، فھو مردود۔ خواہ وہ کسی کی زبان سے نکلی ہو۔ لیکن نویں صدی ہجری میں باطنیہ کی مساعی قبیحہ سے سنی صوفیوں کی ذہنیت یہ ہو گئی تھی کہ وہ قول کے حسن و قبح کے بجائے قائل کو دیکھنے لگے تھے۔ مثلاً ایک روایت خواہ کتنی ہی خلاف عقل و نقل کیوں نہ ہو، اگر وہ کسی بزرگ سے منسوب ہے تو محض اس سے نسبت کی وجہ سے قابل اعتماد قرار پا جائے گی اور اس میں تحقیق یا اس پر تنقید کو سوء ادب سمجھا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اہل سنت کی کتابوں میں صدیوں سے غلط روایات نقل ہوتی چلی آ رہی ہیں اور آج کسی میں یہ اخلاقی ہمت نہیں ہے کہ انہیں غلط کہہ کر اپنی مرجعیت اور مقبولیت سے دستبردار ہو جائے۔[21]

علامہ رشید رضا مصری (1865-1935) لکھتے ہیں:

> طویل بحث و تمحیص کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان لوگوں کی اکثریت جنہوں نے نصوص شریعت کو بالائے طاق رکھ کر اپنے اقوال و کتب کو مقدم کیا اور وہ صوفیت کا لبادہ اوڑھے تھے، وہ درحقیقت باطنی تھے۔ پھر اکثر مسلمان ان کی حقیقت جانے بنا ان کی تقلید کرنے لگے۔[22]

بعض ناقدین تصوف یہ کہتے ہیں کہ ان کتابوں میں موجود ان عبارات کے سیاق و سباق کو مد نظر رکھا جائے تو ایسا لگتا ہے کہ عبارتیں الحاقی نہیں ہیں بلکہ مصنف کے قلم سے نکلی ہیں۔ اس کے جواب میں عبارات کے الحاقی ہونے کے قائلین کہتے ہیں کہ ایک فنکار ادیب کے لیے ایسا ممکن ہے کہ وہ دوسرے کی باتوں میں ایسی بات گھسا دے جس سے بڑے بڑے ماہر فن بھی اس اضافے کو پکڑ نہ سکیں۔ اگر کسی نے مثلاً سو شعر کہے ہیں، تو اس میں دو چار شعر اسی وزن اور قافیہ پر کہہ کر شامل کرنا ایک ماہر شاعر کے لیے کیا مشکل ہے؟

اسائن منٹس

- کشف و الہام کی بنیاد پر دوسروں کو اپنا نقطہ نظر ماننے پر مجبور کرنا، کیا ختم نبوت کے خلاف ہے؟ فریقین کے دلائل بیان کیجیے۔

- علم لدنی کا معنی کیا ہے؟ کیا علم لدنی کا تصور ختم نبوت سے مطابقت رکھتا ہے؟
- صوفیاء پر ختم نبوت کے انکار کا جو الزام ہے، پابند شریعت صوفیاء اس کا کیا جواب دیتے ہیں؟

---

[1] ابو حامد غزالی(450-505/1058-1111)۔(اردو ترجمہ: سید ممتاز علی1890) المنقذ من الضلال۔ باب طرق الصوفیہ۔

[2] ابو طالب مکی(d. 386/996)۔(تحقیق: عبد المنعم الحفنی) قوت القلوب۔ قاہرہ: دار الرشید(1991)۔ www.4shared.com (ac. 22 Apr 2011)

[3] شہاب الدین سہروردی(543-632/1148-1234)۔(تحقیق: عبد الحلیم محمود اور محمود بن شریف)۔عوارف المعارف. ص207۔ قاہرہ: دار المعارف۔ www.al-mostafa.com (ac. 6 May 2011)

[4] امیر علاء سنجری(ترجمہ: شمس بریلوی)۔ فوائد الفوائد۔ حصہ سوم، تیسری مجلس۔ دہلی: منظور بک ڈپو(1992) www.scribd.com (13 Oct 2011)

[5] حوالہ بالا۔ حصہ سوم، نویں مجلس۔

[6] ابن عربی۔الفتوحات المكية۔ حصہ سوم۔ www.4shared.com (ac. 11 Mar 2007)

[7] مرزا غلام احمد قادیانی۔ ازالہ اوہام۔ ص58-60 www.aaiil.org (acc. 11 Apr 2011)

[8] شاہ گل حسن۔ تذکرہ غوثیہ۔ ص320۔ کراچی: دار الاشاعت۔ http://www.urduweb.org (ac. 13 Oct 2011)

[9] رسالہ الامداد تھانہ بھون ماہ صفر1336ھ، عدد8، جلد3، صفحہ 34

[10] ریاض احمد گوہر شاہی۔ مینارہ نور۔ www.goharshahi.pk (ac. 23 May 2011)

[11] صوفیائے نقشبند بحوالہ شریعت وطریقت از عبد الرحمن کیلانی۔ ص138۔

[12] دلائل السلوک، بحوالہ شریعت وطریقت از عبد الرحمن کیلانی۔ ص138-139۔

[13] ابن العربی۔الفتوحات المكية۔ ظاہر وباطن کی بحث

[14] ابو طالب مکی۔ قوت القلوب، جلد4۔

[15] طارق عبد الحلیم اور محمد العبدہ(ترجمہ: مدثر احمد لودھی)۔ صوفیت کی ابتداء وارتقاء۔ ص58-59۔ www.kitabosunnat.com (ac. 27 Apr 2011)

[16] ابن القیم الجوزیہ۔مدارج السالكين۔ باب الجمع۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ۔ www.waqfeya.com (ac. 6 Oct 2011)

[17] امین احسن اصلاحی۔ تزکیہ نفس۔ جلد1۔ ص64-65۔ فیصل آباد: ملک سنز۔ http://www.quranurdu.com(ac. 5 May 2008)

[18] عبد الکریم الجیلی۔ الإنسان الكامل في معرفة الأواخر والأوئل۔ باب62۔ فی سبع السماوات۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ(1998) www.al-mostafa.info (ac. 13 Oct 2011)

[19] حوالہ بالا۔

[20] یوسف سلیم چشتی۔ اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش۔ ص31-34۔ لاہور: مرکزی انجمن خدام القرآن۔ http://www.tanzeem.org/books/indexbo.asp (ac. 13 Oct 2011)

[21] حوالہ بالا۔ ص56۔

[22] تاریخ الامم بحوالہ صوفیت کی ابتدا وارتقاء۔

باب 7: جزا و سزا اور شفاعت

عقیدہ آخرت دین اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے اور قرآن کی دعوت اسی عقیدہ کے گرد گھومتی ہے۔ اہل تصوف بھی اس عقیدے کو مانتے ہیں۔ ناقدین تصوف کا کہنا ہے کہ بعض اہل تصوف کے ہاں کچھ ایسی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں جن کے نتیجے میں یہ عقیدہ ان کی دعوت میں ثانوی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ اس کی دو وجوہات ہیں: ایک تو فنا فی اللہ کا فلسفہ جس کے نتیجے میں جنت و جہنم کی تحقیر کی جاتی ہے اور دوسرے عقیدہ شفاعت۔

فنا فی اللہ کا فلسفہ اور جنت و جہنم کی تحقیر

اہل تصوف کا نقطہ نظر

وحدت الوجود پر ایمان رکھنے والے صوفیاء کا نظریہ چونکہ یہ ہے کہ وجود حقیقی صرف ایک ہے اور وہ اللہ تعالی ہے۔ باقی ساری کائنات دراصل اللہ تعالی کے وجود ہی کا حصہ ہے۔ اس بنیاد پر وہ اپنے بارے میں یہ تصور کرتے ہیں کہ وہ عالم لاہوت (روحانی دنیا) سے اس عالم ناسوت (ظاہری دنیا) میں آ پڑے ہیں۔ ان کی پوری جدوجہد کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ روحانی مشقوں کے ذریعے جلد سے جلد اللہ تعالی سے جا ملیں۔ اسے "وصال" کا نام دیا جاتا ہے اور اس مقام کو "فنا فی اللہ" کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیاء کے ہاں موت کو "وصال" یعنی ملنا کہا جاتا ہے۔ شیخ عبداللہ ہروی کی کتاب "منازل السائرین" میں درج ہے:

الجمع: ما اسقط التفرقة، وقطع الإشارة، وشخص عن الماء والطين بعد صحة التمكين، والبرأة من التلوين، والخلاص من شهود الثنوية، والتنافي من احساس الاعتلال والتنافي من شهود شهودها.

جمع، وہ مقام ہے جو [خالق و مخلوق کے مابین] تفرقہ کو مٹا دے اور اشارہ کو ختم کر دے [یعنی خالق و مخلوق ایسے مل جائیں کہ اشارہ کرنا ممکن نہ رہے]، صحت تمکین کے ساتھ پانی اور مٹی سے اوپر اٹھے، حادث [مخلوق] غائب ہو جائے اور دوئی کو دیکھنا ختم ہو جائے۔ علت و معلول [Cause and effect] کا احساس فنا ہو جائے اور یہاں تک کہ ان چیزوں کو دیکھنے کی صلاحیت بھی ختم ہو جائے۔[1]

ظاہر ہے کہ جب مقصد اتنا بلند ہو کہ انسان اللہ تعالی کی ہستی میں فنا ہونے جا رہا ہو، تو پھر جنت یا جہنم کی کیا وقعت رہ جاتی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ صوفیاء کے ہاں جنت اور جہنم کا ذکر بڑی حقارت سے کیا جاتا ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ اصل منزل "فنا فی اللہ" ہی ہے۔ بعض صوفیاء کے بارے میں منقول ہے کہ انہیں کشف میں معلوم ہوا کہ وہ جنتی ہیں، وہ اس پر خوش نہ ہوئے۔ پھر انہیں بتایا گیا کہ وہ جہنمی ہیں، اس پر بھی انہیں کوئی رنجیدگی محسوس نہ ہوئی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر ہم اللہ میں فنا ہو جائیں تو پھر وہ جہاں بھی رکھے، ہم خوش ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں قرآن مجید کی ان ہزاروں آیات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے جن میں جنت کا شوق یا جہنم سے خوف دلایا گیا

ہے۔ ایک بزرگ کے بارے میں منقول ہے:

آپ کے وصال کے وقت ایک بزرگ پاس بیٹھے تھے۔ وہ جنت کے ملنے کی دعا کرنے لگے۔ حضرت ممشاد نے ہنس کر فرمایا: "تیس سال تک جنت اپنی ساری دلکشیوں سمیت میرے سامنے آتی رہی، مگر میں نے ایک مرتبہ بھی ان کو نگاہ بھر کر نہیں دیکھا۔ میں تو جنت کے مالک کا مشتاق ہوں۔" [2]

شیخ نظام الدین اولیاء (635-725/1238-1325) کے ملفوظات پر مشتمل کتاب فوائد الفوائد جو کہ اہل تصوف کے نزدیک اہم ترین کتاب ہے میں ایک بزرگ معروف کرخی (d. 200/815) کے بارے میں لکھا ہے کہ جب روز قیامت ان کے جنت میں داخلے کا حکم ہو گا تو وہ جنت میں یہ کہہ کر جانے سے انکار کر دیں گے کہ میں نے اس کے لیے اللہ کی عبادت نہیں کی۔ اس پر فرشتوں کو حکم دیا جائے گا کہ وہ انہیں نور کی زنجیروں میں جکڑ کر زبردستی جنت میں داخل کر دیں۔ اسی طرح حضرت رابعہ بصریہ (98-185/717-801) کا یہ قول تصوف کی بہت سی کتب میں منقول ہے: "اگر میں تیری عبادت، جنت کی چاہت میں کروں، تو مجھے اس سے محروم رکھنا اور گر تیری دوزخ کے ڈر سے کروں، تو مجھے اس میں جلانا اور اگر تیری عبادت صرف تیری محبت میں کروں تو مجھے اپنے جمال بے مثال سے محروم نہ رکھنا۔" [3]

ناقدین تصوف کا نقطہ نظر

ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ اللہ تعالی کی رضا کو جنت سے علیحدہ کر کے دیکھنا اہل تصوف کا نقطہ نظر ہے۔ قرآن مجید کا نقطہ نظر اس سے بالکل مختلف ہے۔ قرآن مجید جنت کی تعریف و توصیف کرتا ہے اور اس میں داخلے کا شوق دلاتا ہے اور اسی کو اللہ تعالی کی رضا قرار دیتا ہے۔ اسی طرح قرآن میں جہنم کے عذاب سے خبردار کیا گیا ہے اور اہل ایمان کو اس کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ جہنم سے بچنے کی کوشش کریں۔ اللہ تعالی سے ملاقات جنت کی سب سے بڑی نعمت ہو گی۔ چند آیات پیش خدمت ہیں:

قُلْ أَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِنْ ذَلِكُمْ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَأَزْوَاجٌ مُطَهَّرَةٌ وَرِضْوَانٌ مِنْ اللَّهِ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ (15) الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا إِنَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (16)

آپ فرمایئے: کیا میں تمہیں اس سے بڑی خیر کے بارے میں نہ بتاؤں جو کہ متقی لوگوں کے لیے اپنے رب کے پاس ہے۔۔۔ باغات جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور پاکیزہ جوڑے اور [سب سے بڑھ کر] اللہ کی رضا جبکہ اللہ اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے۔ وہ [بندے] جو کہتے ہیں ہمارے رب! ہم ایمان لائے، ہمارے گناہوں کی مغفرت فرما دے اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا لے۔ (آل عمران)

يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِنْهُ وَرِضْوَانٍ وَجَنَّاتٍ لَهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُقِيمٌ.

ان کا رب انہیں خوشخبری دیتا ہے اپنی رحمت کی، رضا کی اور ایسے باغات کی جن میں ان کے لیے نعمتیں مقیم ہیں۔ (التوبہ 9:21)

اس کے علاوہ قرآن مجید پورے کا پورا جنت کی تعریف اور جہنم سے خبر دار کرنے سے بھرا ہوا ہے۔ سورۃ الرحمن میں خاص کر جنت کا بیان ہے۔ اس کے علاوہ تقریباً ہر ہر سورۃ میں جنت و جہنم کا مختلف پہلوؤں سے ذکر ہے۔ ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ اگر یہ اتنی ہی بے وقعت ہوتیں تو اللہ تعالیٰ ان کا ذکر کیوں کرتا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث میں بھی جنت کا شوق دلایا گیا اور جہنم سے خبر دار کیا گیا ہے۔ آپ نے کہیں بھی یہ نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت جنت کے شوق سے کوئی متضاد چیز ہے۔

اس کے برعکس بعض اہل تصوف کے نزدیک جنت و جہنم میں کوئی فرق نہیں۔ مشہور صوفی عبدالکریم جیلی (767-826/1365-1423) کی کتاب "انسان کامل" میں لکھا ہے:

میں ایک مرتبہ افلاطون سے [کشف میں] ملا۔ جس کو اہل ظاہر کافر کہتے ہیں۔ میں ایسی حالت میں اس کو پایا کہ عالم غیبی نور اور بہجت [رونق] سے بھر گیا تھا، اور اس کا ایسا مرتبہ میں نے دیکھا کہ بعض کے سوا کسی ولی کو بھی یہ رتبہ نصیب نہیں ہوا۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ تو کون ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں قطب زماں اور اپنے وقت کا یکتا ہوں۔

ہم نے اس قسم کے تمہارے لیے بہت سے عجائب و غرائب دیکھے ہیں، جن کا ظاہر کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس باب میں ہم نے تیرے لیے رمز کے طور پر بہت سے اسرار رکھے ہیں، جن میں لسان رمز کے سوا کلام کرنے کی ہم کو گنجائش نہیں ہے۔ پس میرے کلام کے پوست کو پھینک دے اور اگر تو عقلمند ہے تو مغز کو لے لے۔ ان اوراق میں میں نے وہ علوم جمع کیے ہیں کہ دوزخیوں کے حالات معلوم کرنے کے لیے کسی دوسری شے کی احتیاج باقی نہیں رہتی۔۔۔۔

دوزخیوں کو دوزخ میں لذت ہو گی، جیسے اس شخص کو لڑائی بھڑائی میں لذت آتی ہے، جو اس کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ ہم نے بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ لڑائی بھڑائی میں لذت پاتے ہیں، حالانکہ وہ جانتے ہوتے ہیں کہ وہ اس میں تکلیف پا رہے ہیں لیکن وہ ربوبیت جو ان کے نفس میں پوشیدہ ہے، ان امور میں خوض کرنے پر ان کو آمادہ کرتی ہے۔ پھر ان کے لیے ایک اور بھی لذت ہے، جو خارش والوں کی لذت کے مشابہ ہے کہ اگرچہ کھجلا کھجلا کر ان کا بدن کٹ اور چھل جاتا ہے، مگر وہ اس کے کھجلانے میں لذت پاتا ہے اور وہ عذاب و لذت کے مابین ہوتا ہے ۔۔۔۔ پھر ان کے لیے ایک مختلف لذت ہے، حتیٰ کہ میرا ایک جماعت سے [کشف میں] ملنے کا اتفاق ہوا، جو دوزخ کے سخت ترین عذاب میں تھے۔ اس حالت میں میں نے ان کو دیکھا کہ جنت ان پر پیش کی جاتی تھی اور وہ اسے اچھا نہیں سمجھتے تھے۔۔۔۔ پھر جاننا چاہیے کہ دوزخیوں میں بھی ایسے آدمی بھی ہیں جو اللہ کے نزدیک بہت سے جنتیوں کی نسبت اچھے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے ان کو دار الشقاوۃ میں داخل کیا ہے تاکہ اس میں ان پر تجلی کرتے اور اشقیاء میں سے وہ شخص اس [یعنی خدا] کی نظر کا محل ہو اور یہ ایک عجیب و غریب امر دراز ہے۔[4]

ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ اگر ان باتوں کو درست مان لیا جائے تو پھر معاذ اللہ پورے کا پورا قرآن بے وقعت ہو کر رہ جاتا ہے کیونکہ جنت کا شوق دلانا اور جہنم سے خبر دار کرنا اس کا مرکزی مضمون ہے۔ اگر دوزخ کا سخت ترین عذاب ایسا ہو گا جسے چھوڑ کر آدمی جنت میں نہ جانا چاہے تو پھر جنت کی کیا وقعت اور جہنم کا کیا خوف باقی رہ جاتا ہے؟ پھر تو یہ ماننا پڑے گا کہ معاذ اللہ قرآن مجید نے جو دعوت پیش کی ہے، اس کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ یہ بس ایسے ہی اللہ تعالیٰ نے نازل فرما دیا۔ اس کے معانی اور مضامین بالکل ہی بے وقعت ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان باتوں کو مان لیا جائے تو پھر نہ ایمان سلامت رہ سکتا ہے اور نہ عقل۔

نظریہ شفاعت

اہل تصوف کا نقطہ نظر

وہ صوفیاء، جو طریقت کے سفر پر چلتے ہیں، کی منزل "فنافی اللہ" ہوتی ہے اور وہ خود سے وابستہ عام لوگوں کو وہ یہ تسلی دے دیتے ہیں کہ روز قیامت وہ اللہ تعالی سے شفاعت کر کے ان کی نجات کا بندوبست کر دیں گے۔ چونکہ فنافی اللہ کی منزل کی وجہ سے جنت و جہنم ان کے نزدیک بے وقعت ہوتی ہیں لیکن فنافی اللہ کا معاملہ ہر شخص نہیں کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام لوگوں کے لیے نظریہ شفاعت کے ذریعے نجات کا بندوبست کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ بہت سے صوفیاء کے بارے میں ایسے واقعات ملتے ہیں جن میں انہوں نے اپنے مریدین سے یہ وعدہ کیا کہ وہ انہیں لیے بغیر جنت میں نہیں جائیں گے۔ موجودہ دور میں قادری سلسلہ سے تعلق رکھنے والے بہت سے صوفیاء لوگوں کو بیعت کی ترغیب دینے کے لیے شیخ عبدالقادر جیلانی(1166-470-561/1077) سے یہ قول منسوب کرتے ہیں کہ "میرے اچھے مرید میرے لیے ہیں اور میں اپنے برے مریدوں کے لیے ہوں" اور "میں جنت میں اس وقت تک نہ جاؤں گا جب تک اپنے سلسلے کے ایک ایک مرید کو جنت میں داخل نہ کروالوں۔"

یہ درست ہے کہ اس گارنٹی کے بعد بھی بہت سے لوگ نیک اعمال چھوڑتے نہیں ہیں مگر ایسے لوگوں کی بھی ہمارے کوئی کمی نہیں ہے جو رشوت لیتے ہیں، کرپشن کرتے ہیں، دوسروں کا مال لوٹتے ہیں، عام لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ کسی نہ بزرگ سے وابستہ ہو کر یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ ان کی بخشش کروالیں گے۔ پاکستان کے مشہور صوفی ریاض احمد گوہر شاہی صاحب (-1941 2002) نے اپنی کتاب "روحانی سفر" میں یہ بات بیان کی ہے کہ اکثر طوائفیں اور ان کے دلال اپنی عمر کا آخری حصہ مزارات پر اعتکاف اور چلوں میں گزارتے ہیں تاکہ آخرت میں اپنا مقام محفوظ کر سکیں۔ ان کی یہ بات اس درجے میں درست ہے کہ کوئی بھی شخص، کسی بھی بڑے مزار پر جا کر اس کی توثیق کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسے لوگ پوری عمر نذر و نیاز کی صورت میں اپنے بزرگوں کو نذرانے اور تحفے بھیجتے رہتے ہیں تاکہ وہ انہیں آخرت میں بخشوالیں۔

ناقدین تصوف کا نقطہ نظر

ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ قرآن مجید میں شفاعت کا تصور بیان ہوا ہے مگر وہ اہل تصوف کے تصور شفاعت سے قطعی مختلف ہے۔

يَوْمَئِذٍ لا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلاَّ مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلاً.

اس دن شفاعت فائدہ نہ دے گی سوائے اس شخص کے، جسے رحمان اجازت دے دے اور اس کی بات پر راضی ہو جائے۔ (طہ 20:109)

وَلا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهُ إِلاَّ لِمَنْ أَذِنَ لَهُ.

اس [اللہ] کے پاس شفاعت فائدہ نہ دے گی سوائے اس شخص کے، جس کے لیے وہ (اللہ) اجازت دے دے۔ (سبا34:23)

مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلاَّ بِإِذْنِهِ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ.

کون ہے وہ جو اس کے ہاں شفاعت کرے سوائے اس کی اجازت سے۔ جو کچھ ان کے سامنے اور پیچھے ہے، وہ اس سے باخبر ہے۔ (البقرہ2:255)

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلا يَشْفَعُونَ إِلاَّ لِمَنْ ارْتَضَى وَهُمْ مِنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُونَ.

جو کچھ ان کے آگے اور پیچھے ہے، وہ اسے جانتا ہے۔ وہ شفاعت نہ کریں گے سوائے اس کے جس کے حق میں وہ [اللہ سننے پر] راضی ہو جائے اور وہ اس کی خشیت سے ڈرے ہوئے ہوں گے۔ (الانبیاء21:28)

قرآن مجید کی ان آیات سے واضح ہے کہ اللہ تعالی کے وہی نیک بندے شفاعت کریں گے جنہیں اللہ تعالی ایسا کرنے کی اجازت دے گا اور صرف انہی مخصوص افراد کے حق میں بات کریں گے جن کے بارے میں اللہ تعالی اجازت دے گا۔ ایسا نہیں ہو گا کہ انسان جو چاہے اعمال کرتا رہے، اور پھر ان بزرگوں کی شفاعت کا طالب ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے تمام رشتے داروں خاص کر اپنی چہیتی صاحبزادی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ارشاد فرمایا:

حدثنا أبو اليمان: أخبرنا شعيب، عن الزهري قال: أخبرني سعيد ابن المسيب وأبو سلمة بن عبد الرحمن: أن أبا هريرة قال: قام رسول الله صلى الله عليه وسلم حين أنزل الله: {وأنذر عشيرتك الأقربين}. قال: (يا معشر قريش، أو كلمة نحوها، اشتروا أنفسكم، لا أغني عنكم من الله شيئا، يا بني عبد مناف لا أغني عنكم من الله شيئا، يا عباس ابن عبد المطلب لا أغني عنك من الله شيئا، ويا صفية عمة رسول الله لا أغني عنك من الله شيئا، ويا فاطمة بنت محمد صلى الله عليه وسلم، سليني ما شئت من مالي، لا أغني عنك من الله شيئا.)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب اللہ تعالی نے یہ آیت "اپنے قریبی رشتے داروں کو خبردار کیجیے" نازل فرمائی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر فرمایا: "اے گروہ قریش! (یا اس سے ملتا جلتا کلمہ ارشاد فرمایا) اپنے لیے [نیک اعمال کے ذریعے جنت] خرید لیجیے۔ میں اللہ سے آپ کو نہیں بچا سکتا ہوں۔ اے بنو عبد مناف! میں اللہ سے آپ کو نہیں بچا سکتا ہوں۔ اے عباس بن عبد المطلب! [آپ کے چچا] میں اللہ سے آپ کو نہیں بچا سکتا ہوں۔ اے صفیہ! [آپ کی پھوپھی] میں اللہ سے آپ کو نہیں بچا سکتا ہوں۔ اے فاطمہ بنت محمد! میرے مال میں سے جو بھی مانگ لو! میں اللہ سے تمہیں نہیں بچا سکتا ہوں۔ (بخاری، کتاب التفسیر، حدیث 4493)

ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ اہل تصوف بزرگوں کی لامحدود شفاعت کا تصور پیش کر کے اسلام کے بنیادی عقیدہ آخرت اور جزا و سزا کی اہمیت پر ضرب لگاتے ہیں۔

پابند شریعت صوفیاء، ناقدین کے اس اعتراض کو درست تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ وہ اپنے بزرگوں کے ان واقعات کی توجیہ کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ان بزرگوں کا یہ مطلب نہ تھا کہ انسان جو چاہے عمل کرے بلکہ انہوں نے محض اللہ تعالی کی رحمت کو بیان کیا ہے۔ مخالف شریعت صوفیاء البتہ بڑے دھڑلے سے انہی دعاوی پر ایمان لے آتے ہیں اور شریعت پر عمل کو ضروری قرار نہیں دیتے ہیں۔ ایسے ہی صوفیاء پر تنقید کرتے ہوئے مشہور صوفی عالم امام محمد غزالی (450-505/1058-1111) لکھتے ہیں:

شفاعت کے اعتبار سے گناہ کی دو قسمیں ہیں۔ بعض گناہ وہ ہیں جو غضب الہی کا باعث ہوتے ہیں۔ ایسے گناہوں کی شفاعت کی اجازت نہیں ہو گی

اور بعض گناہ ایسے ہیں جو شفاعت کی وجہ سے معاف کر دیے جائیں۔ جیسے دنیاوی بادشاہوں کا معاملہ ہے، بعض خطائیں اور جرم ان کے غیض و غضب کو اس طرح للکارتے ہیں کہ قریب سے قریب آدمی بھی ان کی سفارش کرتے ہوئے گھبراتا ہے، اسی طرح بادشاہ حقیقی کے یہاں بھی بعض گناہ شفاعت سے معاف نہین کیے جائیں گے، اور مجرمین کو سزا بھگتنی ہو گی۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "اور بجز اس کے جس کے لیے [اللہ کی] مرضی ہو، وہ کسی کی سفارش نہیں کر سکتے۔۔۔

معلوم ہوا کہ بعض گناہ ناقابل شفاعت ہیں۔ اس لیے انجام کا خوف ضروری ہے، اگر ہر گناہ میں شفاعت قابل قبول ہوتی تو آپ قریش کا اطاعت کا حکم نہ دیتے اور نہ آپ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو معصیت سے منع فرماتے بلکہ انہیں اجازت دیتے کہ وہ اپنی دنیاوی لذتوں کی تکمیل کے لیے خواہشات کی پیروی کر سکتی ہیں، میں آخرت میں سفارش کر کے بچالوں گا اور وہاں کی لذات بھی مکمل ہو جائیں گی۔

خیر سے بچنا اور شفاعت کی امید پر گناہوں کے سمندر میں غرق رہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی مریض نہ پرہیز کرے اور نہ دوا کھائے، بلکہ اپنے طبیب پر بھروسہ رکھے کہ وہ بڑا نامی گرامی طبیب ہے، مجھ پر نہایت شفیق و مہربان ہے، میرا انتہائی خیال رکھتا ہے، اس لیے ترک علاج یا بدپرہیزی سے مجھے کچھ نقصان نہ ہو گا بلکہ میرا طبیب مجھے بچالے گا۔ یہ سراسر جہالت ہے، طبیب کی تمام تر جدوجہد مریض کے رویے پر موقوف ہے، وہ تنہا تمہارا ایک ظاہری مرض بھی دور نہیں کر سکتا، چہ جائیکہ وہ تمہارے مخفی امراض کا علاج کر سکے۔ یہی حال اقارب و اجانب کے لیے انبیاء اور صلحاء کی سفارش کا ہے، اگر وہ خود اپنے لیے کچھ نہیں کرتے تو انبیاء کی سفارش ان کے لیے بے کار ہے۔

پھر شفاعت کی توقع پر آخرت کے خوف سے بے نیاز ہو جانا بھی مومن کو زیب نہیں دیتا۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اپنے تقوی و تقدس، اور قرب الہی کے باوجود ہر وقت خوف سے لرزتے رہتے اور آخرت کے احتساب سے بچنے کے لیے یہ تمنا کرتے کہ کاش وہ جانور ہوتے، پرندے ہوتے، مٹی اور پتھر ہوتے۔ جبکہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر ان کے لیے جنت کا اور تمام مسلمانوں کے لیے عموماً شفاعت کا وعدہ فرمایا تھا، لیکن انہوں نے اس پر تکیہ نہیں کیا بلکہ زندگی کے آخری سانس تک اللہ کے خوف سے لرزہ براندم رہے۔ جب صحابہ کرام کا عالم یہ تھا تو وہ لوگ کس طرح شفاعت پر تکیہ کرتے ہیں، اور خود پسندی میں مبتلا ہیں جنہیں نہ صحبت رسول میسر ہے اور نہ شفاعت رسول کے وہ مستحق ہیں۔ [5]

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ پابند شریعت صوفیاء کا موقف بھی اس معاملے میں یہی ہے کہ شفاعت بھروسے کے لائق چیز نہیں ہے۔ اللہ تعالی اپنے نیک بندوں کی شان کے اظہار کے لیے مخصوص افراد کے لیے انہیں شفاعت کرنے کی اجازت دے دے گا۔ ایسا نہیں ہو گا کہ یہ حضرات معاذ اللہ دھاندلی سے کام لیتے ہوئے رشوت خوروں، بدکاروں اور ظالموں کے حق میں شفاعت کرتے ہوئے انہیں محض اس وجہ سے معاف کروالیں کہ یہ ان حضرات کے مرید تھے۔ شفاعت کے حقدار بھی وہی ہوں گے جو نیک اعمال کر کے خود کو اس کا اہل ثابت کریں۔ اس طرح سے پابند شریعت صوفیاء اور ان کے ناقدین کے مابین نقطہ نظر کا کوئی اختلاف باقی نہیں رہ جاتا ہے۔

اسائن منٹس

- بعض صوفیاء کے ہاں اسلام کے عقیدہ آخرت کے متعلق کیا تصورات پائے جاتے ہیں؟
- کیا ان صوفیاء کے نظریات اور قرآن مجید میں مطابقت پیدا کرنا ممکن ہے؟
- جنت و جہنم کی تحقیر اور عقیدہ شفاعت کے ذریعے اسلام کے تصور آخرت کو غیر موثر کرنے کی نفسیاتی وجوہات کیا ہیں؟
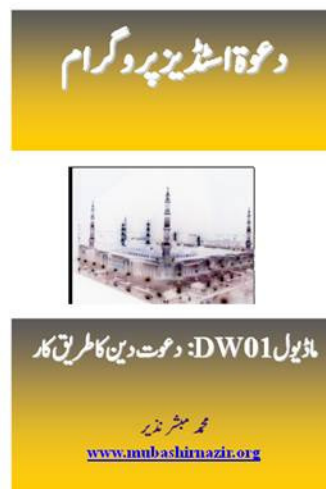
[1]عبداللہ انصاری الہروی۔منازل السائرین۔باب الجمع۔ص134۔بیروت: دار الکتب العلمیہ(1998)۔www.al-mostafa.com (ac. 6 May 2011)

[2]تاریخ مشائخ چشت بحوالہ شریعت و طریقت از عبدالرحمن کیلانی۔ص499-498

[3]مقربان حق بحوالہ شریعت و طریقت از عبدالرحمن کیلانی۔ص499-498

[4]عبدالکریم الجیلی۔الإنسان الكامل في معرفة الأواخر والأوئل۔باب58۔ص189۔بیروت: دار الکتب العلمیہ(1998) www.al-mostafa.info (ac. 13 Oct 2011)

[5]ابو حامد غزالی(ترجمہ: ندیم الواجدی)۔احیاء العلوم الدین۔جلد3، عجب کے اسباب اور ان کا علاج۔کراچی: دار الاشاعت۔www.scribd.org (13 Oct 2011)

باب 8: نفسیاتی غلامی اور اہل تصوف

اہل تصوف کی تعلیم یہ ہے کہ ایک مرید کو اپنے پیر کا مکمل طور پر غلام بن کر رہنا چاہیے۔ ناقدین تصوف، صوفیاء کے اس تصور پر تنقید کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ نفسیاتی غلامی کا یہ تصور اسلام کے قطعاً خلاف ہے۔ اسلام میں سوائے انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کے کوئی بھی شخص تنقید سے ماوراء نہیں ہے۔

پہلے ہم یہاں مرشد کی غلامی سے متعلق اہل تصوف کا نقطہ نظر تفصیل سے بیان کریں گے، پھر ان کے دلائل بیان کریں گے اور یہ دیکھیں گے کہ ناقدین تصوف ان کا کیا جواب دیتے ہیں، ناقدین تصوف کے دلائل کا مطالعہ ہم اگلے باب میں کریں گے۔

مرشد کی غلامی سے متعلق اہل تصوف کا نقطہ نظر

اہل تصوف، خواہ وہ پابند شریعت ہوں یا مخالف شریعت، اس بات پر متفق ہیں کہ ایک مرید کو اپنا آپ اپنے شیخ یا پیر کے سپرد کر دینا چاہیے اور اس کے ہاتھوں میں "مردہ بدست زندہ" بن کر رہنا چاہیے۔ جو حکم وہ دے، اسے آنکھیں بند کر کے بجالانا چاہیے۔ مرشد کے کسی بھی حکم کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیے۔ اگر مرشد کا کوئی فعل خلاف شریعت بھی نظر آئے تو اس پر تنقید نہیں کرنی چاہیے بلکہ اپنا قصور گردانا چاہیے کہ مجھے ہی بات سمجھ میں نہیں آئی ہو گی۔ شیخ کی کسی بات پر تنقید کرنا تو دور کی بات، اس معاملے میں سوچنا بھی ایسا جرم ہے جس سے انسان کے درجات گر جاتے ہیں۔ گویا کہ ذہنی اور عملی طور پر ایک مرید کو اپنے مرشد کا غلام بن کر رہنا چاہیے۔ راقم الحروف نے اپنی کتاب "مسلم دنیا اور ذہنی، فکری اور نفسیاتی غلامی" میں تفصیل سے ان طریقہ ہائے کار پر روشنی ڈالی ہے، جن کے ذریعے مریدین کو ذہنی غلام بنایا جاتا ہے۔

یہاں ہم اہل تصوف کے مختلف حلقوں کی کتب سے کچھ اقتباسات پیش کر رہے ہیں جس سے مرشد کی غلامی سے متعلق ان کا نقطہ نظر واضح ہو جاتا ہے۔ جنوبی ایشیا کے صوفیاء بنیادی طور پر دو گروہوں میں منقسم ہیں: دیوبندی اور بریلوی۔ ان کے باہمی اختلافات کا جائزہ آپ سلفیت اور غیر سلفیت سے متعلق ماڈیول میں لے چکے ہیں۔ یہاں ہم خالصتاً تصوف کے حوالے سے ان کا نقطہ نظر بیان کریں گے۔

بریلوی مکتب فکر کے ہاں آداب مرشد

بریلوی مکتب فکر کے بانی اور امام، مولانا احمد رضا خان بریلوی (1856-1921) لکھتے ہیں:

> بیعت ارادت یہ ہے کہ مرید اپنے ارادہ واختیار ختم کر کے خود کو شیخ و مرشد ہادی برحق کے بالکل سپرد کر دے، اسے مطلقاً اپنا حاکم و متصرف جانے، اس کے چلانے پر راہ سلوک چلے، کوئی قدم بغیر اس کی مرضی کے نہ رکھے۔ اس کے لئے مرشد کے بعض احکام، یا اپنی ذات میں خود اس کے کچھ کام، اگر اس کے نزدیک صحیح نہ بھی معلوم ہوں تو انہیں افعال خضر علیہ الصلوۃ والسلام کی مثل سمجھے، اپنی عقل کا قصور جانے، اس کی کسی بات پر دل

میں اعتراض نہ لائے، اپنی ہر مشکل اس پر پیش کرے۔[1]

مولانا کی خدمت میں کسی نے پیر کامل کے کچھ حقوق و آداب تحریر کر کے تصحیح کے لئے پیش کئے تو انہوں نے ان تمام حقوق کو صحیح اور قرآن عظیم، احادیث شریفہ، کلام علماء اور ارشادات اولیاء سے ثابت شدہ قرار دیا اور فرمایا کہ اکابر نے اس سے بھی زائد آداب لکھے ہیں۔ ان آداب کی تفصیل یہ ہے:

- یہ اعتقاد رکھے کہ میرا مطلب اسی مرشد سے حاصل ہو گا اور اگر دوسری طرف توجہ کرے گا تو مرشد کے فیوض و برکات سے محروم رہے گا۔
- ہر طرح مرشد کا مطیع [فرمانبردار] ہو اور جان و مال سے اس کی خدمت کرے کیونکہ بغیر محبت پیر کے کچھ نہیں ہوتا اور محبت کی پہچان یہی ہے۔
- مرشد جو کچھ کہے، اس کو فوراً بجالائے اور بغیر اجازت اس کے فعل کی اقتدا [پیروی] نہ کرے۔ کیونکہ بعض اوقات وہ [یعنی مرشد] اپنے حال و مقام کے مناسب ایک کام کرتا ہے [مگر ہو سکتا ہے]، کہ مرید کو اس کا کرنا زہر قاتل ہے۔
- جو ورد و وظیفہ مرشد تعلیم کرے، اس کو پڑھے اور تمام وظیفے چھوڑ دے۔ خواہ اس نے اپنی طرف سے پڑھنا شروع کیا یا کسی دوسرے نے بتایا ہو۔
- مرشد کی موجودگی میں ہمہ تن اسی کی طرف متوجہ رہنا چاہیے۔
- یہاں تک سوائے فرض و سنت کے نماز نفل اور کوئی وظیفہ اس کی اجازت کے بغیر نہ پڑھے۔
- حتی الامکان ایسی جگہ نہ کھڑا ہو کہ اس کا سایہ مرشد کے سایہ پر یا اس کے کپڑے پر پڑے۔
- اس کے مصلے [یعنی جائے نماز] پر پاؤں نہ رکھے۔
- مرشد کے برتنوں کو استعمال میں نہ لاوے۔
- اس کے سامنے نہ کھانا کھائے نہ پیئے اور نہ وضو کرے، ہاں اجازت کے بعد مضائقہ نہیں۔
- اس کے روبرو [یعنی سامنے] کسی [اور] سے بات نہ کرے بلکہ کسی کی طرف متوجہ بھی نہ ہو۔
- جس جگہ مرشد بیٹھتا ہو اس طرف پیر نہ پھیلائے، اگرچہ سامنے نہ ہو۔
- اور اس طرف تھوکے بھی نہیں۔
- جو کچھ مرشد کہے اور کرے، اس پر اعتراض نہ کرے کیونکہ جو کچھ وہ [یعنی مرشد] کرتا ہے اور کہتا ہے [اس کی] اگر کوئی بات سمجھ نہ آوے تو حضرت موسیٰ و خضر علیہما السلام کا قصہ یاد کر لے۔
- اپنے مرشد سے کرامت کی خواہش نہ کرے۔

- اگر کوئی شبہ دل میں گزرے تو فوراً عرض کرے اور اگر وہ شبہ حل نہ ہو تو اپنے فہم [یعنی عقل کی کمی] کا نقصان سمجھے اور اگر مرشد اس کا جواب نہ دے تو جان لے کہ میں اس جواب کے لائق نہ تھا۔
- اپنے خواب میں جو کچھ دیکھے وہ مرشد سے عرض کرے اور اگر اس کی تعبیر ذہن میں آوے تو اسے بھی عرض کرے۔
- بے ضرورت اور بے اذن [بغیر اجازت] مرشد سے علیحدہ نہ ہو۔
- مرشد کی آواز پر اپنی آواز بلند نہ کرے اور بآواز اس سے بات نہ کرے اور بقدر ضرورت مختصر کلام کرے اور نہایت توجہ سے جواب کا منتظر رہے۔
- اور مرشد کے کلام کو دوسرے سے اس قدر بیان کرے جس قدر لوگ سمجھ سکیں اور جس بات کو یہ لوگ نہ سمجھیں گے تو اسے بیان نہ کرے۔
- مرشد کے کلام کو رد نہ کرے اگرچہ حق مرید ہی کی جانب ہو بلکہ اعتقاد کرے کہ شیخ کی خطا میرے صواب [یعنی درستی] سے بہتر ہے۔
- کسی دوسرے کا سلام و پیام شیخ سے نہ کہے [یہ عام مریدین کے لئے ہے جس کو بارگاہ مرشد میں ابھی منصب عرض معروض و دیگران حاصل نہ ہو۔ ایسوں سے اگر کوئی سلام کے لئے عرض کرے تو عذر کرے کہ حضور میں مرشد کریم کی بارگاہ میں دوسرے کی بات عرض کرنے کے ابھی قابل نہیں]۔
- جو کچھ اس کا حال ہو، برا یا بھلا، اسے مرشد سے عرض کرے کیونکہ مرشد طبیب قلبی ہے، اطلاع ہونے پر اس کی اصلاح کرے گا۔
- مرشد کے کشف پر اعتماد کر کے سکوت نہ کرے۔
- اس کے پاس بیٹھ کر وظیفہ میں مشغول نہ ہو۔ اگر کچھ پڑھنا ہو تو اس کی نظر سے پوشیدہ بیٹھ کر پڑھے۔
- جو کچھ فیض باطنی اسے پہنچے، اسے مرشد کا طفیل سمجھے۔ اگر خواب میں یا مراقبہ میں دیکھے کہ دوسرے بزرگ سے پہنچا، تب بھی یہ جانے کہ مرشد کا کوئی وظیفہ اس بزرگ کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔[2]

ایک اور مقام پر مزید ارشاد فرماتے ہیں:

مرشد کے حقوق مرید پر شمار سے افزوں ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ اس کے ہاتھ میں مردہ بدست زندہ ہو کر رہے۔ اس کی رضا کو اللہ عزوجل کی رضا اور اس کی ناخوشی کو اللہ عزوجل کی ناخوشی جانے۔ اسے اپنے حق میں تمام اولیائے زمانہ سے بہتر سمجھے، اگر کوئی نعمت دوسرے سے ملے تو بھی اسے [اپنے] مرشد ہی کی عطا اور انہیں کی نظر کی توجہ کا صدقہ جانے۔ مال، اولاد، جان سب ان پر تصدق [وار دینے] کرنے کو تیار رہے۔

ان کی جو بات اپنی نظر میں خلاف شرعی بلکہ معاذ اللہ [گناہ] کبیرہ معلوم ہو، اس پر بھی نہ اعتراض کرے، نہ دل میں بدگمانی کو جگہ دے بلکہ یقین جانے کہ میری سمجھ کی غلطی ہے۔۔۔۔۔۔ جو وہ حکم دیں "کیوں" نہ کہے، دیر نہ کرے، سب کاموں میں اسے تقدیم [اولیت] دے۔۔۔۔۔ جب ایسا ہو گا تو ہر وقت اللہ عزوجل و سید عالم صلی اللہ تعالی علیہ وآلہ وسلم و مشائخ کرام رضی اللہ تعالی عنہم کی مدد زندگی میں، نزع میں، قبر میں، حشر میں، میزان پر، پل صراط پر، حوض کوثر پر ہر جگہ اس کے ساتھ رہے گی۔[3]

"آداب مرشد کامل" کے مصنف لکھتے ہیں:

اللہ عزوجل کا مقرب بننے کا اعلی وعظیم انعام پانے (یعنی فنافی الرسول صلی اللہ تعالی علیہ واٰلہ وسلم ہو کر فنافی اللہ عزوجل ہونے) کی پہلی سیڑھی فنا فی الشیخ ہے۔ یعنی سالک اپنے آپ کو مرشد سے الگ نہ سمجھے۔ بلکہ خیال کرے، کہ میرے جسم کی حرکت وسکون میرے مرشد ہی کے اختیار میں ہے۔ اور میرا مرشد ہی مجھے سمجھ سکتا ہے۔ اور ظاہر وباطن کی اصلاح کر سکتا ہے۔ اپنے طور طریقوں سے یہ ظاہر کرے، کہ اپنے وجود پر اس کا کوئی اختیار نہیں اور طرز عمل میں ریاکاری اور خود پسندی سے بالکل دور رہے۔ (مگر یہ یاد رہے) کہ فنافی الشیخ کی پہلی منزل تصور مرشد کا مکمل قائم ہونا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ تصور مرشد مریدین کی ترقی کے لئے کس قدر اہمیت کا حامل ہے۔۔۔۔

یاد رہے! کہ جب تک مرید اپنے مرشد کی ذات میں اپنے آپ کو گم نہیں کرلے گا۔ آگے راستہ نہیں پاسکے گا۔ تصور مرشد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے مرید کو چاہیے کہ اپنے دل میں مرشد کی محبت کو خوب بڑھائے۔ جتنی محبت زیادہ ہو گی، اتنا ہی مرشد کے تصور میں آسانی ہو گی۔ مرشد کی ذات کو اپنی سوچ کا محور بنانے کی کوشش کرے، مرشد کامل کے ہر ہر انداز، ہر ہر عادت اور ان کے ہر عمل کو بغور دیکھے اور اسے خود بھی اپنانے کی کوشش کرے۔ ہر وقت اس کے گمان میں مرشد کا جلوہ سمایا رہے۔ چلے تو ان کے انداز میں، بیٹھے تو سوچے کہ میرے مرشد اس طرح بیٹھتے ہیں، کھانا کھائے تو ان کا انداز اپنائے۔ جہاں موقع ملے مرشد کی باتیں بیان کرے، ان کے ملفوظات شریف کی اشاعت کرے، ان سے ظاہر ہونے والی برکتوں کا خوب تذکرہ کرے! کہ یہ پیر ومرشد سے محبت کی دلیل ہے۔ [4]

دیوبندی مکتب فکر کے ہاں آداب مرشد

اہل تصوف کے دوسرے گروہ، دیوبندی مکتب فکر کے ہاں بھی معاملہ کم وبیش یہی ہے۔ اکابر دیوبند، جن میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور مولانا رشید احمد گنگوہی شامل ہیں، سے متعلق صوفی محمد اقبال صاحب لکھتے ہیں:

ارشاد الملوک ص 72 میں حضرت قطب عالم [رشید احمد] گنگوہی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ مرید کو چاہیے کہ شیخ کے ظاہری وباطنی احترام میں کوتاہی نہ کرے۔ احترام ظاہری تو یہ ہے کہ اس کے ساتھ مناظرہ نہ کرے اور جو کچھ اس سے سنے، اگرچہ یقیناً جانتا ہو کہ غلط ہے، تاہم اس کے ساتھ حجت نہ کرے کیونکہ اس کی نظر، اس کی نظر سے اور اس کا علم، اس کے علم سے بہر حال بڑھا ہوا ہے اور کامل ہے۔ نیز شیخ کے سامنے جاء نماز پر نہ بیٹھے مگر بضرورت نماز اور نماز کے بعد فوراً جاء نماز اٹھالے اور زمین پر آبیٹھے اور نوافل بھی اس کے سامنے نہ پڑھے۔ اور جو کچھ شیخ فرمائے، اس کی تعمیل کرے اور حتی المقدور اس میں کوتاہی نہ کرے اور شیخ کی جاء نماز پر قدم نہ رکھے اور شیخ کے سامنے بلکہ دوسروں کے سامنے بھی ایسی حرکت نہ کرے جو اہل معرفت کی خصلتوں کے خلاف ہو اور مشائخ کے چہرہ پر بار بار نگاہ نہ ڈالے اور ان کے ساتھ انبساط اور بے تکلفی کا برتاؤ نہ کرے مگر یہ کہ وہی اجازت دیں۔ اور کوئی کام ایسا نہ کرے جو شیخ کی گرانی کا سبب ہو، بلکہ ہمیشہ گردن جھکائے رہے اور لوگوں کے منہ بھی نہ تکے کہ اس سے غفلت پیدا ہوتی ہے۔ اور باطنی احترام یہ ہے کہ شیخ پر کسی امر میں انکار نہ کرے، اور ظاہر کی طرح باطن میں قولاً وفعلاً اور ہر حرکت وسکون ہر انداز سے لحاظ قائم رکھے ورنہ نفاق میں مبتلا ہو جائے گا۔ [5]

صوفی محمد اقبال صاحب اسی کتاب میں اکابرین دیوبند کا یہ واقعہ بیان کرتے ہیں:

اعلیٰ حضرت [مولانا رشید احمد] گنگوہی نور اللہ مرقدہ پان نہیں نوش فرمایا کرتے تھے لیکن اگالدان رہتا تھا۔ کبھی کھانسی وغیرہ میں بلغم اس میں ہوتا تھا، سوکھ بھی جاتا تھا۔ حضرت شیخ الہند [مولانا محمود الحسن] نور اللہ مرقدہ نے ایک مرتبہ اس اگالدان کو بہت چپکے سے کوئی نہ دیکھے، اجایا اور باہر لے جا کر اس کو دھو کر پی لیا۔[6]

صوفی صاحب مزید لکھتے ہیں:

اپنے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک کشفی پیام کہ اللہ والوں سے ڈرتے رہنا، ان کی الٹی بھی سیدھی ہوتی ہے، اس کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ حضرت اقدس مولانا الحاج عبد القادر صاحب نور اللہ مرقدہ سے میں نے اس کا مطلب پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ تو صحیح ہے کہ الٹی بات الٹی ہی ہوتی ہے، لیکن اہل اللہ کے قلوب میں اگر کسی کی طرف سے تکدر پیدا ہو جائے، خواہ وہ کسی غلط بات ہی کی وجہ سے ہو تو ان کے پاک دل کا تکدر رنگ لائے بغیر نہیں رہ سکتا اور وہ اس شخص کو کسی معصیت میں پھانس دیتا ہے۔

یہ بات میری خوب سمجھ میں آ گئی اور اس کے نظائر میں نے بہت دیکھے، اسی لیے میں اسباق حدیث میں ہمیشہ طلباء کو اس پر بہت ہی زیادہ تنبیہ کرتا رہا کہ ان اللہ والوں سے بہت ڈرتے رہنا، ان کے دل میں تمہاری طرف سے تکدر نہ پیدا ہونا چاہیے اور یہ جب جملہ اہل اللہ کے ساتھ ہے تو جس شخص سے بیعت کا تعلق ہو، اس کے قلبی تکدر سے تو بہت زیادہ ڈرتے رہنا چاہیے۔[7]

انہی کے سلسلہ کے ایک اور صوفی بزرگ حکیم محمد اختر صاحب لکھتے ہیں:

لیکن آہ! لوگوں نے اللہ والوں کو نہیں پہنچانا کہ اللہ والوں کی غلامی سے کیا ملتا ہے۔۔۔۔۔ تو آج میں آپ لوگوں کو شارٹ کٹ راستہ بتاتا ہوں کہ دنیا میں جس ولی اللہ سے یا ان کے غلاموں سے مناسبت ہو، اس کی خدمت اور محبت کرو مگر اخلاص کے ساتھ۔ اللہ کے یہاں محبت وہی مقبول ہے جو اتباع کے ساتھ ہو، شیخ کے مشورے پر جان کی بازی لگا دو، اخلاص کے ساتھ، اللہ کے لئے۔[8]

حکیم صاحب نے اس مقام پر اپنے واقعات بیان کیے ہیں جن میں وہ اپنے مرشد کے لئے محبت و اطاعت کی مثال قائم کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ ان کے مرشد کے لئے تہجد کے وقت پانی گرم کرنے کا اہتمام نہیں تھا۔ فاضل مصنف نے رات کے اول وقت میں پانی گرم کروایا اور پانی کے اس برتن کو بند کر کے گدے میں لپیٹ کر ساری رات اپنے پیٹ کے نیچے دبا کر جاگتے رہے تاکہ یہ پانی گرم رہے۔ اسی طرح وہ سخت گرمی میں تپتی لو کے دوران وہ شیخ کے وضو کے لئے لوہے کا گھڑا سر پر رکھ کر ایک میل سے پانی لاتے رہے۔ ان کے شیخ دوپہر ایک بجے ناشتہ کیا کرتے تھے۔ فاضل مصنف صبح فجر سے لے کر ایک بجے تک فاقے سے رہا کرتے تھے تاکہ کہیں ناشتہ مرشد سے پہلے نہ ہو جائے۔

دیوبندی اور بریلوی مکاتب فکر کے ہاں فرق صرف یہ ہے کہ دیوبندی مکتب فکر کے مطابق مرشد کے انتقال کے بعد اس کے فیض کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے جبکہ بریلوی حضرات کے ہاں فیوض و برکات کا یہ سلسلہ بعد از وفات بھی جاری رہتا ہے۔ اس لئے دیوبندی حضرات ضروری سمجھتے ہیں کہ مرشد کی وفات کے بعد کسی دوسرے کو مرشد بنا لیا جائے جبکہ بریلوی حضرات اس سے سختی سے منع کرتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک فیوض و برکات کا سلسلہ جاری ہے۔

مرشد کو سجدہ

دیوبندی اور بریلوی صوفی حضرات مرشد کو سجدہ کرنے کو درست نہیں سمجھتے تاہم بعض صوفیاء ایسے ہیں جن کے ہاں مرید، پیر کو سجدہ کیا کرتے ہیں۔ اس کے لیے بسا اوقات یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ سجدہ نہیں کر رہے بلکہ قدم بوسی کر رہے ہیں یا زمین ادب چوم رہے ہیں تاہم اس میں شکل سجدہ کی سی بن جاتی ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاء(1325-1238/725-635) کے ملفوظات پر مشتمل کتاب "فوائد الفوائد" میں ان سے منسوب یہ بات درج ہے:

یہ حکایت ختم فرما کر آپ نے ارشاد فرمایا کہ بہت سے آدمی میرے پاس آتے ہیں اور تعظیم کرتے ہیں، زمین پر سر رکھتے ہیں جو کہ یہ امر حضرت شیخ الاسلام، شیخ شیوخ العالم اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہما کے سامنے بھی ہوتا تھا اور آپ اس کو روا رکھتے ہیں۔ پس میں بھی کچھ نہیں کہتا۔

اس وقت بندہ [امیر علاء سنجری مولف کتاب] نے عرض کیا کہ جو شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور غایت تعظیم سے سر، زمین پر رکھتا ہے۔ اس میں اس کو مزید حاصل ہوتا ہے کہ نفس اس کا ٹوٹتا ہے۔ کیونکہ مخدوم کو اللہ تعالی نے یہ شرف اور عزت دی ہے۔ جس طرح اللہ تعالی کی عظمت و جلال بلند ہے اور حق بجا آوری احسانات و شکر گزاری ادا نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح آپ کی تعظیم بھی کامل نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد خواجہ ذکر اللہ خیر نے یہ حکایت بیان فرمائی کہ کئی روز ہوئے ایک بزرگ زادے روم و شام کی سیاحت کیے ہوئے آئے تھے۔ ان کے بیٹھے ہوئے پر وحید الدین قریشی آئے اور موافق رسم تعظیم بجالائے اور زمین ادب چومی۔ انہوں نے برا مانا اور زور سے کہ سجدہ ہوا، ایسا نہ کرنا چاہیے اور بھی بہت برا بھلا کہا۔ میں جواب دینا نہیں چاہتا تھا، لیکن جب ان کی درشتی و برہمی مزاج حد سے گزر گئی تو میں نے ان سے مخاطب ہو کر کہا کہ سنیے صاحب! جو امر فرض ہوتا ہے، اس کی فرضیت جاتی رہنے کے بعد اس کا استحباب باقی رہتا ہے جیسے روزہائے ایام بیض اور ایام عاشورہ کہ امم متقدمہ پر فرض تھے اور عہد رسول علیہ السلام میں جب روزہ ہائے ایام ماہ رمضان فرض ہوئے، فرضیت ان کی جاتی رہی، صرف استحباب باقی رہ گیا۔ اسی طرح سجدہ بھی امم ماضیہ میں مستحب تھا کہ رعیت بادشاہ کو، اور شاگرد استاد کو اور امت پیغمبر کو سجدہ کرتی تھی۔ عہد رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم میں اس سجدہ کا استحباب اٹھ گیا لیکن اباحت [جواز] اسکی باقی ہے۔ یہ سجدہ اگرچہ مستحب نہیں لیکن مباح ہے اور اس کی اباحت کی نفی کہیں کسی جگہ نہیں آئی۔ اگر تم کو معلوم ہو مجھے بتلاؤ ورنہ محض انکار سے کیا ہوتا ہے۔ انکار محض بیکار ہے۔ میرے یہ کہتے ہی وہ بزرگ زادے خاموش ہو گئے، مطلق نہ جواب دے سکے۔[9]

مشہور فارسی شاعر، حافظ شیرازی سے منسوب ایک شعر ہے:

بہ مے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید — کہ سالک بے خبر نبود زراہ ورسم منزل ہا

یعنی اگر تمہیں بزرگ پیر اپنے جاء نماز کو شراب میں بھگونے کا حکم دے تو ضرور مانو کہ سالک منزلوں کے آداب و مراسم سے ناواقف نہیں ہوتا۔[10]

تصور شیخ اور فنا فی الشیخ

اہل تصوف کے ہاں تصور شیخ ایک مقبول طریقہ ہے جس کے ذریعے فنا فی الشیخ کا مقام حاصل کر لیا جاتا ہے۔ اس کا طریقہ کار "آداب مرشد کامل" کے مصنف، مولانا احمد رضا خان بریلوی کے حوالے سے کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

> خلوت [یعنی تنہائی] میں آوازوں سے دور، رو بہ مکان شیخ (یعنی مرشد کے گھر کی طرف منہ کر کے)، اور وصال ہو گیا ہو تو، جس طرف مزار شیخ ہو ادھر متوجہ بیٹھے۔ محض خاموشی، باادب، بکمال خشوع و خضوع، صورت شیخ کا تصور کرے اور اپنے آپ کو ان کے حضور جانے، اور یہ خیال جمائے کہ سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم سے انوار و فیض، شیخ کے قلب پر فائض ہو رہے ہیں۔ اور میرا قلب، قلب شیخ کے نیچے، بحالت دریوزہ گری [یعنی گداگری] میں لگا ہوا ہے۔ اور اس میں سے، انوار و فیوض، ابل ابل کر، میرے دل میں آ رہے ہیں۔
>
> اس تصور کو بڑھائے، یہاں تک کہ جم جائے اور تکلف کی حاجت نہ رہے۔ اس کی انتہا پر، صورت شیخ [یعنی پیر و مرشد کا چہرہ مبارک] خود متمثل ہو کر مرید کے ساتھ رہے گی۔ اور ان شاء اللہ عزوجل (اللہ و رسول عزوجل و صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کی عطا سے) ہر کام میں مدد کرے گی۔ اور اس راہ میں جو مشکل اسے پیش آئے گی اس کا حل بتائے گی۔ [11]

تصور شیخ سے متعلق ہی ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے مولانا اشرف علی تھانوی (1863-1943) لکھتے ہیں:

> ایک دفعہ حضرت [رشید احمد] گنگوہی رحمۃ اللہ جوش میں تھے اور تصور شیخ کا مسئلہ در پیش تھا۔ فرمایا کہ "کہہ دوں۔" عرض کیا گیا کہ "فرمایئے۔" پھر فرمایا کہ "کہہ دوں۔" عرض کیا گیا: "کہیے۔" پھر فرمایا کہ "کہہ دوں۔" عرض کیا گیا: "فرمایئے۔" پھر فرمایا: "تین سال کامل حضرت امداد [ان کے مرشد] کا چہرہ میرے قلب میں رہا اور میں نے ان سے پوچھے بغیر کوئی کام نہیں کیا۔" پھر اور جوش آیا، فرمایا: "کہہ دوں۔" عرض کیا گیا: "حضرت ضرور فرمایئے۔" فرمایا: "[اتنے] سال حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میرے قلب میں رہے اور میں نے کوئی بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھے بغیر نہیں کی۔" یہ کہہ کر اور جوش ہوا، فرمایا: "کہہ دوں۔" عرض کیا گیا کہ "فرمایئے۔" مگر خاموش ہو گئے۔ لوگوں نے اصرار کیا تو فرمایا کہ: بس رہنے دو۔" [12]

فنا فی الشیخ اہل تصوف کے ہاں ایک منزل ہے۔ اس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ انسان کو اپنے مرشد کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا ہے اور وہ ہر دم اس کے تصور میں فنا رہتا ہے۔ آداب مرشد کامل کے مصنف نے اس ضمن میں ایک حکایت بیان کی ہے کہ ایک بزرگ اپنے پیر صاحب سے ملنے آئے۔ وہاں ان کے دادا پیر (یعنی مرشد کے مرشد) بھی موجود تھے۔ پیر صاحب نے حکم دیا کہ وہ اپنے دادا پیر کے پاؤں کو بوسہ دیں۔ مرید نے جھک کر ایسا کرنے کی کوشش کی مگر بوسہ اپنے مرشد کے پاؤں ہی کو دیا۔ پیر صاحب خفا ہو گئے اور انہوں نے دوبارہ ایسا کرنے کا حکم دیا۔ مرید نے دوبارہ یہی کوشش کی مگر بوسہ اپنے مرشد ہی کے پاؤں کو دیا۔ کئی مرتبہ ایسا ہونے کے بعد دادا پیر صاحب نے فرمایا کہ اسے چھوڑ دو، یہ تمہاری ذات ہی میں فنا ہے اور اسے تمہارے علاوہ کوئی نظر نہیں آتا ہے۔

بعض صوفیاء تو غلامی مرشد میں اس مقام پر پہنچے ہیں کہ انہوں نے یہ کہا کہ اگر روز قیامت اللہ تعالیٰ ان کے پیر کی شکل میں ظاہر ہو گا تو وہ اس کی جانب دیکھیں گے ورنہ وہ معاذ اللہ، اللہ تعالیٰ سے بھی رخ پھیر لیں گے۔ [13] اسی طرح بہت سے لوگوں کو یہ دیکھا گیا ہے کہ ان

کے پیر ان کی بہنوں اور بیٹیوں سے بدکاری کا ارتکاب کرتے ہیں اور بھنگ چرس پیتے ہیں لیکن وہ اسے ان کی ولایت کی کوئی اداء سمجھ کر خاموش رہتے ہیں۔

اہل تصوف کے نقطہ نظر کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرید کو اپنے مرشد کا کامل غلام بن کر رہنا چاہیے۔ اس کی کسی بات پر سوال نہیں اٹھانا چاہیے اور اس کے ہر حکم کی آنکھ بند کر کے پیروی کرنی چاہیے اور اپنی ذات کو اس کی ذات میں فنا کر دینا چاہیے۔

اسائنمنٹس

- اہل تصوف کے ہاں مرشد کی نفسیاتی غلامی کا جو تصور پایا جاتا ہے، اسے دس نکات کی صورت میں بیان کیجیے۔
- اہل تصوف کو اس بات کی ضرورت محسوس کیوں ہوئی کہ مرشد و مرید میں آقا و غلام کا تعلق پیدا کیا جائے؟ اپنے غور و فکر سے جواب دیجیے۔

تعمیر شخصیت

قرآن مجید غیبت کو مردہ بھائی کا گوشت کھانے جیسا گندا کام قرار دیتا ہے۔ غیبت کرنے اور سننے سے دور رہیے۔

---

[1] مجلس علمی۔ آداب مرشد کامل۔ ص38۔(www.dawateislami.net (ac. 4 June 2008

[2] حوالہ بالا۔ ص36-38

[3] فتاوی رضویہ بحوالہ آداب مرشد کامل

[4] آداب مرشد کامل۔ حصہ سوم، ص5-6۔

[5] محمد اقبال ہوشیار پوری۔ اکابر کا سلوک و احسان۔ ص97۔ لاہور: ادارہ اسلامیات۔(www.ahlehaq.org (ac. 13 Oct 2011

[6] حوالہ بالا۔ ص91۔

[7] حوالہ بالا۔ ص91۔

[8] حکیم محمد اختر۔ ولی اللہ بننے کے پانچ نسخے۔ ص24۔ (www.khanqah.org (ac. 4 June 2008

[9] امیر علاء سنجری (ترجمہ: شمس بریلوی)۔ فوائد الفوائد۔ حصہ چہارم، تیسویں مجلس۔ دہلی: منظور بک ڈپو(1992) (www.scribd.com (13 Oct 2011

[10] عبدالرحمن کیلانی۔ شریعت و طریقت۔ لاہور: مکتبہ السلام(2006)۔(www.kitabosunnat.com (ac. 27 Apr 2011

[11] مجلس علمی۔ آداب مرشد کامل۔ حصہ 3، ص10۔

[12] ارواح ثلاثہ، حکایت 306

[13] دیکھیے ریاض السالکین

باب 9: نفسیاتی غلامی کے حق میں اہل تصوف کے دلائل

مرشد کی غلامی کے تصور کو اہل تصوف کے ہاں ایسی متفق علیہ حیثیت حاصل ہے کہ اس کے لیے وہ کسی بھی دلیل کی ضرورت محسوس نہیں کرتے ہیں۔ ان کے لیے قدیم صوفیاء کے ارشادات ہی کافی ہیں۔ بعض حضرات اس موضوع پر قرآن و حدیث سے کچھ دلائل پیش کرتے ہیں۔ دور جدید میں جب ناقدین تصوف نے اس موضوع پر تنقید کی تو بعض جدید تعلیم یافتہ صوفیاء نے ان کا جواب پیش کرتے ہوئے بعض عقلی دلائل بیان کیے ہیں۔ یہاں ہم انہی کو درج کر رہے ہیں۔

واقعہ موسی و خضر علیہما الصلوۃ والسلام

اہل تصوف کی دلیل

قرآن مجید کی سورۃ الکہف میں حضرت موسی اور خضر علیہما الصلوۃ والسلام کا واقعہ بیان ہوا ہے جسے اہل تصوف مرشد کی غلامی کے حق میں بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔ واقعہ کچھ یوں ہے:

وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِفَتَاهُ لا أَبْرَحُ حَتَّى أَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ أَوْ أَمْضِيَ حُقُباً (60) فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَباً (61) فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتَاهُ آتِنَا غَدَاءَنَا لَقَدْ لَقِينَا مِنْ سَفَرِنَا هَذَا نَصَباً (62) قَالَ أَرَأَيْتَ إِذْ أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّي نَسِيتُ الْحُوتَ وَمَا أَنْسَانِي إِلاَّ الشَّيْطَانُ أَنْ أَذْكُرَهُ وَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ عَجَباً (63) قَالَ ذَلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ فَارْتَدَّا عَلَى آثَارِهِمَا قَصَصاً (64) فَوَجَدَا عَبْداً مِنْ عِبَادِنَا آتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا عِلْماً (65) قَالَ لَهُ مُوسَى هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَى أَنْ تُعَلِّمَنِي مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْداً (66) قَالَ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِي صَبْراً (67) وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَى مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْراً (68) قَالَ سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ صَابِراً وَلا أَعْصِي لَكَ أَمْراً (69) قَالَ فَإِنْ اتَّبَعْتَنِي فَلا تَسْأَلْنِي عَنْ شَيْءٍ حَتَّى أُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْراً (70) فَانطَلَقَا حَتَّى إِذَا رَكِبَا فِي السَّفِينَةِ خَرَقَهَا قَالَ أَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ أَهْلَهَا لَقَدْ جِئْتَ شَيْئاً إِمْراً (71) قَالَ أَلَمْ أَقُلْ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِي صَبْراً (72) قَالَ لا تُؤَاخِذْنِي بِمَا نَسِيتُ وَلا تُرْهِقْنِي مِنْ أَمْرِي عُسْراً (73) فَانطَلَقَا حَتَّى إِذَا لَقِيَا غُلاماً فَقَتَلَهُ قَالَ أَقَتَلْتَ نَفْساً زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئاً نُكْراً (74) قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكَ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِي صَبْراً (75) قَالَ إِنْ سَأَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍ بَعْدَهَا فَلا تُصَاحِبْنِي قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَدُنِّي عُذْراً (76) فَانطَلَقَا حَتَّى إِذَا أَتَيَا أَهْلَ قَرْيَةٍ اسْتَطْعَمَا أَهْلَهَا فَأَبَوْا أَنْ يُضَيِّفُوهُمَا فَوَجَدَا فِيهَا جِدَاراً يُرِيدُ أَنْ يَنقَضَّ فَأَقَامَهُ قَالَ لَوْ شِئْتَ لاتَّخَذْتَ عَلَيْهِ أَجْراً (77) قَالَ هَذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ سَأُنَبِّئُكَ بِتَأْوِيلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَلَيْهِ صَبْراً (78) أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِينَ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ فَأَرَدْتُ أَنْ

أَعِيبَهَا وَكَانَ وَرَاءَهُمْ مَلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْباً (79) وَأَمَّا الْغُلامُ فَكَانَ أَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِينَا أَنْ يُرْهِقَهُمَا طُغْيَاناً وَكُفْراً (80) فَأَرَدْنَا أَنْ يُبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْراً مِنْهُ زَكَاةً وَأَقْرَبَ رُحْماً (81) وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنزٌ لَهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحاً فَأَرَادَ رَبُّكَ أَنْ يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنزَهُمَا رَحْمَةً مِنْ رَبِّكَ وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي ذَلِكَ تَأْوِيلُ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَلَيْهِ صَبْراً (82)

جبکہ موسیٰ نے اپنے نوجوان سے کہا کہ میں تو چلتا ہی رہوں گا یہاں تک کہ دو دریاؤں کے سنگم پر پہنچوں، خواہ مجھے سالہا سال چلنا پڑے۔ جب وہ دونوں دریا کے سنگم پر پہنچے، وہاں اپنی مچھلی بھول گئے جس نے دریا میں سرنگ جیسا اپنا راستہ بنالیا۔ جب یہ دونوں وہاں سے آگے بڑھے تو موسیٰ نے اپنے نوجوان سے کہا کہ ناشتا لے آیئے۔ ہمیں تو اپنے اس سفر سے سخت تکلیف اٹھانی پڑی۔ اس نے جواب دیا کہ کیا آپ نے بھی دیکھا کہ جب ہم پتھر سے ٹیک لگا کر آرام کر رہے تھے، وہیں میں مچھلی بھول گیا تھا، دراصل شیطان نے ہی مجھے بھلا دیا کہ میں آپ سے اس کا ذکر کروں۔ اس مچھلی نے ایک انوکھے طور پر دریا میں اپنا راستہ بنالیا۔ موسیٰ نے کہا یہی تھا، جس کی تلاش میں ہم تھے چناچہ وہیں سے اپنے قدموں کے نشان ڈھونڈتے ہوئے واپس لوٹے۔

پس ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا، جسے ہم نے اپنے پاس کی خاص رحمت عطا فرما رکھی تھی اور اسے اپنے پاس سے خاص علم سکھا رکھا تھا۔

موسیٰ نے اس سے کہا: "میں آپ کی تابعداری کروں؟ کہ آپ مجھے اس نیک علم کو سکھا دیں جو آپ کو سکھایا گیا ہے۔"

اس نے کہا: "آپ میرے ساتھ ہرگز صبر نہیں کر سکتے۔ اور جس چیز کو آپ نے اپنے علم میں نہ لیا ہو اس پر صبر کر بھی کیسے سکتے ہیں؟"

موسیٰ نے جواب دیا: "انشاءاللہ آپ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے اور کسی بات میں میں آپ کی نافرمانی نہ کروں گا۔"

اس نے کہا: "اچھا اگر آپ میرے ساتھ ہی چلنے پر اصرار کرتے ہیں تو یاد رہے کسی چیز کی نسبت مجھ سے کچھ نہ پوچھیے گا جب تک کہ میں خود اس کی نسبت کوئی تذکرہ نہ کروں۔"

پھر دونوں چلے، یہاں تک کہ ایک کشتی میں سوار ہوئے، [خضر] نے اس کے تختے توڑ دیئے، موسیٰ نے کہا: "کیا آپ اسے توڑ رہے ہیں کہ کشتی والوں کو ڈبو دیں، یہ تو آپ نے بڑی [خطرناک] بات کر دی۔"

[خضر نے] جواب دیا: "میں نے تو پہلے ہی آپ سے کہہ دیا تھا کہ تو آپ ساتھ ہرگز صبر نہ کر سکیں گے۔"

[موسیٰ نے] کہا: میری بھول پر مجھے نہ پکڑیے اور مجھے اپنے کام میں تنگی نہ ڈالیے۔"

پھر دونوں چلے، یہاں تک کہ ایک لڑکے کو پایا، خضر نے اسے مار ڈالا، موسیٰ نے کہا: "کیا آپ نے ایک پاک جان کو بغیر کسی جان کے عوض مار ڈالا؟ بیشک آپ نے تو بڑی ناپسندیدہ حرکت کی۔"

وہ کہنے لگے: "میں نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ آپ میرے ہمراہ رہ کر ہرگز صبر نہیں کر سکتے۔"

موسیٰ [علیہ السلام] نے جواب دیا: "اگر اب اس کے بعد میں آپ سے کسی چیز کے بارے میں سوال کروں تو بیشک آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھیے گا، یقیناً آپ میری طرف سے [حد] عذر کو پہنچ چکے۔"

پھر دونوں چلے ایک گاؤں والوں کے پاس آکر ان سے کھانا طلب کیا تو انہوں نے مہمانداری سے صاف انکار کر دیا۔ دونوں نے وہاں ایک دیوار پائی جو گرا ہی چاہتی تھی، اس نے اسے ٹھیک اور درست کر دیا، موسیٰ [علیہ السلام] کہنے لگے: "اگر آپ چاہتے تو اس پر اجرت لے لیتے۔"

اس نے کہا: "بس یہ جدائی ہے میرے اور آپ کے درمیان، اب میں آپ کو ان باتوں کی اصلیت بھی بتادوں گا جس پر آپ سے صبر نہ ہو سکا۔ کشتی تو چند مسکینوں کی تھی جو دریا میں کام کاج کرتے تھے۔ میں نے اس میں کچھ توڑ پھوڑ کا ارادہ کر لیا کیونکہ ان کے آگے ایک بادشاہ تھا جو ہر ایک [صحیح سالم] کشتی کو جبر اً ضبط کر لیتا تھا۔ اور اس لڑکے کے ماں باپ ایمان والے تھے، ہمیں خوف ہوا کہ کہیں یہ انہیں اپنی سرکشی اور کفر سے عاجز و پریشان نہ کر دے۔ اس لئے ہم نے چاہا کہ انہیں ان کا پروردگار اس کے بدلے اس سے بہتر پاکیزگی والا اور اس سے زیادہ محبت اور پیار والا بچہ عنایت فرمائے۔ دیوار کا قصہ یہ ہے کہ اس شہر میں دو یتیم بچے ہیں جن کا خزانہ ان کی اس دیوار کے نیچے دفن ہے، ان کا باپ بڑا نیک شخص تھا تو آپ کا رب یہ چاہتا تھا کہ یہ دونوں یتیم اپنی جوانی کی عمر میں آکر اپنا یہ خزانہ آپ کے رب کی مہربانی اور رحمت سے نکال لیں، میں نے اپنی رائے سے کوئی کام نہیں کیا یہ تھی اصل حقیقت اور ان واقعات کی جن پر آپ سے صبر نہ ہو سکا۔" (الکہف)

اہل تصوف اس واقعے کی بنیاد پر کہتے ہیں کہ حضرت خضر، حضرت موسی علیہما الصلوۃ والسلام کے مرشد تھے اور انہیں اللہ تعالی نے اپنی جانب سے ایک خاص علم دے رکھا تھا جس کے لیے "علم لدنی" کی اصطلاح اہل تصوف کے ہاں عام ہے جو آیت 65 کے لفظ من لدنا سے ماخوذ ہے۔ حضرت خضر نے سیدنا موسی کو کوئی سوال کرنے سے منع کیا تھا۔ جب انہوں نے حضرت خضر کے کچھ ایسے افعال دیکھے جو بظاہر خلاف شریعت تھے جیسے کشتی کا توڑنا یا بچے کو قتل کرنا، تو انہوں نے فوراً اعتراض جڑ دیا اور اس طرح گویا آداب مرشد کی خلاف ورزی کی جس کی پاداش میں انہیں حضرت خضر کی صحبت سے الگ ہونا پڑا۔ بالکل یہی معاملہ ایک مرید کو اپنے مرشد کے ساتھ روا رکھنا چاہیے اور اس کے کسی فعل پر کبھی اعتراض نہیں کرنا چاہیے خواہ وہ کتنا ہی خلاف شریعت نظر کیوں نہ آئے۔ صوفی محمد اقبال صاحب لکھتے ہیں:

موسی علیہ السلام نے ایک خاص قسم کی رشد وہدایت سیکھنے کے لیے خضر علیہ السلام کی معیت چاہی اور خضر علیہ السلام نے جواب دے دیا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہ کر سکیں گے۔۔۔۔ قصہ مختصر حضرت موسی علیہ السلام نے ضبط کا وعدہ فرما کر ہمراہی اختیار کی لیکن ضبط نہ کر سکے اور اعتراض کیا۔ آخر تیسری بار میں تفریق کی نوبت آگئی جیسا کہ مفصل حال سورہ کہف میں مذکور ہے۔

اسی طرح مریدوں کو اپنے شیخ کی ایسی اتباع کرنا چاہیے کہ اس پر اعتراض نہ کرے اور ادب اور تعمیل حکم شیخ کو فرض سمجھے۔ کسی طرح بھی انحراف کرنا مناسب نہیں۔ کیونکہ موسی علیہ السلام تو پیغمبر صاحب شریعت ہونے کی وجہ سے افضل تھے۔ محض طبعی شوق سے ایک ضروری علم سیکھنے کو خضر علیہ السلام کے ساتھ رہنے کے خواہاں ہوئے تھے تو اعتراض کرنے کی وجہ سے گو گنہگار نہیں ہوئے مگر اس علم سے تو ناکام رہے۔ پھر کیا پوچھنا مرید کا کہ جاہل بن کر راہبر شیخ کا دامن پکڑا اور ضروری علم یعنی معرفت خداوندی حاصل کرنے کے لیے اپنے سے افضل و اعلی کی معیت اختیار کی، پس اگر اعتراض کرے گا تو محروم رہ کر خسارہ ہی خسارہ اٹھائے گا۔

حضرت امام غزالی نے احیاء العلوم میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: "شیخ اپنی جماعت میں ایسا ہے جیسا نبی اپنی امت میں۔" اور نبی اسم مبارک ہادی کا مظہر ہوتا ہے، اس لیے ارشاد میں شیخ کو مظہر خدا [خدا کے اظہار کا مقام] فرمایا ہے اور ضیاء

القلوب میں حضرت سید الطائفہ حاجی [امداد اللہ مہاجر مکی] صاحب قدس سرہ ص 61 میں فرماتے ہیں کہ مرشد کے حکم و ادب کو خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم اور ادب کی جگہ سمجھے کیونکہ مرشدین خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نائب ہیں۔ [1]

ناقدین تصوف کا جواب

ناقدین تصوف اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ مرید و مرشد کے تعلق کو حضرت موسی و خضر علیہما الصلوۃ والسلام پر قیاس کرنا درست نہیں ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں:

- مفسرین کے بیان کے مطابق حضرت خضر علیہ الصلوۃ والسلام اللہ کے ایک نبی یا فرشتہ تھے جبکہ عام پیر نہ تو نبی ہوتے ہیں اور نہ فرشتہ۔
- حضرت خضر علیہ السلام، موسی علیہ السلام کے مرشد ہرگز نہ تھے بلکہ اللہ تعالی کے ایک خاص حکم کے تحت حضرت موسی علیہ السلام ان کے پاس گئے تھے۔
- اللہ تعالی نے بذریعہ وحی سیدنا موسی علیہ الصلوۃ والسلام کو حضرت خضر کے پاس جانے کا حکم دیا تھا اور یہ بتا دیا تھا کہ انہیں ہم نے اپنی جانب سے علم عطا کیا ہے۔ عام مرشد اور پیر کے بارے میں اللہ تعالی نے کوئی حکم نہیں دیا ہے اور ان کے "علم لدنی" کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے۔ پھر ہم ان کی اندھی تقلید کیسے کر سکتے ہیں؟
- حضرت موسی علیہ الصلوۃ والسلام نے خلاف شریعت معاملات دیکھ کر جو اعتراض کیا، وہ معاذ اللہ کوئی غلط کام نہیں تھا بلکہ انہوں نے وہی کیا جو ان کے جیسے جلیل القدر صاحب شریعت نبی کو کرنا چاہیے کہ فوراً پوچھ لیا۔ انہوں نے اس کی پرواہ نہ کی کہ ان سوالات کی وجہ سے انہیں حضرت خضر کی صحبت چھوڑنا پڑے گی۔ یہ درست ہے کہ انہیں حضرت خضر علیہ الصلوۃ والسلام نے تسلی بخش جواب دے دیا۔ یہی کام ہر شخص کو کرنا چاہیے کہ اگر وہ کوئی خلاف شریعت فعل دیکھے تو ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے استاذ یا شیخ سے پوچھ لے۔ اگر ان کے جواب سے تسلی ہو جائے تو ٹھیک ہے ورنہ ایسے شیخ یا استاذ کو چھوڑ دینا ہی بہتر ہے۔

ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ ان وجوہات کی بنیاد پر یہ غلط ہے کہ کوئی مرید اپنے مرشد کے خلاف شریعت کاموں پر اعتراض نہ کرے۔ مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

> خضر کو جو علم عطا ہوا تھا، اس کے متعلق قرآن میں اس طرح کا کوئی اشارہ نہیں ہے کہ اس علم نے ان کے لیے غیب کے تمام پردے اٹھا دیے تھے۔ اس سے زیادہ سے زیادہ جو کچھ نکلتا ہے، وہ صرف یہ ہے کہ اللہ تعالی نے چند معاملات میں خضر کو اپنی مشیت کی تنفیذ کا واسطہ بنایا تھا، اور ان کے اوپر ان معاملات کی حکمت بھی کھول دی تھی۔ جہاں تک حضرت موسی کا تعلق ہے، انہوں نے خضر کی باتیں جو گوارا کیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو وحی کے ذریعہ سے یہ ہدایت ہوئی تھی کہ وہ ان کے پاس ایک خاص امر کی تعلیم کے لیے جائیں۔ ان کا خدا کی طرف سے خضر کے پاس جانا

خود اس بات کی دلیل تھا کہ خضر خدا کے خاص بندے ہیں۔ ان کا علم قابل اعتماد ہے اور ان کا عمل خدا کے حکم کے خلاف نہیں ہو سکتا، چنانچہ حضرت موسی نے خضر[علیہما الصلوۃ والسلام] کی وہ باتیں جو ان کی نگاہ میں حق کے خلاف نظر آئیں، محض اس وجہ سے گوارا کیں کہ ان کو وحی کے ذریعہ سے خضر کے اوپر اعتماد کرنے کی ہدایت ہوئی تھی۔ اگر وحی کے ذریعے سے ان کو خضر پر اعتماد کرنے کی ہدایت نہ ہوتی تو یقیناً حضرت موسی، خضر کے ایک فعل کو بھی برداشت نہ کرتے۔ خود خضر نے بھی آخر میں حضرت موسی کو یہی اطمینان دلایا کہ مَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي کہ یہ جو کچھ میں نے کیا ہے، خدا کے حکم سے کیا ہے، اپنے جی سے نہیں کیا ہے۔۔۔۔

لیکن اس چیز کو آڑ بنا کر کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کوئی اقدام شریعت کے خلاف کر ڈالے اور جب اس پر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس کا یہ فعل شریعت کے خلاف ہے، تو وہ یہ جواب دے کہ میں نے تو یہ براہ راست خدا کے حکم کے تحت اس کی مشیت کی تنفیذ کی ہے، کیونکہ دوسروں کے پاس اس کے صدق و کذب کے جانچنے کا ذریعہ وحی الہی ہی ہے اور وحی الہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد منقطع ہو چکی ہے۔ اب حق و باطل کی کسوٹی قرآن و سنت ہے، اگر کسی شخص کا فعل کتاب و سنت کے خلاف ہو تو وہ اس عذر پر کتاب و سنت کی گرفت سے نہیں بچ سکتا کہ اس نے یہ جو کچھ بھی کہا یا کیا ہے، علم لدنی کی رہنمائی کے تحت کیا ہے اور یہ علم بجائے خود دلیل ہے، اس کو کسی اور کسوٹی پر جانچنے کی ضرورت نہیں ہے۔[2]

خلفائے راشدین کی بیعت

بیعت کے بارے میں صوفیاء کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیعت لی اور آپ کے بعد آپ کے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم لوگوں سے بیعت لیا کرتے تھے۔

ناقدین تصوف کا موقف یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بطور اللہ تعالی کے پیغمبر اور ایک حکمران کے بیعت لیا کرتے تھے۔ آپ کے بعد آپ کے خلفائے راشدین لوگوں سے صرف اور صرف بطور حکمران سمع و طاعت (سننے اور اطاعت کرنے) کی بیعت لیا کرتے تھے۔ کبھی کسی خلیفہ راشد نے دیگر صحابہ و تابعین کو مرید کرنے کی بیعت نہیں لی۔ ایسی ایک بھی روایت موجود نہیں ہے جس میں کسی خلیفہ راشد نے یہ کہلوا کر بیعت لی ہو کہ "میں آپ کا مرید ہوتا ہوں اور بلا مشروط آپ کی اطاعت کروں گا۔۔۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیعت بدعت ہے اور خلفائے راشدین کے طرز عمل کے خلاف ہے۔ خلفائے راشدین تو خود پر تنقید کی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔ اس پر تفصیلی دلائل آگے آ رہے ہیں۔

نفسیاتی غلامی کے حق میں عقلی دلائل

معالج و طبیب کی دلیل

اہل تصوف کا کہنا یہ ہے کہ پیر و مرید کا تعلق، ڈاکٹر اور مریض کے تعلق کی طرح ہے۔ جس طرح مریض اپنے جسمانی علاج کے لیے

ڈاکٹر سے رجوع کرتا ہے اور اس ضمن میں اس کی ہر بات مانتا ہے، ویسے ہی ایک مرید کو اپنے پیر کی ہر بات ماننی چاہیے کیونکہ وہ اس سے اپنا روحانی علاج کروا رہا ہے۔ اسی دلائل کو مولانا اشرف علی تھانوی صاحب نے اپنی کتب اور ملفوظات میں واضح کیا ہے جنہیں انہی کے سلسلہ بیعت کے ایک صوفی عالم سید شبیر احمد کاکا خیل اس طرح بیان کرتے ہیں:

'مرید کے لئے مرشد کی مثال ایک طبیب کی سی ہے یا ایک شفیق راہبر کی۔ شیخ مرید کو اپنی بصیرت کے مطابق طریقہ تعلیم کرتا ہے۔ یعنی مرید کو کچھ کرنے کو بتاتا ہے اور کچھ کرنے سے روکتا ہے۔ جس کے کرنے کے بارے میں بتاتا ہے اس میں کچھ کی مثال تو دوا کی سی ہوتی ہے کہ اس پر عمل اگر نہ ہو تو بیماری کا علاج نہیں ہو گا اور مرض بڑھے گا اور کچھ کی مثال غذا کی سی ہے جس سے روحانی قوت حاصل ہوتی ہے۔ اور جن سے روکتا ہے اس کی مثال پرہیز کی سی ہے پس اگر کوئی دوا اور غذا کا اہتمام تو کرے لیکن پرہیز نہ کرے تو اس کا بھی علاج نہیں ہو پاتا۔ بلکہ اس سے عین ممکن ہے کہ دوا ہی آئندہ کے لئے غیر مؤثر ہو جائے اور شیخ کو بعد میں اپنی دوا تبدیل کرنی پڑے۔

پس شیخ کا کام تعلیم کرنا ہے اور مرُید کا کام اس پر عمل کرنا۔ اگر مرُید عمل کرنے کے لئے تیار ہو لیکن شیخ تعلیم نہ کرے تب بھی کام نہیں ہو سکتا اور شیخ تعلیم کرے لیکن مرُید اس پر عمل نہ کرے تب بھی کام نہیں چلے گا۔ اس کے لئے شیخ کی صحبت کی ضرورت ہے اور اس کی غیر موجودگی میں مکاتبت یا کسی اور ذریعے سے رابطے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ مُرید کے ذمہ لازم ہے کہ شیخ کو اپنی حالت سے مطلع کرے جیسا کہ مریض ڈاکٹر کو مطلع کرتا ہے اور شیخ جو نسخہ تجویز کرے اس پر مرُید کو عمل کرنا پڑتا ہے۔

اس باہمی تعلق کو دو الفاظ کے ذریعے یاد رکھا جا سکتا ہے۔ "اطلاع و اتباع" پس مرشد کو بروقت اطلاع کرنا اور شیخ کی تجویز کا اتباع کرنا مرُید کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ اس باہمی تعلق کو مضبوط کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اپنے شیخ کے بارے میں مرُید کا یقین راسخ ہو کہ یہی شیخ میرے لئے سب سے زیادہ مفید ہے۔ یہ نہیں کہ یہی شیخ سب سے افضل ہے کیونکہ اس کا پتہ تو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو نہیں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ اس شیخ کے ساتھ اپنے آپ کو مقید کرے گا اور کسی اور شیخ کی طرف ہرگز متوجہ نہیں ہو گا چاہے وہ دوسرا شیخ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔ اسی کو توحید مطلب کہتے ہیں۔ اس کی مثال بھی بالکل ایسی ہے کہ علاج کے دوران کسی اور ڈاکٹر کی طرف رجوع کرنا علاج کو بگاڑ دیتا ہے۔ شیخ کے ان چار حقوق کو حضرت خواجہ مجذوب (رحمۃ اللہ علیہ) نے یوں نظم کیا ہے۔

چار حق مرشد کے ہیں رکھ ان کو یاد

اطلاع و اتباع و اعتقاد و انقیاد [3]

جس طرح استاد شاگرد کی گنجائش ہے یا جس طرح ڈاکٹر اور مریض کی گنجائش ہے اسی طرح پیری مریدی کی گنجائش ہے۔ ہر شخص اپنی اصلاح کے لیے ایک پیر کے ہاتھ میں ہاتھ دیتا ہے جس سے وہ اصلاح لیتا ہے۔ اپنی اصلاح فرض عین ہے اور پیر کا ہاتھ پکڑنا اس کے لیے ایک ذریعہ ہے۔ اس لیے اس کے جواز میں کیا اختلاف ہو سکتا ہے؟ مرید ایک طرح سے روحانی مریض ہے اور دوسری حیثیت سے تصوف کے علوم کا شاگرد ہے۔ دونوں حیثیتیں چونکہ ثابت ہیں۔ اس لیے مرید ہونا بھی جائز ہے اور پیر کا ہاتھ پکڑنا بھی جائز۔ [4]

اس کے جواب میں ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ تزکیہ نفس اور روحانی اور اخلاقی بیماریوں کا علاج ایک ایسا معاملہ ہے جس کے لیے پیر کی اندھی غلامی کی ضرورت نہیں ہے۔ تکبر، ریاکاری، حسد، بغض، حب دنیا، حب مال، شہوت پرستی اور اس قبیل کے دیگر اخلاقی امراض

کے علاج کے یہی کافی ہے کہ انسان قرآن و حدیث کا مطالعہ کرتا رہے، اچھے اور نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرے اور اپنا محاسبہ نفس کرتے ہوئے اپنی اصلاح کرتا رہے۔ اپنے اخلاقی علاج کے لیے یہی کافی ہے کہ نیک بزرگوں اور اچھے دوستوں کا اس حلقے کے لوگ ایک دوسرے کو اخلاقی اصلاح کے لیے مشورے دیتے رہیں، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کرتے رہیں اور اس راہ میں ایک دوسرے کی مشکلات کو حل کرتے رہیں۔

ایسا ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنے کسی بزرگ یا دوست کو اپنا راہنما(Mentor) بنا لے اور اس کے مشوروں پر چلتا رہے مگر اس کی اندھی تقلید قطعاً جائز نہیں ہے۔ یہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کا منصب ہے کہ آپ کی بات کو بلا چون وچرا مان لیا جائے۔ کسی شخص کی تعلیمات کو تنقید سے ماوراء قرار دینا، اسے پیغمبر خدا کے منصب پر فائز کرنا ہے۔ اس پر جو دلائل ناقدین تصوف پیش کرتے ہیں، وہ آگے آ رہے ہیں۔

ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ ڈاکٹر و مریض کے تعلق پر پیری مریدی کو اس وجہ سے قیاس نہیں کیا جا سکتا ہے کہ کوئی مریض بھی ڈاکٹر سے اندھی عقیدت نہیں رکھتا اور نہ اس کی بات کو تنقیدی عمل سے گزارے بغیر مانتا ہے۔ بلکہ مریض تو ڈاکٹر کے علاج کو ناقدانہ نظروں سے دیکھتا ہے، اگر مرض کی نوعیت شدید ہو تو دوسرے ڈاکٹروں سے بھی رائے (Second Opinion) لیتا ہے۔ وہ اگر اپنے ڈاکٹر کی کارکردگی سے مطمئن نہ ہو تو جب چاہے اسے تبدیل کر لیتا ہے۔ ہر بیماری کے علاج کے لیے الگ اسپیشلسٹ کے پاس جاتا ہے اور "یک در گیر محکم گیر" کے فلسفے پر عمل کرتے ہوئے ہر بیماری کے علاج کے لیے ایک ہی ڈاکٹر کے پاس نہیں جاتا ہے۔

اس کے جواب میں سید شبیر احمد لکھتے ہیں:

> کسی ایک بیماری کے علاج کے دوران ڈاکٹروں کا بدلنا مناسب نہیں سمجھا جاتا۔ اس صورت میں مرض کے بڑھنے کا اندیشہ ہوتا ہے کیونکہ ایک ڈاکٹر کے پاس آنے جانے سے جب اس ڈاکٹر کو مریض کا مرض کچھ سمجھ میں آنا شروع ہو جائے تو اگر اس وقت کسی نئے ڈاکٹر سے علاج شروع کر دیا جائے تو پھر اس کو نئے تجربات سے گزرنا ہو گا۔ اس لیے کسی بھی ڈاکٹر کو مرض سمجھنے کا مناسب وقت نہیں مل سکے گا اور مرض بعض دفعہ خطرناک صورت اختیار کر لے گا۔۔۔۔
>
> طب میں تو مختلف امراض کے مختلف ڈاکٹروں اور حکیموں سے رجوع مشاہد ہے کیونکہ مختلف امراض کے مختلف تخصص ہوتے ہیں لیکن طب روحانی یعنی تصوف میں اصل مرض ایک ہوتا ہے اور وہ دنیا کی محبت ہے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "حب الدنیا رأس کل خطیئۃ" اور اس کا علاج ایک ہے اور وہ ہے اللہ کی محبت پس اصل تصوف دل سے دنیا کی محبت کو نکال کر اس میں اللہ کی محبت کو پیدا کرنا ہے باقی تمام طریقے اس کے فروعات ہیں اس لیے ایک ہی پیر پر انحصار کیا جاتا ہے۔ ہزاروں لاکھوں لوگوں کے مشاہدے سے ہم یکسر کیسے انکار کر سکتے ہیں؟ اس لیے اسی میں بہتری ہے کہ ایک ہی پیر کے ساتھ تعلق قائم کیا جائے۔۔۔۔
>
> اس بات کی اہمیت اپنی جگہ ہے کہ پیر کو ایک ہونا چاہیئے لیکن اس کا لازمی نتیجہ پھر یہ ہونا چاہیئے کہ وہ پیر صحیح ہو، شیخ کامل بھی ہو اور مرید کو اس کے ساتھ مناسبت بھی ہو ورنہ وہی ہو گا جو اناڑی ڈاکٹر کے ہاتھ پھنسنے والوں کا ہوتا ہے۔ اس سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ پیر انتہائی سوچ سمجھ کر چُنا

جائے۔ لہٰذا پیر کامل کی نشانیوں کو اچھی طرح سمجھنا چاہیے۔ اپنے آپ کا اس کے ساتھ مناسبت کا اچھی طرح جائزہ لیا جائے۔ اس میں جلدی نہ کی جائے۔ جس پیر کا عقیدہ خراب ہو یا وہ مستند نہ ہو یا صریح فسق و فجور میں مبتلا ہو اس کے قریب بھی نہیں جانا چاہیئے اور اگر کوئی اس سے بیعت ہو گیا تو اس کا نبھانا ضروری نہیں چپکے سے کسی اور مستند پیر کے ساتھ اپنا تعلق قائم کرنا چاہیئے، لیکن اپنے گزشتہ پیر کی بے ادبی نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ وہ ابتدائی محسن ہے اس لیے باقی لوگ بے شک اس کے بارے میں کچھ بھی کہیں خود اس کے حق میں بے ادبی نہیں کرنی چاہیئے۔ اس وقت اس کا معاملہ والد کی طرح ہو جاتا ہے کہ اس کی بات ماننی تو نہیں کیونکہ وہ شریعت کی خلاف ورزی ہو گی لیکن اس کے ساتھ عرف کے مطابق اچھا برتاؤ کرنا چاہیئے۔۔۔۔

> میں نے صرف یہ کہا تھا کہ اس کی بے ادبی نہیں کرنی چاہیئے تاہم لوگوں کو یہ سمجھانا کہ بدعقیدہ اور فاسق فاجر شیخ سے بیعت نہیں ہونا چاہیے، ضروری ہے۔ اس طرح عام بات کرنا لوگوں کو بچانے کے لیے کافی ہو سکتا ہے بالخصوص ایسے شخص کی بات جو اس بات میں مبتلا رہ چکا ہو لوگوں کی ہدایت کے لیے زیادہ مفید ہو گی کیونکہ وہ دل سے کہے گا تاہم اپنے گزشتہ شیخ کے بارے میں اشد ضرورت کے بغیر کچھ نہ کہے اگر کوئی پوچھے تو اس کو اس چیز کے جاننے والوں کی طرف راغب کیا جائے۔[5]

ناقدین تصوف اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ عام صوفیاء کے ہاں وہ معاملہ نہیں ہے جو کہ سید شبیر احمد صاحب نے بیان کیا ہے۔ ان کے ہاں تو یہی درس دیا جاتا ہے کہ مرید اپنے شیخ کی ہستی میں فنا ہو جائے۔ اگر کوئی خلاف شریعت بات بھی دیکھے تو اپنی عقل کا فتور سمجھے۔ چنانچہ بہت سے صوفی حلقوں میں دیکھا گیا ہے کہ مرید واضح طور پر اپنے شیخ کو زنا یا ہم جنس پرستی تک کرتا ہوا دیکھتے ہیں مگر تصوف کی انہی تعلیمات کے سبب اس سے بدگمان نہیں ہوتے۔ اسی وجہ سے اہل تصوف کے ہاں بالعموم عقل بھی بہت مذمت کی جاتی ہے۔ مشہور ناقد تصوف ابن تیمیہ (661-728/1263-1327) لکھتے ہیں:

> اکثر متصوفین عقل کی مذمت کرتے ہیں اور اس کو عیب لگاتے ہیں۔ ان کی رائے یہ ہے کہ بلند احوال اور رفیع درجات، اس کو چھوڑے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے۔ وہ ایسے امور کا اقرار کرتے ہیں جسے صراحتاً عقل جھٹلاتی ہے۔ وہ سکر، جنون اور بے عقلی کی تعریف کرتے ہیں کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ معارف و احوال عقل کے زائل کیے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے۔[6]

ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ یہ درست ہے کہ انسان کو بڑوں کی بے ادبی نہیں کرنی چاہیے تاہم ادب و احترام کے ساتھ اختلاف رائے میں کیا حرج ہے؟ مذہبی علماء اور مشائخ کو چاہیے کہ وہ اپنے شاگردوں اور ارادت مندوں کو اس بات کی تلقین کریں کہ اصل معیار قرآن و حدیث ہے۔ اگر انہیں اپنے استاذ یا مرشد کی کوئی بات بھی قرآن و حدیث کے خلاف نظر آئے تو وہ ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان سے استفسار کر لیں۔ اس کے دو نتائج ہوں گے: یا تو شاگرد کو غلطی لگی ہو گی تو استاذ اس کی وضاحت کر کے اسے مطمئن کر دے گا۔ اس طرح شاگرد کے دل میں بھی بدگمانی پیدا نہ ہو گی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ واقعتاً استاذ یا مرشد نے غلطی کی ہو گی۔ اس صورت میں وہ اپنی اصلاح کر لے گا، اور یہ بات استاذ و شاگرد دونوں کے لیے مفید ہو گی۔ یہ بالکل اسی طرح ہے کہ مریض کو اگر ڈاکٹر کی کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو وہ سوال کر لیتا ہے۔ ممکن ہے کہ ڈاکٹر ہی کو غلطی لگے اور مریض کے سوال سے وہ درست نتیجے پر پہنچ جائے۔

تکبر کا خاتمہ

صوفیاء کے ہاں نفسیاتی غلامی کا ایک جواز یہ پیش کیا جاتا ہے کہ اس کی مدد سے وہ تکبر کو ختم کرتے ہیں۔ یہ لوگ مریدین میں تکبر کو ختم کرنے کے لیے بعض غیر معمولی طریقے اختیار کرتے ہیں۔ بطور مثال چند ایک واقعات پیش خدمت ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تکبر کو ختم کرنے کے لیے کیا طریقے اختیار کرتے ہیں۔ دیوبندی عالم اور صوفی مولانا محمد زکریا کاندھلوی صاحب (1982-1898) کے ملفوظات میں ہے:

> حضرت جنید بغدادی کے پاس کوئی شخص بیس سال رہا۔ ایک روز عرض کیا کہ اتنی مدت میں مجھے تو آپ سے کچھ حاصل نہ ہوا۔ وہ شخص اپنی قوم کا سردار اور برادری میں ممتاز تھا۔ آپ سمجھ گئے کہ اس کے دل میں بڑائی ہے۔ فرمایا: اچھا ایک بات کرو۔ اخروٹوں کا ایک ٹوکرا بھر کر خانقاہ کے دروازہ پر بیٹھ جاؤ اور پکارو کہ جو شخص مجھے ایک جوتا مارے گا، اس کو ایک اخروٹ دوں گا اور جو دو مارے گا، تو دو دوں گا۔ اس طرح زیادہ کرتے جاؤ۔ جب یہ کام کر چکو تو اخروٹ کا ٹوکرا خالی رہ جائے تب میرے پاس آؤ۔ اس شخص نے کہا: لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ حضرت! یہ کام تو مجھ سے ہرگز نہ ہوگا۔ حضرت جنید نے فرمایا: یہ وہ مبارک کلمہ ہے کہ اگر ستر برس کا کافر اس کو ایک مرتبہ صدق دل سے پڑھ لے تو واللہ! مومن ہو جائے مگر تو اس وقت اس کے پڑھنے سے کافر طریقت ہو گیا۔ جا نکل جا! تجھے مجھ سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔[7]

ایک روز فرمایا کہ شاہ ابو سعید گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ بغرض بیعت شاہ نظام الدین بلخی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بلخ تشریف لے گئے۔ شاہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کو اطلاع ہوئی کہ [ان کے مرشد کے] صاحبزادہ تشریف لاتے ہیں تو ایک منزل پر آکر استقبال کیا۔ اور بہت اعزاز و اکرام کے ساتھ لے کر بلخ پہنچے۔ وہاں پہنچ کر صاحبزادہ صاحب کی خوب خوب خاطریں کیں۔ ہر روز نئے نئے اور لذیذ سے لذیذ کھانے پکوا کر کھلاتے، ان کو مسند پر بٹھاتے، خود خادموں کی جگہ بیٹھتے۔ آخر جب شاہ ابو سعید نے اجازت چاہی کہ وطن واپس ہوں تو شاہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ نے بہت سی اشرفیاں بطور نذر پیش کیں۔ اس وقت شاہ ابو سعید نے عرض کیا: حضرت اس دنیاوی دولت کی مجھے ضرورت نہیں ہے، نہ اس کے لیے میں یہاں آیا۔ مجھے تو وہ دولت چاہیے جو آپ ہمارے یہاں سے لے کر آئے ہیں۔

بس اتنا ن سننا تھا کہ شاہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ آنکھ بدل گئے اور جھڑک کر فرمایا کہ جاؤ طویلہ میں جا کر بیٹھو اور کتوں کے دانہ راتب کی رکھو۔ غرض یہ طویلہ میں آئے۔ شکاری کتے ان کی تحویل میں دیے گئے کہ روز نہلائیں دھلائیں اور صاف ستھرا رکھیں۔ کبھی حمام چھکوایا جاتا اور کبھی شکار کے وقت شیخ گھوڑے پر سوار ہوتے اور یہ کتوں کی زنجیر تھام کر ہمراہ [پیدل] چلتے۔ آدمی سے کہہ دیا گیا کہ یہ شخص جو طویلہ میں رہتا ہے، اس کو دو روٹیاں جو کی دونوں وقت گھر سے لا دیا کرو۔ اب شاہ ابو سعید صاحب جب کبھی حاضر خدمت ہوتے تو شیخ نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتے، چماروں کی طرح دور بیٹھنے کا حکم فرماتے اور التفات بھی نہ فرماتے تھے کہ کون آیا اور کہاں بیٹھا۔

تین چار ماہ بعد ایک روز حضرت شیخ نے بھنگن کو حکم دیا کہ آج طویلہ کی لید اکٹھی کر کے لے جائے تو اس دیوانہ کے پاس سے گزریو اور جو طویلہ میں بیٹھا رہتا ہے۔ چنانچہ شیخ کے ارشاد کے بموجب بھنگن نے ایسا ہی کیا، پاس سے گزری کہ کچھ نجاست شاہ ابو سعید پر پڑی۔ شاہ ابو سعید کا چہرہ غصہ سے لال ہو گیا، تیوری چڑھا کر بولے: "نہ ہوا گنگوہ، ورنہ اچھی طرح مزہ چکھاتا، غیر ملک ہے، شیخ کے گھر کی بھنگن ہے، اس لیے کچھ کر نہیں سکتا۔"

بھنگن نے قصہ حضرت شیخ سے عرض کر دیا۔ حضرت نے فرمایا: ہاں ابھی بو ہے صاحبزادگی کی۔ پھر دو ماہ تک خبر نہ لی۔ اس کے بعد بھنگن کو حکم ہوا کہ آج پھر ویسا ہی کرے، بلکہ قصداً کچھ غلاظت شاہ ابو سعید پر ڈال کر جواب سنے کہ کیا ملتا ہے۔ چنانچہ بھنگن نے پھر ارشاد کی تعمیل کی۔ اس مرتبہ شاہ ابو سعید نے کوئی کلمہ زبان سے نہیں نکالا، ہاں تیز اور ترچھی نگاہ سے اس کو دیکھا اور گردن جھکا کر خاموش ہو رہے۔ بھنگن نے آکر حضرت شیخ سے عرض کیا کہ آج تو میاں کچھ بولے نہیں، تیز نظروں سے دیکھ کر چپ ہو رہے۔ حضرت شیخ نے فرمایا: ابھی کچھ بو باقی ہے۔ پھر دو چار ماہ کے بھنگن کو حکم دیا کہ اس مرتبہ لید گوبر کا بھرا ٹوکرا اس پر پھینک ہی دیجیو کہ پاؤں تک بھر جائیں۔ چنانچہ بھنگن نے ایسا ہی کیا مگر اب شاہ ابو سعید بن چکے تھے جو کچھ بننا تھا۔ اس لیے گھبرا گئے اور گڑگڑا کر کہنے لگے: "مجھ سے ٹھوکر کھا کر بیچاری گر گئی، کہیں چوٹ تو نہیں لگی؟" یہ فرما کر گری ہوئی لید جلدی جلدی اٹھا کر ٹوکرے میں ڈالنی شروع کی کہ لا میں بھر دوں۔" بھنگن نے قصہ حضرت شیخ سے آکر کہا کہ آج تو میاں جی غصہ کی جگہ الٹے مجھ پر ترس کھانے لگے اور لید بھر کر میرے ٹوکرے میں ڈال دی۔ شیخ نے فرمایا: "بس اب کام ہو گیا۔"

اسی دن شیخ نے خادم کی زبانی کہلا بھیجا کہ آج شکار کو چلیں گے، کتوں کو تیار کر کے ہمراہ چلنا۔ شام کو شیخ گھوڑے پر سوار، خدام کا مجمع ساتھ جنگل کی طرح چلے۔ شاہ ابو سعید کتوں کی زنجیر تھامے پابرکاب ہمراہ ہو لیے۔ کتے تھے زبردست شکاری، کھاتے پیتے توانا، اور ابو سعید بے چارے سوکھے بدن، کمزور، اس لیے کتے ان کے سنبھالے نہ سنبھلتے تھے۔ بہتیرا کھینچتے روکتے مگر وہ قابو سے باہر ہوتے جاتے تھے۔ آخر انہوں نے زنجیر کمر سے باندھ لی۔ شکار جو نظر پڑا تو کتے اس پر لپکے۔ اب شاہ ابو سعید بے چارے گر گئے اور زمین پر گھسٹتے کتوں کی کھینچتے کھینچتے چلے جاتے تھے۔ کہیں اینٹ لگی، کہیں کنکر چبھی، بدن سارا لہولہان ہو گیا مگر انہوں نے اف نہ کی۔ جب دوسرے خادم نے کتوں کو روکا اور ان کو اٹھایا تو یہ تھر تھر کانپے کہ حضرت خفا ہوں گے اور فرمائیں گے کہ حکم کی تعمیل نہ کی، کتوں کو روکا کیوں نہیں؟ شیخ کو تو امتحان مقصود تھا، سو ہو لیا۔ اسی شب شیخ نے اپنے مرشد قطب العالم شیخ عبد القدوس کو خواب میں دیکھا کہ رنج کے ساتھ فرماتے ہیں: "نظام الدین! میں نے تجھ سے اتنی کڑی محنت نہ لی تھی، جتنی تو نے میری اولاد سے لی۔" صبح ہوتے ہیں شاہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ نے شاہ ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ کو طویلہ سے بلا کر چھاتی سے لگا لیا اور فرمایا کہ خاندان چشتیہ کا فیضان میں ہندوستان سے لے کر آیا تھا، تم ہی ہو جو میرے پاس سے اس فیضان کو ہندوستان لیے جاتے ہو۔ مبارک ہو، وطن جاؤ۔ غرض مجاز حقیقت بنا کر ہندوستان واپس فرمایا۔[8]

اسی کتاب میں مولانا رشید احمد گنگوہی (1829-1905) کا واقعہ ان ہی کی زبانی اس طرح بیان ہوا ہے:

دوپہر کو کھانا مکان سے آیا تو ایک پیالہ میں کوفتے تھے، نہایت لذیذ اور دوسرے پیالہ میں معمولی سالن تھا۔ اعلیٰ حضرت [حاجی امداد اللہ مہاجر مکی] نے مجھے [مولانا رشید احمد گنگوہی کو] دستر خوان پر بٹھالیا مگر کوفتوں کا پیالہ مجھ سے علیحدہ اپنی طرف رکھا اور معمولی سالن کا پیالہ میرے قریب سرکا دیا۔ میں اپنے حضرت کے ساتھ کھانا کھانے لگا۔ اتنے میں حافظ ضامن صاحب تشریف لائے۔ کوفتوں کا پیالہ مجھ سے دور رکھا ہوا دیکھ کر اعلیٰ حضرت سے فرمایا: بھائی صاحب! رشید احمد کو اتنی دور ہاتھ بڑھانے میں تکلیف ہوتی ہے، اس پیالہ کو ادھر کیوں نہیں رکھ لیتے۔ اعلیٰ حضرت نے بے ساختہ جواب دیا: "اتنا بھی غنیمت ہے کہ اپنے ساتھ کھلا رہا ہوں، جی تو یوں چاہتا تھا کہ چوڑھوں چماروں کی طرح الگ ہاتھ پر روٹی رکھ دیتا۔" اس فقرہ پر اعلیٰ حضرت نے میرے چہرے پر نظر ڈالی کہ کچھ تغیر تو نہیں آیا مگر الحمد للہ میرے قلب پر بھی اس کا کچھ اثر نہ تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ حقیقت میں جو کچھ حضرت فرما رہے ہیں، بالکل سچ ہے۔ اس دربار سے روٹی ہی کا ملنا کیا تھوڑی نعمت ہے، جس طرح بھی ملے بندہ نوازی ہے۔[9]

ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ وہ اس بات پر اہل تصوف سے متفق ہیں کہ تکبر ایک بہت بڑی برائی بلکہ بہت سی برائیوں کی جڑ ہے اور

اسے ختم کرنا دین کا حکم ہے۔ تاہم اس تکبر کو ختم کرنے کے لیے اہل تصوف کے ہاں جو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں، وہ دینی اور نفسیاتی اعتبار سے نہایت غلط ہیں اور ان کے اثرات مضر ہوتے ہیں۔

اوپر بیان کردہ واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اہل تصوف کے ہاں انسان کی شخصیت اور عزت نفس کو بالکل کچل کر مسخ کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ خود کو اتنا ذلیل و حقیر محسوس کرتے ہوئے اس مقام پر آ جاتا ہے کہ احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس سے اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت معطل ہو جاتی ہے، شخصیت مسخ ہو جاتی ہے اور اس کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ وہ اپنے مرشد کا مکمل طور پر نفسیاتی غلام بن جاتا ہے۔ اگر پیر صاحب کوئی اچھے آدمی ہوں تو معاملہ زیادہ نہیں بگڑتا لیکن اگر وہ کوئی مخالف شریعت پیر ہو تو پھر وہ اس مرید کا بھرپور نفسیاتی، مالی اور حتی کہ جنسی استحصال کرتا ہے۔ ایسے واقعات عام ہیں جب مخالف شریعت پیر نے اپنے مرید کی نفسیاتی غلامی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے ساتھ بد فعلی کی، یا اس کی بہن یا بیٹی کے ساتھ بدکاری کی۔

ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ اہل تصوف کے ہاں سوال کرنا اور اپنے ذہن سے سوچنا بھی تکبر کے زمرے میں آتا ہے جبکہ دین اسلام میں تکبر کی تعریف بالکل مختلف ہے۔ ایک حدیث میں ہے:

وحدثنا محمد بن المثنى ومحمد بن بشار وإبراهيم بن دينار، جميعا عن يحيى بن حماد. قال ابن المثنى: حدثني يحيى ابن حماد. أخبرنا شعبة عن أبان بن تغلب، عن فضيل الفقيمي، عن إبراهيم النخعي، عن علقمة، عن عبدالله بن مسعود، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: لا يدخل الجنة من كان في قلبه مثقال ذرة من كبر" قال رجل: إن الرجل يحب أن يكون ثوبه حسنا ونعله حسنة. قال: "إن الله جميل يحب الجمال. الكبر بطر الحق وغمط الناس".

سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جنت میں وہ شخص داخل نہ ہو گا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہو۔" ایک شخص نے عرض کیا؛ "آدمی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کا کپڑا اور جوتا اچھا ہو [تو کیا یہ بھی تکبر ہے؟]" آپ نے فرمایا: "اللہ تعالی جمیل ہے اور خوبصورتی کو پسند فرماتا ہے۔ تکبر تو حق کو جھٹلانا اور لوگوں کو حقیر سمجھنے کا نام ہے۔" (مسلم، کتاب الایمان، حدیث 147)

ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالی کو انسان کی خوبصورتی اور عزت نفس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ویسے بھی خوبصورتی اور عزت نفس کا گہرا تعلق ہے۔ انسان اسی لیے بنتا سنورتا ہے کہ لوگ اسے اچھا محسوس کریں۔ اس چیز کا تکبر سے کوئی تعلق نہیں۔ تکبر تو اس چیز کا نام ہے کہ انسان دوسروں کو حقیر سمجھنا شروع کر دے اور جب اس کے سامنے حق بات پیش کی جائے تو وہ اپنی بڑائی کے زعم میں اس کو نہ جھٹلائے بلکہ اسے قبول کر لے۔ اس کے برعکس عزت نفس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو عزت دے اور اس بات کو پسند نہ کرے کہ دوسرے اسے حقیر سمجھیں۔ ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ صوفیاء نے عزت نفس اور تکبر کو خلط ملط کر دیا ہے۔ شیخ ابو سعید کے اوپر بیان کردہ واقعے اور اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ عبد الرحمن کیلانی (d. 1995) لکھتے ہیں:

جس چیز کو شیخ نظام الدین تکبر سے تعبیر فرما رہے ہیں، وہ تکبر نہیں بلکہ ذلت و تحقیر اور اہانت نفس کا احساس ہے جو ایک مومن کو کسی قیمت پر گوارا نہیں ہوتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تکبر کی تعریف یوں بیان فرمائی کہ: "تکبر یہ ہے کہ تو حق بات کی پرواہ نہ کرے اور دوسرے لوگوں کو حقیر سمجھے۔" اب بتلایئے کہ یہ تعریف بھنگن کے کسی مسلمان پر غلاظت کا ڈھیر پھینکنے پر صادق آسکتی ہے؟ عزت نفس کو تکبر کہنا تو وہی درست قرار دے سکتا ہے جو نفس کشی کے درپے ہو اور معرفت کے موتی تلاش کر رہا ہو، جس کا شریعت نے قطعاً کوئی حکم نہیں دیا۔ نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے ایسا موتی اس طرح طرح کے بیہودہ طریقوں سے تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔[10]

ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ تکبر کو ختم کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ لوگوں میں حق پرستی پیدا کی جائے اور ان کی تربیت کی جائے کہ جب ان کے سامنے حق اور درست بات آجائے تو وہ سر تسلیم خم کر دیں۔ اس کے برعکس دیکھا گیا ہے کہ جب صوفیاء کے سامنے قرآن و سنت سے دلائل پیش کیے جائیں تو وہ انہیں تسلیم نہیں کرتے بلکہ اپنے بزرگوں کے واقعات اور اقوال سے چمٹے رہتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ ان سے یا ان کے پیروں سے ادب و احترام کے ساتھ بھی اختلاف رائے کرے، وہ اسے حقیر سمجھتے ہیں اور اس سے نفرت کرتے ہیں۔ یہی تو وہ تکبر ہے جس سے بچنے کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا ہے۔

ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ انسانی شخصیت کو مسخ کرنا، اسے احساس کمتری میں مبتلا کرنا اور اسے نفسیاتی غلام بنانا دین اسلام کا طریقہ نہیں ہے۔ نفسیاتی غلامی سے متعلق ابواب میں تفصیل سے یہ بحث موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی اپنے صحابہ کو اپنا نفسیاتی غلام نہیں بنایا بلکہ ان سے مشورہ لیا اور اکثر اوقات اپنی رائے کے خلاف ان کے مشوروں پر عمل فرمایا۔ قرآن مجید کی پوری دعوت ہی سوچنے اور سمجھنے کی دعوت ہے۔

اگلے باب میں اس نفسیاتی غلامی کے خلاف ہم انشاء اللہ ناقدین تصوف کے دلائل کا مطالعہ کریں گے۔

اسائن منٹس

- اہل تصوف، نفسیاتی غلامی کے حق میں جو دلائل پیش کرتے ہیں، انہیں نکات کی صورت میں لکھیے۔
- واقعہ موسی و خضر علیہما الصلوۃ والسلام سے اہل تصوف کیا نتائج اخذ کرتے ہیں؟ ناقدین تصوف ان نتائج پر کیا تنقید کرتے ہیں؟
- کیا نفسیاتی غلامی، تکبر کے علاج میں مفید ہے؟ علم نفسیات کی روشنی میں جواب دیجیے۔

تعمیر شخصیت

اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کیجیے۔ ان کا حق خدا کے بعد سب سے اہم ہے۔

[1]محمد اقبال ہوشیار پوری۔ اکابر کا سلوک و احسان۔ ص98۔لاہور: ادارہ اسلامیات۔(www.ahlehaq.org (ac. 13 Oct 2011

[2]امین احسن اصلاحی۔ تزکیہ نفس۔ جلد 1۔ ص74-73۔

[3]سید شبیر احمد کاکاخیل۔ فہم تصوف۔ ص38۔

[4]سید شبیر احمد کاکاخیل۔ تصوف سے متعلق عام پوچھے جانے والے سوالات۔ (www.tazkiya.org (ac. 22 Apr 2011

[5]حوالہ بالا۔

[6]ابن تیمیہ۔ مجموعۃ الفتاوی، جلد 5۔ (www.al-mishkat.org (ac. 27 Dec 2006

[7]محمد اقبال ہوشیار پوری۔ اکابر کا سلوک و احسان۔ ص41۔

[8]حوالہ بالا۔ ص56-54۔

[9]حوالہ بالا۔ ص92۔

[10]عبدالرحمن کیلانی۔ شریعت و طریقت۔ ص357۔

باب 10: نفسیاتی غلامی کے خلاف ناقدین تصوف کے دلائل

نفسیاتی غلامی کے حق میں اہل تصوف کے دلائل کا مطالعہ ہم پچھلے باب میں کر چکے ہیں۔ اس باب میں ہم ان دلائل کا مطالعہ کریں گے جو ناقدین تصوف، نفسیاتی غلامی کے خلاف قرآن و حدیث اور عقل عام سے پیش کرتے ہیں:

قرآن مجید میں نفسیاتی غلامی کی ممانعت

قرآن مجید میں یہود و نصاریٰ کا یہ جرم بیان ہوا ہے:

اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَاباً مِنْ دُونِ اللَّهِ.

انہوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو اللہ کے سوا معبود بنا لیا تھا۔ (التوبہ 9:31)

اس آیت کی تشریح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح منقول ہے کہ سیدنا عدی بن حاتم طائی رضی اللہ عنہ، جب عیسائیت چھوڑ کر اسلام لائے تو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

حدثنا الحسين بن يزيد الكوفي حدثنا عبد السلام بن حرب عن غطيف بن أعين عن مصعب بن سعد عن عدي بن حاتم قال أتيت النبي صلى الله عليه وسلم وفي عنقي صليب من ذهب فقال يا عدي اطرح عنك هذا الوثن وسمعته يقرأ في سورة براءة { اتخذوا أحبارهم ورهبانهم أربابا من دون الله } قال أما إنهم لم يكونوا يعبدونهم ولكنهم كانوا إذا أحلوا لهم شيئا استحلوه وإذا حرموا عليهم شيئا حرموه.

سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور میری گردن میں سونے کی ایک صلیب تھی۔ آپ نے فرمایا: "عدی! اس بت کو اتار دو۔" میں نے آپ کو سورۃ براءت کی یہی آیت کہ "انہوں نے اپنے علماء و مشائخ کو معبود بنا دیا تھا" تلاوت کرتے ہوئے سنا۔ آپ نے فرمایا: "یہ لوگ ان [علماء و مشائخ] کی عبادت تو نہ کرتے تھے مگر جب وہ کسی چیز کو حلال قرار دیتے تو اسے حلال سمجھ لیتے اور جب وہ کسی چیز کو حرام قرار دیتے تو اسے حرام مان لیتے۔" (ترمذی، کتاب التفسیر، حدیث 3095)

ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ اس آیت و حدیث کا اطلاق ان اہل تصوف پر ہوتا ہے جو علماء و مشائخ کی اندھی پیروی کرتے ہیں۔ غیر مشروط اطاعت کا دعوی ہی خدائی کا دعوی ہے۔

اس کے جواب میں مخالف شریعت صوفی تو کچھ نہیں کہتے کیونکہ ان کے نظریے کی بنیاد قرآن و حدیث پر نہیں بلکہ ان کے بزرگوں کے اقوال پر ہے، البتہ پابند شریعت صوفیاء کہتے ہیں کہ ان پر اس آیت و حدیث کا اطلاق درست نہیں ہے کیونکہ وہ اپنے مرشد کی پیروی اسی بات میں کرتے ہیں، جو شریعت کے مطابق ہو۔ اگر مرشد کی کوئی بات خلاف شریعت ہو تو اس کی پیروی کی تلقین وہ بھی نہیں کرتے

ہیں۔

اس کے جواب میں ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ صورتحال عملاً اس سے مختلف نہیں ہوتی۔ صوفی خواہ کسی سلسلہ سے بھی تعلق رکھتے ہوں، اپنے مریدین کو یہی نصیحت کرتے ہیں کہ مرشد کی کسی بات پر اعتراض نہ اٹھائیں۔ اگر کوئی بات خلاف شریعت معلوم ہو تو تب بھی اپنی سمجھ کا قصور ہی گردانیں۔ جب یہ ذہنیت بنادی جائے گی تو پھر مرید بے چارہ کہاں اپنے شیخ کی باتوں کو تنقیدی انداز میں قرآن و سنت پر پیش کرے گا۔ اس کے بعد تو وہ یہی سمجھے گا کہ یہ بزرگ قرآن و حدیث کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں، اس لیے کچھ سوچ کر ہی کر رہے ہوں گے۔ سید ابو الاعلی مودودی لکھتے ہیں:

> جس طرح پانی جیسی حلال چیز بھی اس وقت ممنوع ہو جاتی ہے جو وہ مریض کے لیے نقصان دہ ہو، اس طرح [تصوف کا] یہ قالب بھی مباح ہونے کے باوجود اس بنا پر قطعی چھوڑ دینے کے قابل ہو گیا ہے کہ اسی کے لباس میں مسلمانوں کو افیون کا چسکا لگایا گیا ہے اور اس کے قریب جاتے ہی ان مزمن مریضوں کو پھر وہی چنیا بیگم یاد آجاتی ہیں جو صدیوں ان کو تھپک تھپک کر سلاتی رہی ہیں۔ بیعت کا معاملہ پیش آنے کے بعد کچھ دیر نہیں لگتی کہ مریدوں میں وہ ذہنیت پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے جو مریدی کے ساتھ مختص ہو چکی ہے یعنی "بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید" [یعنی اگر پیر تمہیں جاء نماز کو شراب سے رنگین کرنے کا حکم دے تو کر گزرو] والی ذہنیت، جس کے بعد پیر صاحب میں اور ارباب من دون اللہ میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ فکر و نظر مفلوج، قوت تنقید ماؤف، علم و عقل کا استعمال موقوف، اور دل و دماغ پر بندگی شیخ کا ایسا مکمل تسلط کہ گویا شیخ ان کا رب ہے اور یہ اسی کے مربوب۔
>
> پھر جہاں کشف و الہام کی بات چیت شروع ہوئی، معتقدین کی ذہنی غلامی کے بند اور زیادہ مضبوط ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد صوفیانہ رموز و اشارات کی باری آتی ہے، جس سے مریدوں کی قوت واہمہ کو گویا تازیانہ لگ جاتا ہے اور وہ انہیں لے کر ایسی اڑتی ہے کہ بے چارے ہر وقت عجائبات و طلسمات ہی کے عالم میں سیر کرتے رہتے ہیں، واقعات کی دنیا میں ٹھیرنے کا موقع غریبوں کو کم ہی ملتا ہے۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، خلفاء راشدین اور نفسیاتی آزادی

ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی کسی کو اپنی اندھی اطاعت کا حکم نہیں دیا تھا۔ جن معاملات میں آپ پر وحی نازل ہوتی، ان میں تو آپ کی اتباع کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا لیکن عام معاملات میں آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے نہ صرف مشورہ فرماتے بلکہ انہیں خود سے اختلاف رائے کا حق بھی دیتے۔ اختلاف رائے کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کا طرز عمل یہ ہوا کرتا تھا کہ آپ مختلف رائے کو دبانے کی بجائے اس پر مثبت انداز میں غور و خوض فرماتے اور کئی مرتبہ ایسا ہوتا کہ اپنی رائے کی بجائے کسی صحابی کی رائے کو ترجیح دے دیا کرتے تھے۔ اگر آپ صحابہ کی رائے سے متفق نہ ہوتے تو انہیں مثبت انداز میں متفق کرنے کی کوشش فرماتے۔ اظہار رائے کی اس آزادی کی کچھ مثالیں یہ ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنی رائے سے ایک مشورہ دیا۔ جب اس سے انہیں کچھ نقصان ہوا تو آپ نے وضاحت فرما دی کہ آپ کی اطاعت صرف اسی معاملے میں فرض ہے جس میں آپ کسی حکم کو دین کی حیثیت سے جاری فرمائیں۔

حدثنا عبدالله بن الرومي اليمامي وعباس بن عبدالعظيم العنبري وأحمد بن جعفر المعقري. قالوا: حدثنا النضر بن محمد. حدثنا عكرمة (وهو ابن عمار). حدثنا أبو النجاشي. حدثني رافع بن خديج قال: قدم نبي الله صلى الله عليه وسلم المدينة. وهم يأبرون النخل. يقولون يلقحون النخل. فقال "ما تصنعون؟". قالوا: كنا نصنعه. قال "لعلكم لو لم تفعلوا كان خيرا" فتركوه. فنفضت أو فنقصت. قال فذكروا ذلك له فقال "إنما أنا بشر. إذا أمرتكم بشيء من دينكم فخذوا به. وإذا أمرتكم بشيء من رأي. فإنما أن بشر، انتم أعلم بأمر دنياكم"

سیدنا رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو اہل مدینہ کھجوروں کی پیوند کاری کیا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا، "تم لوگ یہ کیا کرتے ہو۔" وہ بولے، "ہم تو یہی کرتے آ رہے ہیں۔" آپ نے فرمایا، "اگر تم یہ نہ کرو تو ہو سکتا ہے کہ بہتر ہو۔" انہوں نے پیوند کاری چھوڑ دی جس کے نتیجے میں پیداوار کم ہو گئی۔ انہوں نے جب آپ سے ذکر کیا تو آپ نے فرمایا، "میں تو ایک انسان ہوں [مگر اللہ کا رسول ہوں۔] اگر میں تمہیں دین سے متعلق کوئی حکم دوں تو اس پر عمل کروں اور اگر اپنی رائے سے تمہیں کوئی بات کہوں تو میں انسان ہی ہوں۔ تم اپنے دنیاوی امور کو خود بہتر جانتے ہو۔" (مسلم، کتاب الفضائل، حدیث 6127)

اس سے اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بات محض عجز و انکسار کی وجہ سے ارشاد فرمائی۔ بہت سے دیگر واقعات سے یہ علم ہوتا ہے کہ اس کے بعد آپ اور آپ کے صحابہ کا یہی معمول رہا۔ چند واقعات یہ ہیں:

جنگی پلاننگ میں اختلاف رائے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنگی پلاننگ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مشورے سے کیا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قرآن مجید میں آپ کو اسی کا حکم دیا گیا تھا۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الأَمْر.

ان سے درگزر کرتے رہیے، ان کی بخشش کی دعا کرتے رہیے اور معاملات میں ان سے مشورہ کرتے رہیے۔ (آل عمران 3:159)

وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلاةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ.

[اہل ایمان تو وہ ہیں] جو اپنے رب کی پکار کا جواب دیتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور اپنے معاملات کو مشورے سے چلاتے ہیں۔ (شوری 42:38)

جنگ بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم نے ایک مقام پر قیام کرتے ہوئے ایک جنگی حکمت عملی ترتیب دی لیکن اس کے بعد

آپ نے ایک صحابی سیدنا حباب بن منذر رضی اللہ عنہ کے مشورے پر اس جنگی حکمت عملی میں تبدیلی فرمائی۔

قال الحباب بن المنذر يا رسول الله إن هذا المكان الذي أنت به ليس بمنزل انطلق بنا إلى أدنى ماء إلى القوم فإني عالم بها وبقلبها بها قليب قد عرفت عذوبة مائه لا ينزح ثم نبني عليه حوضا فنشرب ونقاتل ونعور ما سواه من القلب فنزل جبريل على رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال الرأي ما أشار به الحباب فنهض رسول الله صلى الله عليه وسلم ففعل ذلك۔

حباب بن منذر رضی اللہ عنہ کہنے لگے، "یارسول اللہ! جس مقام پر آپ ٹھہرے ہوئے ہیں، مناسب نہیں ہے۔ ہمیں نیچے پانی کی طرف چلنا چاہیے۔ میں اس جگہ سے واقف ہوں اور جانتا ہوں کہ یہ میٹھا پانی ہے۔ ہم پانی کا بہاؤ تبدیل کر کے اسے ایک حوض کی شکل دے لیں گے اور اس سے پانی پئیں گے، جنگ کریں گے اور صرف ہم ہی اس سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔ جبریل اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کے پاس اترے اور کہنے لگے کہ حباب کی رائے درست ہے۔ آپ اٹھے اور آپ نے اسی رائے پر عمل کیا۔[2]

جنگ احد کے موقع پر آپ نے اپنی رائے کے خلاف نوجوان صحابہ کی رائے کے مطابق شہر سے باہر نکل کر مقابلہ فرمایا۔

فكان رأي رسول الله صلى الله عليه وسلم أن لا يخرج من المدينة لهذه الرؤيا فأحب أن يوافق على مثل رأيه فاستشار أصحابه في الخروج فأشار عليه عبد الله بن أبي بن سلول أن لا يخرج وكان ذلك رأي الأكابر من المهاجرين والأنصار فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم امكثوا في المدينة واجعلوا النساء والذراري في الآطام فقال فتيان أحداث لم يشهدوا بدرا فطلبوا من رسول الله صلى الله عليه وسلم الخروج إلى عدوهم ورغبوا في الشهادة وقالوا اخرج بنا إلى عدونا فغلب على الأمر الذي يريدون الخروج۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کی رائے یہ تھی کہ مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ نہ کیا جائے۔ آپ کے خواب کے مطابق یہی رائے پسندیدہ تھی۔ آپ نے اپنے صحابہ سے نکلنے کے بارے میں مشورہ کیا۔ عبداللہ بن ابی کا مشورہ یہ تھا کہ باہر نکل کر مقابلہ نہ کیا جائے اور مہاجرین و انصار کے بزرگوں کی رائے بھی یہی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم نے فرمایا، "مدینہ میں ٹھہرے رہو اور بچوں اور خواتین کو محفوظ مقام پر چھوڑ دو۔ نئے نوجوان لڑکے جنہوں نے بدر کی جنگ میں حصہ نہیں لیا تھا، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم سے یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ باہر نکل کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے۔ یہ لوگ شہادت کی شدید خواہش رکھتے تھے۔ وہ بولے، "ہم دشمن کی طرف نکل کر چلیں۔" باہر نکل کر مقابلہ کرنے والوں کی رائے [کثرت رائے کے باعث] غالب ہو گئی [اور باہر نکل کر ہی مقابلہ کیا گیا۔][3]

جنگ خندق میں ایک سابقہ غلام، سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورے سے خندق کھودنے کا فیصلہ فرمایا۔ جنگ کا یہ طریق کار سن کر صحابہ بہت حیران ہوئے کیونکہ جنگ کرنے کا یہ طریقہ عرب میں رائج نہیں تھا۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے صحابہ کو اظہار رائے کی آزادی کس حد تک حاصل تھی اور اس میں آزاد، غلام اور سابقہ غلام ہر شخص کو رائے دینے کا برابر حق حاصل تھا۔

اعتراض کا مثبت انداز میں جواب

آپ نے جب سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو ایک فوجی مہم کا امیر بنا کر بھیجا تو اس پر کچھ لوگوں نے اعتراض کیا۔ آپ نے انہیں کا فر

ومشرک یا گستاخ رسول قرار دینے کی بجائے انہیں مثبت انداز میں قائل فرمایا۔

حدثنا إسماعيل: حدثنا مالك، عن عبد الله بن دينار، عن عبد الله بن عمر رضي الله عنهما: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم بعث بعثا، وأمر عليهم أسامة بن زيد، فطعن الناس في إمارته، فقام النبي صلى الله عليه وسلم فقال: (إن تطعنوا في إمارته فقد كنتم تطعنون في إمارة أبيه من قبل، وايم الله إن كان لخليفا للإمارة، وإن كان لمن أحب الناس لي، وإن هذا لمن أحب الناس إلي بعده).

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم نے ایک لشکر بھیجا اور اس کا امیر اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو بنا کر بھیجا۔ لوگوں نے ان کے امیر ہونے پر اعتراض کیا تو نبی صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کھڑے ہوئے اور فرمایا، "تم لوگ ان کی امارت پر اعتراض کر رہے ہو جبکہ تم نے اس سے پہلے ان کے والد کی امارت پر بھی اعتراض کیا تھا۔ خدا کی قسم وہ امارت کے سب سے زیادہ اہل تھے۔ وہ مجھے تمام لوگوں میں سب سے زیادہ پسند تھے اور ان کے بعد اسامہ مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے۔" (بخاری، کتاب الفضائل، حدیث 3730)

مشورہ کو ماننے یا نہ ماننے کی آزادی

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے جب بریرہ رضی اللہ عنہا کو خرید کر آزاد کیا تو اس موقع پر انہیں اسلامی قانون کی حیثیت سے یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنے خاوند سے علیحدگی حاصل کر لیں۔ وہ اپنے خاوند کو سخت ناپسند کرتی تھیں جبکہ ان کے خاوند ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم نے ان سے شادی کو باقی رکھنے کی سفارش کی جسے انہوں نے قبول نہیں کیا۔

حدثنا محمد: أخبرنا عبد الوهاب: حدثنا خالد، عن عكرمة، عن ابن عباس: أن زوج بريرة عبد أسود يقال له مغيث، كأني أنظر إليه يطوف خلفها يبكي ودموعه تسيل على لحيته، فقال النبي صلى الله عليه وسلم لعباس: (يا عباس، ألا تعجب من حب مغيث بريرة، ومن بغض بريرة مغيثا). فقال النبي صلى الله عليه وسلم: (لو راجعته). قالت يا رسول الله تأمرني؟ قال: (إنما أنا أشفع). قالت: لا حاجة لي فيه.

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ بریرہ کے خاوند ایک سیاہ فام غلام تھے جن کا نام مغیث تھا۔ میں گویا اب بھی دیکھ رہا ہوں کہ وہ بریرہ کے پیچھے پیچھے روتے ہوئے پھر رہے ہیں اور ان کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو رہی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم نے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا، "عباس! کیا آپ کو حیرت نہیں ہوتی کہ مغیث بریرہ سے کس قدر محبت کرتا ہے اور وہ اس سے کتنی نفرت کرتی ہے۔" آپ نے بریرہ سے فرمایا، "کاش تم علیحدگی کا یہ فیصلہ بدل دو۔" وہ پوچھنے لگیں، "یا رسول اللہ! کیا یہ آپ کا حکم ہے؟" آپ نے فرمایا، "نہیں میں تو سفارش کر رہا ہوں۔" وہ بولیں، "پھر مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔" (بخاری، کتاب الطلاق، حدیث 5283)

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی پالیسی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کے بعد آپ کے خلفاء راشدین کا طرز عمل بھی یہی رہا۔ اس کی تفصیل کے لئے خلفاء راشدین کے طرز عمل کی کچھ مثالیں ہم بیان کر رہے ہیں۔ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جب خلیفہ بنے تو آپ نے پہلے خطبے میں اپنی پالیسی بیان کرتے ہوئے فرمایا:

أخبرنا عبيد الله بن موسى قال أخبرنا هشام بن عروة قال عبيد الله أظنه عن أبيه قال لما ولي أبو بكر خطب الناس فحمد الله وأثنى عليه ثم قال أما بعد أيها الناس قد وليت أمركم ولست بخيركم ولكن نزل القرآن وسن النبي صلى الله عليه وسلم السنن فعلمنا فعلمنا اعملوا أن أكيس الكيس التقوى وأن أحمق الحمق الفجور وأن أقواكم عندي الضعيف حتى آخذ له بحقه وأن أضعفكم عندي القوي حتى آخذ منه الحق أيها الناس إنما أنا متبع ولست بمبتدع فإن أحسنت فأعينوني وإن زغت فقوموني.

جب ابو بکر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو انہوں نے لوگوں سے خطاب فرمایا۔ اس میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرنے کے بعد فرمایا، "اے انسانو! مجھے آپ کے امور کا ذمہ دار بنا دیا گیا ہے اور میں اس کی خواہش نہیں رکھتا تھا۔ قرآن نازل ہوا اور نبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے سنت قائم فرمائی تو ہمیں دین کا علم ہوا۔ جان رکھیے کہ سب سے بہترین لباس، اللہ سے خبر دار رہنے کا لباس ہے۔ تمام بے وقوفیوں میں سے سب سے بڑی بے وقوفی گناہ کرنا ہے۔

آپ میں سے جو شخص سب سے زیادہ طاقتور ہے، وہ میرے نزدیک اس وقت تک سب سے زیادہ کمزور ہے جب تک کہ میں اس سے [اس کے ذمے عائد] حق وصول نہ کر لوں۔ آپ میں سے جو شخص سب سے زیادہ کمزور ہے وہ میرے نزدیک اس وقت تک سب سے زیادہ طاقتور ہے جب تک میں اسے اس کا حق پہنچا نہ دوں۔ اے انسانو! میں تو [دین کی] پیروی کرنے والا ہوں نہ کہ کوئی بدعت پیدا کرنے والا۔ اگر میں اچھا کام کروں تو آپ میری مدد کیجیے گا اور اگر غلط راستہ اختیار کروں تو مجھے سیدھا کر دیجیے گا۔"[4]

اس خطبے کی آخری بات محض عجز و انکسار ہی نہ تھی بلکہ صحابہ کا عمل یہی تھا۔ ارتداد کے خلاف جنگی کاروائی ہو یا لشکر اسامہ کی روانگی، روم و ایران سے جنگ کا معاملہ ہو یا اپنے بعد آنے والے خلیفہ کی تقرری، ہر ہر معاملے میں سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ صحابہ کے مشورے سے ہی معاملات چلایا کرتے تھے اور تمام صحابہ کو کھلے عام اپنی رائے کے اظہار کی آزادی حاصل تھی۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی مثال

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی یہی مثال قائم فرمائی۔ لوگوں کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ جمعے کے خطبے کے دوران کھڑے ہو کر بھرے مجمع میں آپ کا احتساب کر سکیں۔ مشہور واقعہ ہے کہ آپ دو چادروں پر مشتمل لباس پہن کر جمعہ کے خطبے کے لئے کھڑے ہوئے تو لوگوں نے اعتراض کیا کہ آپ کے پاس دو چادریں کہاں سے آ گئیں جبکہ ہم سب کو تو مال غنیمت میں سے ایک ایک چادر ملی ہے۔ آپ نے خود جواب دینے کی بجائے اپنے بیٹے عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کو جواب دینے کا اشارہ کیا۔ انہوں نے اٹھ کر بتایا کہ میں نے اپنے حصے کی چادر اباجان کو دے دی ہے۔ آپ نے اعتراض کرنے والوں کو گستاخ قرار نہیں دیا۔

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ نے خواتین کے حق مہر کی رقم کی ایک حد مقرر کرنے کا ارادہ کیا۔ نماز جمعہ میں ایک خاتون نے اس سے سخت اختلاف کیا اور ان کی رائے کے مطابق سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا فیصلہ بدل لیا۔ آپ نے ان خاتون کو بھی گستاخ قرار نہیں دیا۔

زمینوں کا انتظام کرنا ہو، جنگی تیاریاں کا معاملہ ہو، عوام کی فلاح و بہبود پر رقم خرچ کرنا ہو، مال غنیمت کی تقسیم ہو، ہر معاملے میں لوگوں

کو اپنی رائے پیش کرنے کا حق حاصل تھا۔ جو شخص صاحبین مجلس کی اکثریت کو قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا، اسی کی رائے پر حکومتی فیصلہ نافذ ہو جاتا۔ آپ دوسروں کو اپنا احتساب کرنے کی ترغیب دیا کرتے تھے۔

أخبرنا محمد بن عمر قال حدثني قيس بن الربيع عن عطاء بن السائب عن زاذان عن سلمان أن عمر قال له أملك أنا أم خليفة فقال له سلمان إن أنت جبيت من أرض المسلمين درهما أو أقل أو أكثر ثم وضعته في غير حقه فأنت ملك غير خليفة فاستعبر عمر.

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: "کیا میں بادشاہ ہوں یا خلیفہ؟" سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے فرمایا، "اگر آپ مسلمانوں کی زمین میں سے ایک درہم یا اس سے کم یا زیادہ وصول کرے اور اسے ناحق خرچ کریں تو آپ بادشاہ ہیں خلیفہ نہیں ہیں۔" عمر رضی اللہ عنہ یہ سن کر رونے لگے۔ [5]

أخبرنا محمد بن عمر قال حدثني عبد الله بن الحارث عن أبيه عن سفيان بن أبي العوجاء قال قال عمر بن الخطاب والله ما أدري أخليفة أنا أم ملك فإن كنت ملكا فهذا أمر عظيم قال قائل يا أمير المؤمنين إن بينهما فرقا قال ما هو قال الخليفة لا يأخذ إلا حقا ولا يضعه إلا في حق فأنت بحمد الله كذلك والملك يعسف الناس فيأخذ من هذا ويعطي هذا فسكت عمر۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "مجھے یہ پتہ نہیں چلتا کہ میں خلیفہ ہوں یا بادشاہ۔ اگر تو میں بادشاہ ہوں تو یہ بہت بڑا معاملہ ہے۔" کسی شخص نے کہا، "اے امیر المومنین! ان دونوں میں فرق ہے۔ خلیفہ وہ ہے جو سوائے حق کے [ٹیکس] وصول نہیں کرتا اور نہ ہی اسے ناحق خرچ کرتا ہے۔ الحمد للہ آپ ایسے ہیں ہیں۔ بادشاہ تو لوگوں پر ظلم کر کے ٹیکس لیتا ہے اور اسے اپنی مرضی سے خرچ کرتا ہے۔" عمر یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ [6]

عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر تنقید

سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی پالیسی بھی یہی تھی۔ آپ کے قریبی ساتھی اور عام لوگ بھی آپ کی پالیسیوں پر کھلی تنقید کیا کرتے تھے اور آپ کسی کو گستاخ قرار دے کر خاموش نہیں کرواتے تھے۔ آپ کے آخری دور میں جب مفسدین نے مدینہ کا محاصرہ کیا اور آپ کے خلاف ایک چارج شیٹ پیش کی، جو بڑی حد تک جھوٹ کے پلندے پر مشتمل تھی، تو آپ نے ان الزامات کی وضاحت کی اور کھلے عام توبہ بھی کی۔ [7]

علی المرتضی رضی اللہ عنہ کے خلاف فیصلہ

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں انہی کے مقرر کردہ جج قاضی شریح رحمہ اللہ کی عدالت میں ایک یہودی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر دعوی کر دیا۔ آپ نے اپنے حق میں دو گواہ سیدنا حسن و قنبر رضی اللہ عنہما کو پیش کیا۔ جج نے ان دونوں کی گواہی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ ایک ان کا بیٹا تھا اور دوسرا آزاد کردہ غلام اور فیصلہ یہودی کے حق میں سنا دیا۔ یہودی نے یہ فیصلہ سن کر اسلام قبول کر لیا کہ انصاف کا یہ عالم ہے کہ قاضی ایک غیر مسلم کے حق میں خلیفہ وقت کے خلاف فیصلہ دے رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب خلیفہ وقت کے معاملے میں آزادی رائے کا یہ عالم تھا تو پھر دیگر بزرگوں کے ساتھ کیا معاملہ ہو گا؟

ان واقعات کی بنیاد پر ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے لوگوں کو اپنا نفسیاتی غلام نہیں بنایا تو پھر آج کل کا کون سا ایسا پیر یا شیخ ہو سکتا ہے جسے ایسا کرنے کی اجازت ہو؟

نفسیاتی غلامی کے خلاف عقلی دلائل

ناقدین تصوف نفسیاتی غلامی کے خلاف کچھ عقلی دلائل بھی پیش کرتے ہیں:

کیا کوئی غیر نبی معصوم عن الخطاء ہو سکتا ہے؟

ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ کسی شیخ کو "پیر کامل" قرار دینے کا تصور ہی غلط ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نبوت ختم ہو چکی ہے اور آپ کے بعد کسی شخص کو کامل کہنا درست نہیں ہے۔ امتیوں میں سب سے بلند درجہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہے اور انہوں نے بھی کبھی کامل یا معصوم عن الخطاء قرار نہیں دیا ہے۔ پھر کس پیر و مرشد میں اتنی جرأت ہے کہ وہ خود کو کامل اور معصوم عن الخطاء قرار دے کر تنقید سے ماوراء کہہ سکے۔ اگر کوئی خود کو تنقید سے ماوراء سمجھتا ہے تو وہ اسی بدترین تکبر کا شکار ہوتا ہے جس کا خاتمہ اہل تصوف اپنا مقصد بتاتے ہیں۔

پابند شریعت صوفیاء یہ کہتے ہیں کہ بیعت سے پہلے انسان کو اچھی طرح دیکھ بھال کر بیعت کرنی چاہیے اور یہ دیکھ لینا چاہیے کہ اس کا پیر شریعت کا پیرو ہے یا نہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بیعت سے پہلے اگر پیر کے کردار کی چھان پھٹک ضروری ہے تو بیعت کے بعد کیوں نہیں؟ اگر کوئی چالاک پیر بیعت سے پہلے ملمع سازی سے مرید کے سامنے اپنے کردار کے صرف اچھے پہلو ہی پیش کرے اور بعد میں اس کے گھناؤنے کردار کا کوئی پہلو واضح ہو جائے تو کیا مرید پھر بھی اس کا غلام ہی بنا رہے؟ پھر اس بات کی بھی کیا گارنٹی ہے کہ کوئی پیر اگر آج اچھا ہے تو وہ ہمیشہ ہی اچھا رہے گا یا اس سے زندگی بھر کوئی غلطی صادر نہ ہو گی؟

نفسیاتی غلامی کے عملی نقصانات

تمام مذاہب کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ نفسیاتی غلامی سے فائدہ کم اور نقصان کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ حسن ظن سے کام لیا جائے تو سوچا جا سکتا ہے کہ مخلص اور پابند شریعت صوفیاء شاید مرید کو غلام اس لیے بناتے ہوں گے کہ اس سے مرید ان کی بات آسانی سے مان لیتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ حضرات اس کی مدد سے مرید پر جذباتی دباؤ ڈال کر اس سے اس کی اصلاح میں کام لیتے ہوں اور اس کی خامیوں کو دور کر لیتے ہوں۔ یہ نفسیاتی غلامی پیدا کرنے کا ایک ایسا فائدہ ہے جو اور طریقوں سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس اس کے نقصانات کہیں زیادہ ہیں بلکہ دیکھا جائے تو دنیا کے اکثر لوگوں کی گمراہی کا سبب بھی یہی ہے۔ چند مثالیں یہ ہیں:

- عام غیر مسلم محض اس وجہ سے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لاتے کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے علماء اور

مشائخ درست کہتے ہیں۔ یہ لوگ کبھی ان کی ذہنی غلامی سے نکل کر حق کو پرکھنے اور جانچنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اگر نفسیاتی غلامی کوئی اچھی چیز ہوتی تو اس کا یہ نتیجہ نہ نکلتا۔

- مسلمانوں کی تاریخ میں جتنے گمراہ فرقے اور جھوٹے نبی پیدا ہوئے ہیں، انہوں نے اسی نفسیاتی غلامی کی مدد سے اپنے پیرو کاروں کی تعداد میں اضافہ کیا ہے۔
- بعض صوفیاء نے مریدین کو اس حد تک غلام بنالیا کہ ان سے اپنا کلمہ تک پڑھوایا ہے۔ اس کی مثالیں پچھلے ابواب میں گزر چکی ہیں۔
- جعلی صوفی، جنہیں پابند شریعت صوفیاء بھی گمراہ سمجھتے ہیں، اپنے مریدین کو اپنا ذہنی غلام بنا کر ان کا مال اینٹھتے ہیں، ان کا ہر طرح سے استحصال کرتے ہیں اور ان کی بہنوں اور بیٹیوں سے بدکاری تک کر لیتے ہیں۔ یہ سب اس وجہ سے ہوتا ہے کہ صوفیاء کا یہ متفقہ نظریہ ہے کہ مرید کو اپنے مرشد کا بے دام غلام بن کر رہنا چاہیے۔

ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ تزکیہ نفس اور اصلاح کے لیے نفسیاتی غلام بنانا ضروری نہیں ہے۔ اس کے برعکس اگر لوگوں میں مثبت تنقید اور خود احتسابی کی عادت پیدا کی جائے تو اس کا فائدہ استاذ و شاگرد اور مرشد و مرید دونوں ہی کو ہو گا۔ شاگرد کی غلطیوں کی اصلاح استاذ کرے گا اور استاذ کی غلطیوں کو شاگرد درست کر دے گا۔ اس طرح مجموعی طور پر دونوں ہی فائدے میں رہیں گے۔ شاگرد اگر استاذ یا مرشد کی غلطی کو جان بوجھ کر نظر انداز کرے تو اس کی متعدد وجوہات ممکن ہیں۔ ان کا تجزیہ کرتے ہوئے مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

> اب ان لوگوں کے معاملے کو لیجیے جو شیخ یا استاذ یا مرشد یا لیڈر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی کمزوریوں اور اور غلطیوں کو جانتے بوجھتے نظر انداز کرنے کی چند وجہیں ہو سکتی ہیں اور ان میں سے ہر وجہ پر غور کیجیے گا تو آپ خود محسوس کریں گے کہ ایک سے ایک بڑھ کر افسوس ناک بلکہ شرمناک ہے۔
>
> ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ آپ محسوس کریں کہ اپنے شیخ یا استاذ یا لیڈر سے نہایت قسم کی زیادتی ہو رہی ہے [یعنی وہ زیادتی کر رہا ہے] لیکن محض اس کا لحاظ اور احترام آپ کے لیے اس زیادتی کے خلاف زبان کھولنے سے مانع ہو۔ اگر یہ صورت ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ آپ استاذ یا شیخ کا احترام حق سے بھی زیادہ کرتے ہیں اور شیخ اور استاذ کے احترام کے تقاضوں کو خدا کے اور رسول کے صریح مطالبات سے بھی زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔
>
> دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آپ اپنے کسی بزرگ میں کوئی غلطی صریحاً دیکھ تو رہے ہیں لیکن آپ کی کوئی چھوٹی یا بڑی غرض اس بزرگ سے وابستہ ہے، جس کے سبب سے اُس کے منہ میں لگام لگی ہوئی ہے اور آُپ اس کو ٹوکنے کی جرأت نہیں کر رہے ہیں۔ اگر یہ وجہ ہے تو اس کے معنی یہ ہیں خہ آپ اپنی غرض اور اپنے مطلب کو حق اور سچائی اور خدا اور رسول سب پر مقدم رکھتے ہیں۔
>
> تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آپ کو اپنے شیخ یا استاذ کے علم اور تقوی پر اتنا بھروسہ اور اس کی رائے پر اتنا گہرا اعتماد ہے کہ آپ محسوس تو کرتے ہیں

کہ اس کا فلاں فعل یا فلاں قول بالکل حقیقت کے خلاف ہے لیکن محض اس خیال سے اس کو ٹوکنے سے احتراز کریں کہ ایک ایسا صاحب علم و تقوی کوئی غلط کام کس طرح کر سکتا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ میں ہی غلطی پر ہوں، اس وجہ سے خاموشی ہی بہتر ہے۔ اگر یہ وجہ ہے تو یہ وہی اندھی تقلید ہے جس میں مبتلا ہو کر لوگوں نے اپنے بزرگوں اور مشائخ کو ہم پایہ خدا یا بالفاظ دیگر ارباباً من دون اللہ بنا ڈالا اور اس کے نتیجہ کی نعمت

باب 11: تزکیہ نفس کے صوفیانہ طریقے

اہل تصوف، تزکیہ نفس کو اپنی تمام ترکاوشوں کا محور و مرکز قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ تصوف کا یہ پورا نظام ہی اس لیے وضع کیا گیا ہے تاکہ لوگوں کا تزکیہ کیا جائے۔ تزکیہ نفس کا سادہ الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ انسانی شخصیت کو اخلاقی برائیوں سے پاک کیا جائے اور اس میں موجود نیکی کے داعیات (Motives) کو ترقی دی جائے تاکہ انسان اپنی زندگی اللہ تعالی کی فرمانبرداری میں بسر کر سکے۔ تزکیہ نفس کے لیے صوفیاء کچھ مخصوص طریق ہائے کار وضع کر رکھے ہیں۔ اس باب میں ہم ان کا مطالعہ کریں گے۔

تزکیہ نفس کے مقاصد

اخلاقی وجود کی تطہیر

اس سے پہلے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ کون سی اخلاقی خرابیاں ہیں جن کے خاتمے کو اہل تصوف اپنا مقصد بناتے ہیں اور وہ کون سی اخلاقی خوبیاں ہیں جنہیں وہ لوگوں میں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ انسانی نفسیات کی ان تفصیلات کو سب کو نہایت خوبی اور شرح و وضاحت کے ساتھ مشہور صوفی عالم، امام محمد غزالی (450-505/1058-1111) نے اپنی مشہور زمانہ کتاب "احیاء العلوم الدین" کی تیسری اور چوتھی جلد میں بیان کیا ہے۔ بعد کے صوفیاء اور علماء نے انہی سے استفادہ کیا ہے۔ یہ ایک مفصل بحث ہے جو سینکڑوں صفحات پر مشتمل ہے تاہم یہاں ہم اس کا خلاصہ پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاں جہاں ہم احیاء کے اقتباسات پیش کیے ہیں، وہاں ترجمہ میں ہم نے مولانا ندیم الواجدی کے اردو ترجمے سے مدد لیتے ہوئے اسے مزید آسان بنانے کی کوشش کی ہے۔ کسی بھی کنفیوژن کی صورت میں اصل عربی متن کی طرف رجوع کرنا مناسب رہے گا۔

غزالی بیان کرتے ہیں کہ انسانی جسم کے اندر کچھ ظاہری اعضا ہوتے ہیں جنہیں وہ "جوارح" کہتے ہیں جیسے ہاتھ، پاؤں، آنکھ وغیرہ۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں کچھ باطنی (یہ فرقہ باطنیہ کی اصطلاح نہیں ہے) اور پوشیدہ اعضا بھی ہوتے ہیں جو آنکھ سے نظر نہیں آتے مگر انہیں ہر شخص محسوس کر سکتا ہے۔ ان میں خواہشات، غصہ اور عقل شامل ہیں۔ خواہشات سے مراد وہ تمام تقاضے ہیں جو اندھے ہوتے ہیں اور ہر صورت میں اپنی تکمیل چاہتے ہیں۔ ان میں بھوک، پیاس، نیند، جنسی خواہش، احساس تحفظ، دوسروں پر برتری کی خواہش سبھی شامل ہیں۔ غصہ سے مراد غیض و غضب، شجاعت، اور دفاع کا داعیہ (Motive) ہے۔ انسانی جسم میں ایک قوت ہے جو اس پوری شخصیت کو کنٹرول کر رہی ہے۔ اگرچہ اس کا مسکن دماغ ہے مگر اسے صوفیاء کی اصطلاح میں "قلب" کہا جاتا ہے۔ اسے جدید نفسیات کی اصطلاح میں انا (Ego) بھی کہا جاتا ہے۔ غزالی لکھتے ہیں:

> قلب کے دو خادم یعنی غصہ اور خواہش جب اس کی پورے طور پر اطاعت کرتے ہیں تو راہ سلوک میں اسے ان سے بڑی مدد ملتی ہے، وہ انہیں

بہترین رفیق سفر، اور بے لوث اور مخلص مددگار تصور کرتا ہے، کبھی یہ دونوں خادم نافرمانی اور بغاوت پر کمربستہ ہو جاتے ہیں، اور بجائے اس کی اطاعت کے خود اسے اپنی اطاعت پر مجبور کر دیتے ہیں اور اس کی ہلاکت کا باعث بنتے ہیں لیکن کیونکہ قلب کے صرف یہی دو خادم نہیں ہیں بلکہ اور خدام اور اعوان ہیں، اگر خواہش اور غصہ آمادہ بغاوت ہو جائیں تو قلب کو مایوس نہ ہونا چاہیے بلکہ دوسرے خدمت گاروں سے مدد حاصل کرنی چاہیے۔ غصہ اور خواہش کبھی کبھی شیطان کی جماعت سے جا ملتے ہیں۔ اگر اس نے اللہ کے گروہ سے مدد نہ لی اور اپنے نفس پر غضب اور شہوت کی فوجوں کو غلبہ دیا تو وہ یقینی ہلاکت اور زبردست خسارے کی طرف گامزن ہے۔ اکثر لوگوں کا یہی حال ہے، ان کی عقلیں خواہش کے تابع ہیں کیونکہ وہ ان خواہشات کو پورا کرنے کے لیے حیلے تراشتی ہیں حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ ان کی خواہشات عقل کے تابع ہوتیں۔ ہم چند مثالوں سے اس نکتے کی وضاحت کرتے ہیں۔

فرض کیجیے کہ انسانی شخصیت اپنے ملک اور دار الحکومت میں بادشاہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ بدن اس کی مملکت، مستقر، اور دار الحکومت ہے۔ تمام اعضاء و جوارح کی حیثیت وہی ہے جو شاہی عملے کے ارکان کی ہوتی ہے۔ قوت عقلیہ اس کا مخلص وزیر ہے۔ قوت غضب اس کا باڈی گارڈ اور کوتوال ہے، دشمنوں سے بادشاہ کی حفاظت اس کے فرائض میں شامل ہے۔ خواہشات اس کا وہ بد خلق ملازم ہے جس کے ذمے اہل شہر کے لیے کھانے کا انتظام کرنا ہے۔ یہ شخص انتہائی جھوٹا، فریبی، دھوکہ باز، اور خبیث ہے۔ بظاہر خیر خواہ نظر آتا ہے لیکن اس کی خیر خواہی کے پردے میں زہر ہلال اور سم قاتل ہے۔ مخلص وزیر کی رائے اور تدبیر سے اختلاف کرنا اس کی عادت ہے۔ کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا جس میں وہ اس کی مخالفت نہ کرتا ہو۔ اس صورت میں اگر بادشاہ اپنے وزیر کی تدبیر پر عمل کرے، اس سے مشورے حاصل کرے، اور اس خبیث غلام سے اعراض کے ذریعہ یہ ظاہر کرے کہ حکومت کے حق میں اس سے دور رہنا ہی بہتر ہے، نیز کوتوال شہر کی بھی تادیب کرے کہ وہ اس بد باطن غلام اور اس کے پیروکاروں پر نظر رکھے۔ اگر وہ کسی غلط کام میں مشغول ہوں تو انہیں سزا دے۔ امید یہی ہے کہ اس صورت میں غلام سرکشی نہ کر سکے گا اور بادشاہ کا مغلوب و محکوم بنا رہے گا اور حکومت نہایت عدل اور نظم کے ساتھ چلے گی۔

اسی طرح اگر نفس عقل سے مدد حاصل کرتا رہے، اور کبھ غضب کے محافظ کے ذریعہ خواہش کے غلام پر کاری ضرب لگاتا رہے، اور کبھی غضب کے غلبے کو کم کرنے کے لیے خواہش سے مدد چاہتا رہے تو اس کی صلاحیتیں اعتدال پر رہیں گی، اخلاق بہتر رہیں گے۔ اور اگر اس طریقہ سے اعراض کرے گا تو ان لوگوں میں سے ہو گا، جن کے بارے میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "کیا آپ نے اس شخص کی حالت بھی دیکھی ہے جس نے اپنا خدا، اپنی خواہش نفسانی کو بنا رکھا ہے اور اللہ تعالی نے اس کو علم کے باوجود گمراہ کر دیا ہے۔" (جاثیہ 45:23)[1]

انسانی شخصیت میں موجود انہی قوتوں کی باہمی کشمکش کو غزالی اس طرح بیان کرتے ہیں:

انسان کی تخلیق و ترکیب میں چار چیزوں کی آمیزش ہے، اس لیے اس میں چار طرح کے اوصاف جمع ہیں: درندگی، حیوانیت، ربانیت اور شیطانیت:

- اس اعتبار سے جب اس پر غصہ کا غلبہ ہو تو وہ درندوں کے افعال جیسے دشمنی، بغض، مار پیٹ اور گالی گلوچ کا ارتکاب کرتا ہے۔
- جب اس پر خواہشات کا غلبہ ہو تو وہ حیوانوں کے افعال یعنی لالچ، ہوس، طمع اور حسد کا ارتکاب کرتا ہے۔
- چونکہ اس میں ربانیت [یعنی خود کو بلند سمجھنے] کی خواہش پائی جاتی ہے، اس لیے وہ اپنے لیے ربوبیت کا دعوی کرتا ہے۔ اسے فوقیت، تکبر، دوسروں پر برتری، خاص ہونے کا مقام اور منفرد ہونا پسند ہے۔ عبودیت، انکسار اور محکومیت ناپسند ہے۔ اسی لحاظ سے وہ یہ چاہتا ہے کہ تمام علوم سے واقف ہو، علم کی طرف اپنی نسبت اسے محبوب ہے اور جہالت کی طرف نسبت اسے ناپسند ہے۔ وہ حقائق امور

کے احاطے اور علم و معرفت کے حصول کا دعوی کرتا ہے، حالانکہ تمام حقائق کا احاطہ اور مخلوق پر زبردستی کی برتری رب ہونے کے اوصاف ہیں، بندہ ہونے کی صفت نہیں ہے۔

- انسان غصہ اور خواہش میں درندوں اور جانوروں کے ساتھ مشترک ہونے کے باوجود قوت تمیز رکھتا ہے، اس لیے اس میں ایک وصف مزید ہے جسے شیطانیت کہہ سکتے ہیں۔ شیطان سر تا پا شر ہے۔ وہ اپنی عقل کو شر کی صورتوں میں استعمال کرتا ہے، اور اپنی اغراض حاصل کرنے کے لیے مکر و فریت کا سہارا لیتا ہے اور خیر کے محل میں شر کا بیج بوتا ہے، یہ شیاطین کے اوصاف ہیں۔ اور وہ لوگ بھی ان اوصاف میں شیاطین کے شریک ہیں جن میں ربانیت، شیطانیت، حیوانیت اور درندگی کے عناصر پائے جاتے ہیں۔

ان چار اوصاف کا مرکز قلب ہے، گویا انسان کی کھال میں بیک وقت ایک خنزیر، ایک کتا، ایک شیطان اور ایک دانشور جمع ہیں۔ خنزیر خواہشات کی علامت ہے۔ یہ ناپاک اور بدباطن جانور اپنے رنگ یا اپنی شکل و صورت کی بنا پر برا نہیں ہے بلکہ اپنی حرص و ہوس کی وجہ سے مذموم ہے۔ یہی حال کتے کا ہے جو غضب کی مجسم شکل ہے، درندوں اور کتوں سے اس لیے نفرت نہیں کی جاتی کہ وہ درندے یا کتے ہیں، بلکہ ان سے نفرت کی وجہ یہ ہے کہ ان میں غایت درجے کی درندگی اور عداوت پائی جاتی ہے۔ اس طرح انسان کے باطن میں درندوں کی درندگی، عداوت اور غضب اور خنزیر کی حرص اور طمع پائی جاتی ہے۔ درندہ غضب کو تحریک دے کر ظلم پر، اور خنزیر لالچ کو ہوا دے کر فحش کاموں کے ارتکاب پر اکساتا ہے۔ شیطان ان دونوں کو ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار رکھتا ہے۔ کبھی حرص کو غضب کے خلاف اکساتا ہے اور کبھی غضب کو لالچ کی مخالفت میں بھڑکاتا ہے، نیز ان دونوں کی جبلی صفات کی تعریف و تحسین کرتا ہے۔

[خنزیر، کتے اور شیطان کے علاوہ چوتھی چیز] عقل ہے جو کہ بمنزلہ دانشور کے ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ وہ شیطان کے مکر و فریب کو دفع کرے اور اپنی گہری بصیرت اور واضح نور سے اس کی چال بازی کا قلع قمع کر دے اور خنزیر کی ہوس کو کتے کے غضب کے ذریعے شکست دے، اس لیے کہ غصہ سے شہوت ختم ہوتی ہے۔ اسی طرح خنزیر کو کتے پر مسلط کر کے اس کی درندگی کا خاتمہ کرے اور کتے کو اپنی حکمت و تدبیر سے پابہ زنجیر اور فرمانبردار رکھے۔ اگر یہ دانشور اپنی کوشش میں ناکام رہا، نہ شیطان سے ٹکر لے سکا اور نہ خنزیر اور کتے کو تابع کر سکا تو یہ تینوں خود اس پر غالب آ جائیں گی اور اسے اپنی سخت زنجیروں میں اسی طرح جکڑ لیں گی کہ کوشش کے باوجود آزاد نہ ہو سکے گا بلکہ تا عمر ان کا خدمت گزار اور مطیع بن کر رہے گا۔

اکثر لوگ اسی قید کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کی تمام تر جدوجہد پیٹ اور شرمگاہ کی شہوت ہے۔ حیرت اس وقت ہوتی ہے جب یہی لوگ بت پرستوں کو اپنی ملامت کا ہدف بناتے ہیں اور ان کی بت پرستی کا مذاق اڑاتے ہیں، اگر ان کی آنکھوں سے غفلت کے دبیز پردے اٹھائے جائیں تو معلوم ہو گا کہ وہ خود غیر اللہ کی اطاعت میں مصروف ہیں۔ کبھی وہ خنزیر کے سامنے سربسجود ہیں اور کبھی کتے کے سامنے رکوع اور قیام کی حالت میں ہیں۔۔۔ کتنا بڑا ظلم ہے کہ ان نفس پرستوں نے مالک کو مملوک، آقا کو غلام اور غالب کو مغلوب بنا دیا ہے۔ غلبہ اور سیادت کا حق عقل کو تھا، خنزیر، کتے اور شیطان نے اس کا حق چھین لیا اور اسے مغلوب و مقہور کر دیا۔

- عقل جب سرداری سے محروم ہو جاتی ہے تو ان تینوں اوصاف کی اطاعت رنگ لاتی ہے اور قلب پر وہ صفات محیط ہو جاتی ہیں، جن کا انجام ہلاکت اور رسوائی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔
- خواہشات کے خنزیر کی اطاعت سے بے حیائی، خباثت، فضول خرچی، بخل، ریاکاری، بے عزتی، بے ہودگی، لالچ، ہوس، خوشامد، حسد،

کینہ اور دوسرے کی تکلیف پر خوش ہونا جیسے اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔

- غضب وغصہ کے کتے کی اطاعت کے نتیجے میں بے رحمی، غلبے کی خواہش، خود ستائی، تکبر، خود پسندی، دوسروں کا مذاق اڑانا اور انہیں حقارت سے دیکھنا، برائی اور ظلم کا ارادہ وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔
- غضب اور خواہشات کے ان معبودوں کی اطاعت دراصل شیطان کی اطاعت ہے جس سے مذکورہ بالا رذائل [بری خصوصیات] کے علاوہ مکر و فریب، حیلہ جوئی، دغابازی، چال بازی، خیانت، گھٹیا اور بازاری پن، اور فحش کلامی جیسے اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔
- اگر صورتحال اس کے برعکس ہو، اور شر کے یہ تمام سرچشمے اور محرکات، ربانی صفت کی حکمت عملی سے زیر ہو جائیں تو قلب میں ربانی اوصاف علم، حکمت، یقین، حقائق اشیاء کا احاطہ، امور کی معرفت، علم اور بصیرت کی قوت کے ذریعے دوسروں پر غلبہ، کمال علم کی بنا پر مخلوق پر برتری کا حق جیسے ربانی اوصاف قلب کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ خواہشات اور غضب کی اطاعت کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ خواہش کے خنزیر کو اس کی حدود میں قید رکھنے سے عفت، قناعت، دلی سکون، زہد، خدا خوفی، تقوی، انبساط، حیاء، حسن صورت، خوش خلقی پیدا ہوتی ہے۔ غضب کے کتے کو پابہ زنجیر رکھنے سے شجاعت، کرم، عظمت، ضبط نفس، صبر، حلم و بردباری، عفو، ثابت قدمی اور شرافت جیسے اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔[2]

اس طویل اقتباس میں غزالی نے نہایت ہی خوبصورت تمثیل کے ساتھ یہ بیان کیا ہے کہ تزکیہ نفس کا مقصد یہ ہے کہ انسان اندھی خواہشات اور غیض و غضب کی قوتوں کو عقل کے کنٹرول میں لے آئے تاکہ اس میں نیکی کی صفات عفت و عصمت، قناعت، دلی سکون، زہد، خدا خوفی، تقوی، حیاء وغیرہ پیدا ہو جائیں۔ اگر اس کی خواہشات، عقل پر غالب آ گئیں تو بے حیائی، خباثت، فضول خرچی، بخل، ریاکاری، بے عزتی، بے ہودگی، لالچ، ہوس، خوشامد، حسد، کینہ اور دوسرے کی تکلیف پر خوش ہونا جیسے بدترین اوصاف انسان پر غالب آ جاتے ہیں۔ اگر غیض و غضب کی قوت عقل پر غالب آ جائے تو اس کے نتیجے میں بے رحمی، غلبے کی خواہش، خود ستائی، تکبر، خود پسندی، اور ظلم جیسی برائیاں جنم لیتی ہیں۔ جب عقل شہوات اور غضب کی غلام بنتی ہے تو پھر یہ ان کے آلہ کار کے طور پر کام کرتے ہوئے مکر و فریب، حیلہ جوئی، دغابازی، چال بازی، خیانت اور گھٹیا پن جیسی چیزوں پر اتر آتی ہے۔

غزالی کی بیان کردہ ان مثبت اور منفی خصوصیات کی نوعیت ایسی ہے کہ ان میں سے ہر ایک پر پورا پورا باب لکھا جا سکتا ہے اور انہوں نے احیاء العلوم کی جلد 3 اور 4 میں ایسا ہی کیا ہے۔ تزکیہ نفس کے یہ مقاصد ایسے ہیں جن سے دنیا کا کوئی بھی معقول شخص انکار نہیں کر سکتا ہے۔ اس مقاصد کے معاملے میں اہل تصوف اور ناقدین تصوف کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ان کے درمیان اصل اختلاف ان مقاصد کے حصول کے طریقوں میں ہے جن کا مطالعہ ہم آگے جا کر کریں گے۔

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہونا

تزکیہ نفس کے ان مقاصد سے ہٹ کر کچھ اور مقاصد ہیں جو کہ وحدت الوجود سے متاثر صوفیاء کے ہاں پائے جاتے ہیں۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ انسان میں ربانی صفات کو اس درجے میں پیدا کر دیا جائے کہ وہ خدا کے ساتھ جا ملے۔ اس سے متعلق صوفیاء کے اقتباسات کا

مطالعہ آپ "وحدت الوجود" سے متعلق ابواب میں کر چکے ہیں۔

انسانی شخصیت میں بری خصوصیات کو ختم کرنے اور اچھی صفات کو پروان چڑھانے کے بارے میں تو ناقدین تصوف، صوفیاء سے پوری طرح متفق ہیں مگر اللہ تعالی کے وجود میں فنا ہونے کے مقصد پر ناقدین تصوف کڑی تنقید کرتے ہیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی (1904-1997) لکھتے ہیں:

> شریعت انسان کا تعلق خدا کے ساتھ جو جوڑتی ہے، اس میں اصلی نصب العین اور مطمح نظر یہ ہے کہ بندہ اپنے ظاہر و باطن، دونوں میں خدا کی صفات کے تقاضوں کے مطابق بن جائے۔ شریعت میں بندے کے لیے کمال کا سب سے بڑا درجہ یہی ہے جو اکتساب اور جد وجہد سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد اگر کمال کا کوئی درجہ ہے تو وہ نبوت کا درجہ ہے لیکن وہ اکتسابی [کوشش کر کے حاصل کی جانے والی] چیز نہیں ہے، بلکہ وہبی [بغیر کوشش کے عطا کی جانے والی چیز] ہے۔ اللہ ہی نے جس کو چاہا ہے، یہ مرتبہ دیا ہے۔
>
> لیکن جوگیوں اور راہبوں کے تصوف میں، بالخصوص اس تصوف میں جس کی بنیاد وحدت الوجود کے نظریہ پر ہے، مطمح نظر خدا کی صفات کے تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کا نہیں ہے، بلکہ خدا کی صفات کے مظہر بننے کا ہے۔ اس میں مجاہدہ اور ریاضت کا اصلی مقصود یہ نہیں ہوتا کہ آدمی عبدیت کا کمال درجہ حاصل کر لے بلکہ سارا زور اس بات پر صرف ہوتا ہے کہ آدمی خدا کی صفات کا اس طرح مظہر بن جائے کہ قطرہ دریا میں ضم ہو جائے اور دوئی اور تفرقہ کے سارے نشانات مٹ جائیں۔ ؎
>
> عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہونا
>
> ظاہر ہے کہ یہ مطمح نظر، شریعت کے مطمح نظر سے ایک بالکل مختلف مطمح نظر ہے۔ شریعت آدمی کو بندہ بنانا چاہتی ہے اور اس کا تزکیہ کا سارا اجہاد اسی مقصد کے لیے ہوتا ہے۔ برعکس اس کے جوگیانہ تصوف میں آدمی اپنے آپ کو الہ [خدا] بنانے کی کوشش کرتا ہے اور اس کی ساری ریاضت میں یہی غلط نقطہ نظر کار فرما ہوتا ہے۔ اگر خدا کی شان تجرد [اکیلا ہونا] ہے تو اس راہ پر چلنے والے اپنے اندر [نکاح نہ کر کے] تجرد کی شان پیدا کرنا چاہیں گے۔ اگر خدا بے نیاز ہے تو یہ حضرات بھی بے نیاز بننے کی کوشش کریں گے۔ اگر خدا مصرف [تصرف کرنے والا] تو یہ بھی مصرف ارواح و قلوب بننے کے لیے زور لگائیں گے۔ اگر خدا علیم و خبیر ہے تو یہ بھی غیب کے پردوں میں جھانکنے کے لیے طرح طرح کے چلے اور مراقبے کریں گے۔ اگر خدا شافی مطلق ہے تو یہ بھی چاہیں گے کہ ان کے ہاتھ لگانے اور ان کے چھو منتر سے بھی مریض شفا پائیں اور مردے جی اٹھیں۔ اگر خدا آگ اور پانی پر حکمران ہے تو یہ بھی پانی پر چلنا اور آگ سے کھیلنا چاہیں گے۔ یہاں تک کہ اس راہ پر چلنے والے لوگ اگر شریعت کی پابندیوں کو قبول بھی کرتے ہیں تو اپنے مذکورہ بالا مطمح نظر ہی کی خدمت کے نقطہ نظر سے قبول کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ پابندیاں اس مطمح نظر تک پہنچنے کے لیے ایک زینے اور سہارے کا کام دیتی ہیں۔ بالآخر ان کے ہاں ایک وہ منزل بھی آتی ہے جہاں یہ ساری چیزیں بند حسن اور حجاب کے حکم میں داخل ہو جاتی ہیں اور حصول کمال مطلق کی راہ میں سبک روی کے لیے ان ساری پابندیوں سے آزاد ہو جانا ان کے ہاں ضروری ہو جاتا ہے۔
>
> اسلام نے تعلق باللہ کے اس نقطہ نظر کو بالکل غلط قرار دیا ہے۔ اس نے تعلق باللہ میں، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، جس اصول کی طرف رہنمائی کی ہے، وہ یہ ہے کہ بندہ اپنے آپ کو صفات الٰہی کے تقاضوں کے مطابق بنائے۔ مثلاً یہ کہ خدا منعم [نعمت عطا کرنے والا] ہے تو بندہ کو چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اس کا شکر گزار بندہ بنے۔ خدا خالق ہے تو چاہیے کہ بندہ اسی کے امر و حکم کی اطاعت کرے۔ خدا سمیع و علیم ہے تو بندہ اسی سے مانگے اور اسی پر بھروسہ کرے۔ خدا قدوس [پاک] تو بندہ کو چاہیے کہ اپنے ظاہر و باطن، دونوں کو زیادہ سے زیادہ پاکیزہ بنائے۔ خدا عادل و طاقت

ورہے تو چاہیے کہ وہ ہر لمحہ اس سے ڈرتا رہے اور ظلم و ناانصافی کی ہر بات سے پرہیز کرے۔ غرض خدا کی ہر صفت بندے کو گونا گوں ذمہ داریوں اور بے شمار حقوق و فرائض کے بندھنوں میں باندھتی ہے اور بندہ خدا کی صفات اور ان کے عائد کردہ حقوق و فرائض کے علم و عمل کی راہ میں جتنا ہی بڑھتا جاتا ہے، اتنا ہی خدا سے اس کا قرب بھی بڑھتا جاتا ہے اور اسی اعتبار سے اس کی ذمہ داریاں بھی مشکل تر اور نازک تر ہوتی جاتی ہیں۔[3]

اہل تصوف کے ہاں تزکیہ نفس کے طریقے

تصوف کی کوئی بھی کتاب اٹھا کر دیکھ لیجیے یا کسی بھی صوفی شیخ کے ہاں جا کر دیکھ لیجیے تو تزکیہ نفس کا جو پروگرام ان کے ہاں ملتا ہے، اسے ان نکات کی صورت میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ پروگرام صرف مخلص صوفیاء کے ہاں عمل پذیر ہوتا ہے۔ غیر مخلص اور جعلی صوفیاء کے ہاں پروگرام کچھ مختلف ہوتا ہے، جس کا مطالعہ ہم ایک علیحدہ باب میں کریں گے۔

شیخ کا انتخاب

جب کوئی شخص تزکیہ نفس کا ارادہ کرے تو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ کسی صوفی شیخ یا مرشد کا انتخاب کرے۔ اس مقصد کے لیے پابند شریعت صوفیاء تجویز کرتے ہیں کہ شیخ کا انتخاب کرتے ہوئے چار شرائط کو مد نظر رکھنا چاہیے۔ مولانا احمد رضا خان بریلوی (1856-1921) لکھتے ہیں:

1۔ شیخ کا سلسلہ باتصال صحیح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا ہو، بیچ میں منقطع نہ ہو۔۔۔۔

2۔ شیخ سنی صحیح العقیدہ ہو، بدمذہب گمراہ کا سلسلہ شیطان تک پہنچے گا، نہ کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم تک۔۔۔۔

3۔ عالم ہو۔ اقول علم وفقہ، اس کی اپنی ضرورت کے قابل کافی اور لازم ہو کہ عقائد اہل سنت سے پورا واقف، کفر و اسلام و ضلالت و ہدایت کے فرق کا خوب عارف ہو، ورنہ آج بدمذہب نہیں کل ہو جائے گا۔۔۔

4۔ فاسق معلن [اعلانیہ گناہ کرنے والا] نہ ہو۔[4]

دیوبندی صوفیاء بھی انہی شرائط کو درست مانتے ہیں مگر وہ اس کے ساتھ یہ مشورہ بھی دیتے ہیں کہ مرید اور پیر کی شخصیت میں مناسبت اور ہم آہنگی ہو۔

بیعت

جب سالک شیخ کا انتخاب کر لے تو اس سے تعلق قائم کرے۔ اس تعلق کے لیے اسے شیخ سے ایک معاہدہ کرنا ہو گا جسے "بیعت" کہا جاتا ہے۔ بیعت کا مطلب صوفیاء کے نزدیک ہے "بک جانا"۔ اس معاہدے کے تحت سالک، اپنے پیر کے ہاتھوں بک کر مکمل طور پر اس کا نفسیاتی غلام بن جائے گا۔ شیخ اسے جو حکم دے گا، اس کے لیے اسے ماننا ضروری ہو گا اور پوری زندگی شیخ کی اطاعت میں گزارنے کا

عزم کرنا ہو گا۔ اس کے لیے لازم ہو گا کہ وہ کبھی اپنے شیخ کی کسی بات پر اعتراض کرنا تو دور کی بات، اس کے بارے میں کوئی خیال بھی ذہن میں نہ آنے دے۔ اس کے بارے میں صوفیاء کے نقطہ نظر سے متعلق تفصیل کا مطالعہ آپ "نفسیاتی غلامی" سے متعلق باب میں کر سکتے ہیں۔

ایسے صوفی حضرات جو شریعت کی پابندی کرتے ہیں، بیعت کے موقع پر اپنے مریدین سے سابقہ گناہوں سے توبہ کرواتے ہیں اور آئندہ ان سے گناہ سے بچنے کا وعدہ لیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ انہیں اپنے سلسلہ میں داخل کر لیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک خاص اہمیت "سلسلہ طریقت" کی ہوتی ہے جس میں شیخ، شیخ کے شیخ، پھر ان کے شیخ، پھر ان کے شیخ کا نام ہوتا ہے اور یہ سلسلہ صوفیاء کے بیان کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وساطت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک جا پہنچتا ہے۔ اس سے استثناء نقشبندی سلسلہ کا ہے جس کا شجرہ طریقت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی وساطت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچتا ہے۔

اویسی سلسلہ کے صوفیاء چونکہ ظاہری تعلق سے ہٹ کر باطنی اور روحانی تعلق پر یقین رکھتے ہیں، اس وجہ سے وہ اپنا تعلق حضرت اویس قرنی رحمہ اللہ کی وساطت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچاتے ہیں۔ اویس قرنی کی ملاقات کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ہوئی لیکن اویسی حضرات کا دعوی یہ ہے کہ انہیں کسی ظاہری ملاقات کے بغیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست روحانی فیض حاصل ہوا تھا۔

صوفیاء کے ہاں شیوخ اور پیروں کے لیے آئیڈیل یہی ہے کہ وہ کم تعداد میں مرید کریں اور اتنے ہی مرید کریں جن کی روحانی تربیت اور تزکیہ نفس وہ کر سکتے ہوں۔ بعض صوفیاء ایسے بھی ہیں جو ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں مرید کرتے ہیں َاور اس ضمن میں کبھی مختلف صوفیوں میں مقابلے کی سی کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

وظائف و اشغال

پابند شریعت صوفیاء اپنے مریدین کو نماز، روزہ اور شریعت کے دیگر فرائض کی پابندی کا حکم دیتے ہیں۔ مخالف شریعت صوفیاء کے ہاں بالعموم ایسا کوئی اہتمام نہیں ہوتا ہے۔ مرید کے احوال کو دیکھتے ہوئے شیخ اسے کچھ وظائف، اشغال اور معمولات تلقین کرتا ہے۔ اس کی بعض مثالیں یہ ہیں:

- روزانہ ایک ہزار مرتبہ لا الہ الا اللہ کا ذکر
- روزانہ ایک ہزار مرتبہ درود شریف
- تہجد، اشراق، چاشت، اوابین (مغرب کے بعد) کے نوافل
- ہر مہینے اور ہفتے میں مخصوص ایام کے روزے

- روزانہ کچھ وقت کے لیے مراقبہ
- روزانہ، ہفتہ وار یا ماہانہ دروس میں شرکت
- محفل سماع میں شرکت

اہل تصوف کے مختلف سلسلوں میں ان وظائف، اوراد اور اشغال کے معاملے میں کچھ فرق پایا جاتا ہے۔ چشتی اور مولوی سلسلہ میں بالعموم سماع کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ جنوبی ایشیا کے صوفیاء کے ہاں سماع کی شکل قوالی ہے۔ جو صوفیاء موسیقی کو حرام سمجھتے ہیں، ان کے ہاں قوالی یا نعت خوانی بغیر موسیقی کے ہوتی ہے۔ اس میں جو لوگ شریک ہوتے ہیں، وہ بسا اوقات حالت وجد میں آ کر رقص کرنے لگتے ہیں۔ ترکی کے صوفیاء، جو مولوی سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں، ایک خاص موسیقی کے ذریعے سماع کی محفل منعقد کرتے ہیں جس میں درویش ایک دائرے میں گردش کرتے ہوئے رقص کرتے ہیں۔ اسی طرح ذکر اور اس کے طریقے میں کچھ فرق پایا جاتا ہے۔ قادری، چشتی اور سہروردی سلسلہ میں ذکر بالعموم بلند آواز میں کیا جاتا ہے جبکہ نقشبندی سلسلہ میں ذکر نہایت خاموشی سے سانس کی آمد و رفت کے ساتھ ہوتا ہے۔

جب مرید ان وظائف کا ورد کرے گا اور صوفیانہ اشغال کی پابندی کرے گا تو اس پر کچھ نفسیاتی اور روحانی کیفیات طاری ہونا شروع ہو جائیں گی۔ اس وقت مرید پر لازم ہے کہ وہ اپنی کیفیات سے شیخ کو آگاہ کرے۔ جیسے ڈاکٹر اپنے مریض کی کیفیت کے مطابق دوا میں تبدیلی کرتا ہے، ویسے ہی پیر اپنے مرید کی کیفیات کے مطابق وظائف و اشغال میں تبدیلی کرتا رہے گا۔ عقلمند پیر، مرید پر اس کی استطاعت سے بڑھ کر بوجھ نہیں لادتے اور اس کی صلاحیت اور کیفیت کے مطابق اسے وظائف و اشغال تجویز کرتے رہتے ہیں۔ بعض پیر صاحبان اپنے یا مرید کے مزاج کے مطابق اسے کافی سخت مشاغل تجویز کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ پیر صاحبان درس وغیرہ بھی دیتے ہیں جس میں وہ مریدین کو تصور کے اسرار و رموز سے آگاہ کرتے ہیں، اخلاقی خرابیوں کو ختم کرنے اور خوبیوں کو پروان چڑھانے کے طریقے بیان کرتے ہیں اور ہر ایک مرید کی کیفیت کے مطابق اس کی راہنمائی کرتے چلے جاتے ہیں۔

مریدین میں تکبر اور خود پسندی توڑنے کے صوفیاء مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں۔ کبھی مرید کو بری طرح مجمع میں ذلیل کر دیتے ہیں۔ کبھی انہیں دوسروں کے پاؤں پڑنے کا حکم دیتے ہیں اور کبھی انہیں غلاظت صاف کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ لائق مریدین اس بات میں فخر محسوس کرتے ہیں کہ ان کے شیخ نے انہیں ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ بعض پیر صاحبان اپنے پاؤں چومنے کا حکم دیتے ہیں اور بعض اپنے سامنے زمین ادب چومنے کا۔ ایک بزرگ کا واقعہ مشہور ہے کہ وہ گھوڑے پر سوار تھے، ان کے ایک مرید نے ان کے پاؤں کو بوسہ دیا۔ انہوں نے مزید نیچے بوسہ دینے کا حکم دیا۔ مرید نے گھوڑے کے سم پر بوسہ دیا۔ اس پر بھی انہوں نے مزید نیچے بوسہ دینے کا حکم دیا تو مرید نے زمین چوم لی۔ اس پر خوش ہو کر انہوں نے انہیں بیک وقت کئی روحانی منازل طے کروا دیں۔

خاص مریدین کے اشغال

عام دنیادار قسم کے مریدوں کے لیے پیر صاحبان انہی معاملات کا اہتمام کرتے ہیں جو اوپر بیان ہوئے۔ اکثر مریدین عام دنیا دار ہی ہوتے ہیں مگر ان میں سے بعض مرید ایک خاص حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ وہ مریدین ہوتے ہیں جو دنیا کی ہر چیز چھوڑ کر خود کو پوری زندگی کے لیے راہ تصوف کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ ان مریدوں کے لیے اوراد و اشغال اور مجاہدات کافی مختلف، ایڈوانسڈ اور مشکل ہوتے ہیں۔ اس کی بعض مثالیں یہ ہیں جو ہم نے صوفیاء کی امہات کتب، ملفوظات، تذکروں اور واقعات سے اخذ کی ہیں۔ آپ صوفیاء کے تذکروں کی کسی کتاب میں بھی ان مثالوں پر مبنی واقعات پڑھ سکتے ہیں۔

- ساری رات عبادت میں بسر کرنا
- کئی کئی دن نہ سونا اور مسلسل نماز پڑھنا یا وظائف کرنا
- سارا سال روزہ رکھنا
- بغیر افطار کیے، کئی کئی دن کا مسلسل روزہ رکھنا
- کنویں کے اندر الٹا لٹک کر نماز پڑھنا، اسے معکوس نماز کہا جاتا ہے۔
- حج کے لیے ننگے پاؤں پیدل جانا
- اپنا سارا مال خیرات کر دینا اور اپنے پاس کچھ نہ بھی رکھنا
- والدین، اولاد، بیوی اور دیگر رشتے داروں کو چھوڑ کر جنگلوں میں نکل جانا
- چوبیس پچیس لاکھ مرتبہ ذکر و درود کا ورد کرنا
- خود کو خصی کروالینا تاکہ جنسی خواہش تنگ نہ کرے (یہ مسلم صوفیاء کے ہاں بہت کم ہے)
- چالیس چالیس سال تک پسندیدہ کھانا نہ کھانا اور درختوں کے پتوں اور جڑی بوٹیوں پر گزارا کرنا
- شدید سردی اور برف باری میں ٹھنڈے پانی میں ڈبکیاں لگانا، شدید گرمی میں دھوپ میں کھڑے رہنا اور صحرا کی تپتی ریت پر ننگے پاؤں چلنا
- کوئی غلطی یا گناہ ہونے کی صورت میں خود کو برسوں اذیت دینا
- گلے میں مستقل طوق اور بیڑیاں پہنے رکھنا

ان تمام اشغال کے نتیجے میں ایک طرف تو ان سالکین کی جسمانی صحت بری طرح متاثر ہوتی ہے مگر دوسری جانب وہ یہ محسوس کرتے

ہیں کہ ان کی روحانیت ترقی کر رہی ہے۔ انہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان پر انوار و تجلیات برس رہی ہیں، فرشتے نازل ہو رہے ہیں، اشیاء کی حقیقت کا علم ہو رہا ہے۔ بعض صوفیاء خود کو اللہ تعالی کے دربار میں محسوس کرتے ہیں، جسے وہ "مشاہدہ حق" سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ تمام تجربات یک دم حاصل نہیں ہوتے ہیں بلکہ درجہ بدرجہ حاصل ہوتے ہیں۔ صوفیاء انہیں "راہ سلوک کی منازل" قرار دے دیتے ہیں۔ اس میں بعض صوفیاء خلاف عادت واقعات دکھانے کی صلاحیت حاصل کر لیتے ہیں جنہیں وہ "کرامات" قرار دیتے ہیں۔ بسا اوقات کچھ جن وغیرہ بھی ان کے قابو آ جاتے ہیں۔ بعض صوفیاء حبس دم اور ہپناٹزم کی مشقیں وغیرہ بھی کرتے ہیں جس کی مدد سے وہ اپنے سامنے موجود کسی شخص کے ذہن کو کنٹرول کرنے کی صلاحیت حاصل کر لیتے ہیں۔

صوفیاء کا دعوی یہ ہے کہ اس پورے پراسیس کے نتیجے میں ان کا "تزکیہ نفس" ہو جاتا ہے۔ جب وہ مشاہدہ حق سے سرفراز ہوتے ہیں تو اس سے وہ وہ اپنے نفس کی خواہشات اور غصے پر کنٹرول حاصؒل کر لیتے ہیں۔ اس طرح اللہ تعالی کی محبت میں غرق ہو کر وہ خود بخود ان اخلاقی خرابیوں سے نجات حاصل کر لیتے ہیں جن کا غزالی نے ذکر کیا ہے۔ ان مجاہدات اور اشغال کے نتیجے میں ان کے اندر مثبت صفات پیدا ہو جاتی ہیں اور ان کا نفس پاک ہو جاتا ہے۔ جب یہ منزل کسی صوفی کو حاصل ہو جاتی ہے، تو وہ گویا "فنا فی اللہ" ہو کر اللہ کے وجود میں مل جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ "سیر فی اللہ" کی مختلف منازل طے کرتا چلا جاتا ہے۔ اگر اس کا شیخ اسے اجازت دے کر اپنے خلیفہ کے منصب پر فائز کر دے تو وہ دوسروں کو مرید بنا کر انہی تجربات سے فیض یاب کر دیتا ہے۔

صوفیانہ تربیت کے ادارے

قرون وسطی کے صوفیاء کے ہاں تزکیہ نفس کے لیے ایک خاص ادارے نے جنم لیا جسے "خانقاہ" کہا جاتا ہے۔ ابتدائی دور کی خانقاہیں اکثر سادہ سی عمارتوں پر مشتمل ہوتیں جن میں بڑے سے ہال میں صوفیاء کے رہنے کا انتظام ہوتا۔ عام طور پر خانقاہیں شہروں کے جھمیلوں سے دور جنگلوں میں بنائی جاتیں۔ خانقاہ کا سربراہ کوئی شیخ ہوتا اور اس کے مرید یہاں رہ کر یکسوئی کے ساتھ مراقبات، چلے اور مجاہدے کرتے۔ برصغیر جنوبی ایشیا میں یہ خانقاہیں صوفیاء کے مزارات کے ساتھ بنائی جانے لگیں۔ پابند شریعت صوفیاء کے ہاں خانقاہ کے اندر مسجد بھی ہوا کرتی تھی۔ یہ ادارے اب بھی قائم ہیں تاہم ان میں تزکیہ نفس کا عمل اب کم ہی مقامات پر انجام دیا جاتا ہے اور بہت سی خانقاہیں نشہ کرنے والوں اور دیگر جرائم پیشہ افراد کا مرکز بن چکی ہیں۔

ناقدین تصوف کا نقطہ نظر

ناقدین تصوف جہاں تزکیہ نفس کے مقاصد میں اہل تصوف سے اتفاق رکھتے ہیں، وہاں وہ ان طریقوں پر تنقید کرتے ہیں جو صوفیاء، تزکیہ نفس کے لیے اختیار کرتے ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ تزکیہ نفس کے یہ طریقے دین اسلام کی تعلیمات سے متصادم ہیں۔ اس ضمن میں وہ خاص طور پر چند امور پر تنقید کرتے ہیں۔ ناقدین تصوف نہ صرف صوفیاء کے طریق ہائے تزکیہ پر تنقید کرتے ہیں بلکہ وہ قرآن و سنت

کی روشنی میں ایک متبادل طریقہ بھی پیش کرتے ہیں۔ اگلے ابواب میں ہم پہلے تزکیہ نفس کے صوفیانہ طریقے پر تنقید کا جائزہ لیں گے اور پھر یہ دیکھیں گے کہ ناقدین تصوف کے ہاں تزکیہ نفس کا طریقہ کیا ہے؟

ناقدین تصوف کے نزدیک، صوفیاء کے تزکیہ کے طریقوں میں بہت سے امور قرآن و سنت کے مخالف ہیں۔ ان کا بنیادی اعتراض ان امور پر ہے:

- نفسیاتی غلامی
- مجاہدات
- تکبر توڑنے کے طریقے
- نفس انسانی سے متعلق غلط تصورات
- اذکار و اشغال

نفسیاتی غلامی کا جائزہ ہم نے علیحدہ ابواب میں لیا ہے۔ اس کا مطالعہ آپ وہاں کر سکتے ہیں۔ بقیہ معاملات پر ناقدین تصوف کے نقطہ نظر اور دلائل کا جائزہ ہم اگلے ابواب میں لیں گے۔

اسائن منٹس

- تزکیہ نفس سے کیا مراد ہے؟ صوفی عالم محمد غزالی نے کس مثال کے ذریعے تزکیہ نفس کے عمل کی وضاحت کی ہے؟
- صوفیاء کے ہاں تزکیہ نفس کے لیے کیا طریقے اختیار کیے جاتے ہیں اور ان میں سے کن طریقوں پر ناقدین کو اعتراض ہے؟

---

[1] محمد غزالی۔ احیاء العلوم الدین۔ (ترجمہ: ندیم الواجدی)۔ جلد 3۔ باب جنود القلب۔ ص 21 کراچی: دار الاشاعت۔

[2] حوالہ بالا۔ جلد 3، بیان مجامع اوصاف قلب و امثلتہ۔ ص 28-26۔

[3] امین احسن اصلاحی۔ تزکیہ نفس۔ جلد 2۔ ص 30-28۔ تعلق باللہ اور اس کی اساسات۔

[4] احمد رضا خان بریلوی۔ فتاوی افریقہ۔ ص 123۔ فیصل آباد: مکتبۃ نوریہ رضویہ۔ (www.nafseislam.com (ac. 3 May 2010

باب 12: مجاہدات اور ترک دنیا

جیسا کہ ہم پچھلے باب میں بیان کر چکے ہیں کہ جو لوگ خود کو راہ تصوف کے لیے وقف کر دیتے ہیں، انہیں غیر معمولی قسم کے مجاہدات کرنا ہوتے ہیں۔ ان مجاہدات سے متعلق واقعات آپ تذکرۃ الاولیاء، خزینۃ الاصفیاء، فوائد الفوائد اور ایسی ہی بہت سے کتب میں دیکھ سکتے ہیں۔

صوفیاء کے واقعات اور ان کا نقطہ نظر

مجاہدات کی مختلف شکلیں ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں:

عبادات میں غلو

اہل تصوف عبادات میں غیر معمولی غلو سے کام لیتے ہیں۔ چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

میں نے ہر نماز جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا فرمائی تھی، پڑھی۔ ایک وقت مجھے معلوم ہوا کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز معکوس بھی پڑھی ہے۔ میں نے رسی اپنے پاؤں میں باندھی اور کنویں میں [الٹے] لٹک کر نماز معکوس ادا کی۔ [1]

شیخ الشیوخ العالم فرید الدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ زکوۃ تین قسم کی ہے: زکوۃ شریعت، زکوۃ طریقت اور زکوۃ حقیقت۔ زکوۃ شریعت دو سو روپیہ میں سے پانچ روپیہ دینا ہے اور زکوۃ طریقت دو سو روپیہ میں سے پانچ باقی رکھنا اور زکوۃ حقیقت سب کچھ دے ڈالنا ہے۔ [2]

ایک شخص نے خانقاہ مبارک حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ میں حاضر ہو کر آپ سے طالب اجازت ہوا کہ مجھے اجازت ادائے نماز تراویح دی جائے۔ آپ نے اجازت بخشی۔ الغرض اس نے ہر شب ایک قرآن شریف ختم کیا۔ آپ نے اس کی خورش [خوراک] کے واسطے ایک نان اور تھوڑا سا سالن اور ایک کوزہ پانی مقرر فرمایا تھا۔ القصہ وہ شخص نماز عید کے بعد آپ سے رخصت ہو کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد جو کوٹھڑی دیکھی تو کل نان اور سالک موجود پایا۔ اس نے صرف ایک کوزہ آب پر اکتفا کی تھی۔

اس کے بعد حکایت امام اعظم ابو حنیفہ کوفی کی بیان فرمائی کہ آپ بماہ رمضان شریف ہر روز ایک ختم [قرآن] اور ہر شب ایک ختم فرماتے تھے اور نماز تراویح میں ایک ختم فرماتے تھے۔ غرضیکہ بماہ رمضان المبارک آپ اکسٹھ ختم قرآن شریف فرماتے تھے۔ [3]

امام اعظم نے چالیس سال عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی تھی۔۔۔۔ جنید اور شبلی کو لوگ ان کے حالات سن کر سمجھتے ہیں کہ وہ دیو ہوں گے۔ یہ غلط ہے، ان کا نام ان کے حسن معاملہ کے سبب روشن ہے۔ [4]

آپ [امام ابو حنیفہ] تین سو نفل ہر رات میں پڑھا کرتے تھے، ایک دن راستے میں آپ کے گزرتے ہوئے کسی عورت نے دوسری عورت کو اشارہ کر کے بتایا کہ یہ شخص رات میں پانچ سو نفل پڑھتا ہے۔ آپ نے ان کی گفتگو سن لی، پھر اسی رات سے پانچ سو نفل پڑھنا شروع کر دیے۔ پھر ایک

دن راستہ میں کسی نے کہہ دیا کہ یہ ہر رات ایک ہزار نفل پڑھتے ہیں اور ساری رات بیدار رہتے ہیں۔ چنانچہ اسی رات سے آپ نے ایک ہزار نفل کا معمول بنالیا اور فرمایا کہ آج سے عمر بھر پوری رات بیدار رہا کروں گا۔ جب آپ کے شاگردنے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ "اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ بعض بندے اپنی اس تعریف کو پسند کرتے ہیں جو ان میں نہیں ہے اور میں ایسے گروہ میں شامل نہیں ہونا چاہتا۔" چنانچہ آپ مکمل چالیس سال تک عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا فرماتے رہے اور طویل سجدوں کی وجہ سے آپ کے گھٹنوں میں اونٹ کے گھٹنوں جیسے نشان پڑ گئے تھے۔[5]۔۔۔

ایک مرتبہ حضرت ابراہیم ادہم جب سفر حج پر روانہ ہوئے تو ہر گام پر دو رکعت نماز ادا کرتے ہوئے چلے اور مکمل چودہ سال میں مکہ معظمہ پہنچے۔ دوران سفر یہ بھی کہتے گئے کہ دوسرے لوگ تو قدموں سے چل کر پہنچے ہیں لیکن میں آنکھوں کے بل پہنچوں گا۔۔۔۔

شیخ فارمدی کے قول کے مطابق ایام حج کے موقع پر آپ [حضرت رابعہ بصریہ] نے جنگل جا کر کروٹ کے بل لڑھکنا شروع کر دیا اور مکمل سات سال کے عرصہ میں عرفات پہنچیں۔[6]

نکاح اور بیوی بچوں سے پرہیز

صوفیاء کے ہاں نکاح کو جائز تو سمجھا جاتا ہے لیکن ان کے نزدیک آئیڈیل یہی ہے کہ انسان شادی نہ کرے، یا اگر کرلی ہے تو بیوی کو طلاق دے کر راہبانہ زندگی بسر کرے۔ شیخ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات "فوائد الفوائد" میں درج ہے:

کسی شخص نے آپ کے مرید شیخ محمد گوالیری کا سلام عرض کیا۔ حضرت خواجہ کر اللہ بالخیر نے بعد جواب سلام ارشاد فرمایا کہ ہاں، میں ان سے واقف ہوں۔ نیک اور صالح شخص ہیں، ایک مرتبہ مجھ سے دوبارہ تجرد و تاہل سوال کیا تھا، جس کے جواب میں کہا گیا کہ عزیمت تجرید [نکاح نہ کرنا] ہے اور رخصت تاہل کے کے واسطے ہے یعنی اگر کوئی شخص یاد حق میں اس درجہ مصروف ہو کہ اس کو اس معاملہ کا کبھی خیال نہ آئے اور اس کی زبان، آنکھ، ہاتھ، پیر اور دیگر اعضاء بھی محفوظ رہیں، اس کو مجرد رہنا مناسب ہے اور جس شخص کے دل میں وساوس شیطانی گزریں اور رجحان طبع بطرف کتخدائی ہو، اس کو نکاح کرلینا چاہیے۔[7]

ایک شخص رئیس نام حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کا مرید تھا۔ ایک روز اس نے خواب دیکھا [جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں پیغام بھیجا کہ] میرا سلام قطب الدین کو پہنچاؤ اور ان سے کہو کہ تم ہر شب پہلے میرے پاس تحفہ بھیجتے تھے اور پہنچتا تھا، اب تین شب سے نہیں آیا۔ مانع اس کا بخیر ہو۔

یہ خواب دیکھ کر رئیس کی آنکھ کھل گی اور انہوں نے حضرت حضرت قطب الدین نور اللہ مضجعہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو سلام کہا ہے۔ شیخ قطب الدین اس حکم کے سنتے ہی واسطے تعظیم کے اٹھ کھڑے ہوئے اور دریافت فرمایا کہ کچھ اور بھی کہا ہے۔ رئیس نے عرض کیا کہ اور یہ فرمایا تھا کہ آپ ہر شب تحفہ بھیجتے تھے، وہ پہنچتا تھا، مگر اب تین شب سے نہیں پہنچا، اس کا مانع بخیر ہو۔

یہ سنتے ہی حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کھڑے ہو گئے اور اس عورت کو طلب کیا، جس سے تین روز ہوئے نکاح کیا تھا، اور اس کا مہر ادا کر کے طلاق دے دی۔ یہ معاملہ عدم ارسال تحفہ اسی سبب سے ہوا تھا کہ آپ نے اس عورت سے نکاح کیا تھا اور تین شب اس سے مشغول رہے تھے۔

یہ فرما کر حضرت خواجہ ذکر اللہ بالخیر نے ارشاد فرمایا کہ حضرت خواجہ قطب الدین قدس سرہ کی عادت تھی کہ ہر شب تین ہزار بار درود شریف پڑھ کر سوتے تھے۔ [8]

اس گفتگو کے بعد بندہ [مولف ملفوظات] نے عرض کی کہ ایک فرقہ ہے جو گلے میں طوق آہنی اور ہاتھوں میں دست کلاہ آہنی [ہتھکڑیاں] پہنتے ہیں اور خود کو حیدر زادہ سے منسوب کرتے ہیں۔ اس کی کیا اصل ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا: یہ نسبت ان کی درست ہے۔ خواجہ حیدر زادہ پر ایک حال ایسا وارد ہوا تھا کہ وہ اس حال میں لوہا سرخ کر کے اپنے ہاتھ سے طوق اور دست کلاہ بناتے تھے۔ لوہا ان کے ہاتھ میں مثل موم کے نرم ہو جاتا تھا۔ یہ طائفہ بھی دست کلاہ آہنی اور طوق بناتے ہیں لیکن وہ حال اور وہ معاملہ ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں ہوتا۔ [9]

بعد انتقال فرما جانے حضرت شیخ فرید الدین کے مجھ کو اشتیاق ادائے حج بہت زیادہ ہوا۔ میں نے اپنے دل میں ارادہ کیا کہ اجودھن [پاکپتن] سے واپس آکر حج کو جاؤں گا۔ الغرض اجودھن حضرت شیخ الاسلام کے مزار کی زیارت کو گیا، وہاں میرا مقصود مجھے مع شے زائد حاصل ہو گیا۔ اس واقعہ کے بعد ایک مرتبہ پھر نیت خانہ کعبہ کی زیارت کی ہوئی تھی۔ اس مرتبہ بھی میں اجودھن روضہ مبارک حضرت شیخ السلام کی زیارت کو گیا اور غرض مذکور مجھے حاصل ہوا۔ [10]

جب آپ [حضرت رابعہ بصریہ] سے نکاح نہ کرنے کی وجہ دریافت کی گئی تو جواب دیا کہ تین چیزیں میرے لیے وجہ غم بنی ہوئی ہیں۔ اگر تم یہ غم دور کر دو تو میں یقیناً نکاح کر لوں گی۔ اول یہ کہ کیا خبر میری موت اسلام پر ہو گی یا نہیں۔ دوم روز محشر میرا نامہ اعمال نہ جانے سیدھے ہاتھ میں ہو گا یا الٹے ہاتھ میں۔ سوم روز محشر جب جنت میں ایک جماعت کو دائیں طرف سے اور دوسری کو بائیں طرف سے داخل کیا جائے گا تو نہ جانے میرا شمار کس جماعت میں ہو گا؟ لوگوں نے عرض کیا کہ ان تینوں سوالوں کا جواب ہمارے پاس نہیں۔ آپ نے فرمایا: پھر جس کو اتنے غم ہوں، اس کو نکاح کی کیا تمنا ہو سکتی ہے؟۔۔۔ [11]

حضرت ابراہیم بن ادہم شروع میں بلخ کے سلطان اور عظیم المرتبت حکمران تھے۔ ایک مرتبہ آپ محو خواب تھے کہ چھت پر کسی کے چلنے کی آواز آئی تو آواز دے کر پوچھا کہ چھت پر کون ہے؟ تو جواب ملا کہ میں آپ کا ایک شناسا ہوں، اونٹ کی تلاش میں چھت پر آیا ہوں۔ آپ نے فرمایا: یہاں چھت پر اونٹ کس طرح مل سکتا ہے؟ ادھر سے جواب آیا کہ آپ کو تاج و تخت میں خدا کس طرح مل جائے گا؟۔۔۔۔ سو اس طرح آپ متوجہ الی اللہ ہو گئے کہ قلب نور باطنی سے منور ہو گیا۔ اس کے بعد آپ تخت و تاج کو خیر باد کہہ کر صحرا صحرا گریہ وزاری کرتے ہوئے نیشاپور کے قرب و جوار میں پہنچ کر ایک تاریک اور بھیانک غار میں مکمل نو سال تک عبادت میں مصروف رہے۔ اس دوران ہر جمعہ کو لکڑیاں جمع کر کے فروخت کر دیتے اور جو کچھ ملتا، آدھا راہ مولا میں دے دیتے اور باقی ماندہ رقم سے روٹی خرید کر نماز جمعہ ادا کرتے۔۔۔۔ [اس طرح جناب ادہم اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر سالوں عبادت میں مصروف رہے، پھر ایک مرتبہ حج کرنے آئے۔]

جب ایام حج میں کثیر عورتیں اور بے ریش لڑکے جمع ہو جاتے ہیں، اور تمام افراد اس ہدایت کے پابند رہتے ہوئے آپ کے ہمراہ شریک رہتے۔ حالت طواف میں آپ کا وہی لڑکا سامنے آ گیا اور محبت پدری نے جوش مارا اور بے ساختہ آپ کی نگاہیں اس پر جم گئیں۔ فراغت طواف کے بعد آپ کے ادارت مندوں نے عرض کیا کہ اللہ آپ کے اوپر رحم فرمائے۔ آپ نے جس بات سے ہمیں باز رہنے کی ہدایت کی تھی، اس میں آپ خود ہی ملوث ہو گئے۔ کیا آپ اس کی وجہ بیان کر سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ یہ بات تو تمہارے علم میں ہی ہے کہ جب میں نے بلخ کو چھوڑ تو اس وقت میرا چھوٹا سا بیٹا تھا اور مجھے یقین ہے کہ وہی بچہ ہے۔ پھر اگلے دن آپ کا ایک مرید جب بلخ کے قافلہ کی تلاش کرتا ہوا، وہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہی لڑکا حریر اور دیباج کے خیمہ میں ایک کرسی پر بیٹھا تلاوت قرآن کر رہا ہے۔ اور جب اس نے آپ کے مرید سے آمد کا مقصد دریافت کیا تو

مرید نے سوال کیا کہ آپ کس کے صاحبزادے ہیں؟ یہ سنتے ہی اس لڑکے نے روتے ہوئے کہا کہ میں نے اپنے والد کو نہیں دیکھا، لیکن کل ایک بوڑھے لکڑہارے کو دیکھ کر یہ محسوس ہوا کہ شاید یہی میرے والد ہیں۔ اور اگر میں ان سے کچھ پوچھ گچھ کرتا تو اندیشہ تھا کہ وہ فرار ہو جاتے کیونکہ وہ گھر سے فرار ہو گئے تھے اور ان کا اسم گرامی ابراہیم بن ادھم ہے۔

یہ سن کر مرید نے کہا کہ چلیے میں ان سے آپ کی ملاقات کروادوں۔ وہ اپنے ہمراہ آپ کی بیوی اور بیٹے کو لے کر بیت اللہ میں داخل ہو گیا۔ جس وقت بیٹے کی نظر آپ پر پڑی تو فرط محبت سے بے تابانہ دونوں لپٹ گئے اور روتے روتے بیہوش ہو گئے۔۔۔۔ جب آپ جانے کے لیے اٹھے تو بیوی اور بچے نے اصرار کر کے آپ کو روک لیا جس کے بعد آپ نے آسمان کی طرف چہرہ اٹھا کر کہا: یاالٰہی! اغثنی۔ یہ کہتے ہی آپ کے صاحبزادے زمین پر گر پڑے اور فوت ہو گئے۔ اور جب ارادتمندوں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ جب میں بچے سے ہم آغوش ہوا تو وفور جذبات اور فرط محبت سے بے تاب ہو گیا۔ اور اسی وقت یہ ندا آئی کہ ہم سے دوستی کا دعوی اور دوسرے محبت رکھتا ہے۔ یہ ندا سن کر میں نے عرض کیا کہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کو لے لے۔ چنانچہ لڑکے کے حق میں دعا قبول ہو گئی۔۔۔۔[12]

حضرت بایزید بسطامی علیہ الرحمۃ مکتب میں داخل ہوئے تو آپ نے سورہ لقمان کی یہ آیت پڑھی کہ "کہ تو میرا [بھی] شکر ادا کر اور اپنے والدین کا بھی"۔ اس وقت اپنی والدہ سے آ کر فرمایا کہ "مجھ سے دو ہستیوں کا شکر بیک وقت ادا نہیں ہو سکتا، لہذا آپ مجھے خدا سے طلب کر لیں تا کہ میں آپ کا شکر ادا کرتا رہوں، یا پھر خدا کے سپرد کر دیں تا کہ اس کے شکر میں مشغول ہو جاؤں۔" والدہ نے فرمایا کہ میں اپنے حقوق سے دستبردار ہو کر تجھے خدا کے سپرد کرتی ہوں۔ چنانچہ اس کے بعد آپ شام کی جانب نکل گئے اور وہیں ذکر و شغل کو جزو حیات بنالیا اور مکمل تین سال شام کے میدانوں اور صحراؤں میں زندگی گزار دی اور اس عرصہ میں یاد الٰہی کی وجہ سے کھانا پینا سب ترک کر دیا۔۔۔[13]

لذات سے پرہیز

صوفیاء کے ہاں یہ تصور عام ہے کہ کسی بھی قسم کی جسمانی لذت حاصل کرنے سے روحانی نقصان ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان سے پرہیز کرتے ہیں۔ موجودہ دور کے صوفی عالم ڈاکٹر محمد طاہر القادری صاحب (b. 1951) کی کتاب "تذکرے اور صحبتیں" سے چند واقعات بطور مثال پیش خدمت ہیں:

حضرت داؤد طائی رات کو یوں فرمایا کرتے تھے، اے خدا! تیرے غم نے تمام دنیاوی غموں کو معطل کر دیا ہے اور یہ غم میرے اور میری نیند کے درمیان حائل ہے۔ حضرت داؤد طائی علیہ الرحمۃ کی دایہ نے ان سے کہا کہ آپ کو روٹی کی خواہش نہیں ہوتی؟ تو آپ نے جواب دیا: روٹی چبانے اور نان کے ٹکڑوں کو نگلنے میں پچاس آیات پڑھی جا سکتی ہیں۔۔۔۔

حضرت بشر بن الحارث علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: چالیس سال سے مجھے بھنا ہوا گوشت کھانے کی خواہش ہے مگر ابھی اس کی قیمت صاف نہیں ہوئی۔ کسی نے حضرت بشر علیہ الرحمہ سے پوچھا کہ روٹی کس سے کھاتے ہیں؟ جواب دیا کہ عافیت یاد کر کے اسی کو سالن بنالیتا ہوں۔۔۔۔

حضرت جنید علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سری سقطی علیہ الرحمۃ سے زیادہ عبادت گزار کسی کو نہیں دیکھا۔ آپ کی عمر کے اٹھانوے سال بیت گئے۔ سوائے مرض موت کے انہیں کبھی لیٹا ہوا نہیں دیکھا گیا۔۔۔۔

ایک روز حضرت سری سقطی رو رہے تھے۔ حضرت جنید نے وجہ پوچھی تو فرمایا: کل رات بچی نے آکر کہا تھا کہ ابا جان بہت گرمی ہے اور وہ ٹھنڈے پانی کا کوزہ لٹکا کر چلی گئی۔ میری آنکھ لگ گئی۔ خواب میں ایک خوبصورت لڑکی آسمان سے اتری۔ اس سے پوچھا، تم کس کی لڑکی ہو؟ اس نے جواب دیا جو کوزوں میں ٹھنڈا پانی نہ پیتا ہو۔ اس پر میں نے کوزہ زمین پر دے مارا اور اس کو توڑ ڈالا۔۔۔

آپ [حضرت جنید بغدادی] نے فرمایا کہ اشغال دنیاوی ترک کر دینے کا نام عبودیت ہے اور زہد کی انتہا افلاس [غربت] ہے۔۔۔۔[14]

سہل بن عبد اللہ تستری چالیس دن بھوکے رہتے اور پھر کچھ کھاتے۔ انہیں سال بھر کھانا کھانے کے لیے ایک درہم کافی ہوا کرتا تھا۔

عبد الوہاب شعرانی فرماتے ہیں: "میں نے کافی اہل اللہ کو بھوک میں ثابت قدم دیکھا، یہاں تک کہ ان میں بعض تو ہفتہ بھر میں صرف ایک بار رفع حاجت کے لیے جاتے کیونکہ وہ بار بار بیت الخلا میں جا کر برہنہ ہونے میں اللہ تبارک و تعالیٰ سے رماتے تھے۔ سیدی شیخ تاج الدین ذاکر اس معاملے میں یہاں تک پہنچ گئے تھے کہ ان کو بارہ دن میں صرف ایک بار وضو کی حاجت پیش آتی۔

[قوت القلوب کے مصنف ابو طالب مکی] کے تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ ایک مدت تک کھانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ فقط مباح خود رو گھاس (یعنی قدرتی طور پر اگ جانے والی گھاس) کھا کر گزارہ فرماتے رہے۔ صرف سبز سبز گھاس کھاتے تھے، اس لیے آپ کی کھال سبز ہو گئی تھی۔[15]

مجاہدات کے خلاف ناقدین تصوف کے دلائل

رہبانیت پر قرآن کا تبصرہ

ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ صوفیاء کا دنیا کو ترک کرنا، نکاح اور بیوی بچوں سے دوری اختیار کرنا، مال و دولت کمانے کو برا سمجھنا اور خود کو تکالیف میں مبتلا کرنا سخت حرام ہے اور اسلام میں اس کا کوئی تصور نہیں ہے۔ عیسائیوں کے صوفی حضرات نے ایسا کر کے دین میں ایک بدعت نکالی تھی جس کی قرآن مجید نے مذمت کی ہے۔:

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلَى آثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَآتَيْنَاهُ الإِنجِيلَ وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَأْفَةً وَرَحْمَةً وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَامَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلاَّ ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَآتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ.

پھر ہم نے ان کے نقش قدم پر پے در پے اپنے رسول بھیجے اور ان کے بعد عیسیٰ بن مریم کو بھیجا اور انہیں انجیل عطا کی۔ جن لوگوں نے ان کی پیروی کی، ہم نے ان کے دلوں میں نرمی اور رحمت رکھ دی تھی۔ اور رہی رہبانیت، تو انہوں نے اسے خود ایجاد کیا تھا، ہم نے اسے ان پر فرض نہ کیا تھا مگر انہوں نے اللہ کو راضی کرنے کے لیے اسے ایجاد کیا اور پھر اس کا حق بھی ادا نہ کر سکے۔ تو ان میں سے اہل ایمان کو ہم نے ان کا اجر دیا جبکہ ان میں سے کثیر لوگ فاسق ہیں۔ (الحدید 57:27)

ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ عیسائیوں کے راہبوں کے حالات زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مجاہدات بڑی حد تک اس سے ملتے جلتے تھے جو کہ مسلم صوفیاء کا خاصہ ہیں۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی (1903-1979) نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے

عیسائیوں میں رہبانیت کے ارتقاء اور اس کی تفصیلات سے بحث کی ہے۔ یہاں ہم اسی کو درج کر رہے ہیں:

یعنی وہ دہری غلطی میں مبتلا ہو گئے۔ ایک غلطی یہ کہ اپنے اوپر وہ پابندیاں عائد کیں جن کا اللہ نے کوئی حکم نہ دیا تھا۔ اور دوسری غلطی یہ کہ جن پابندیوں کو اپنے نزدیک اللہ کی خوشنودی کا ذریعہ سمجھ کر خود اپنے اوپر عائد کر بیٹھے تھے ان کا حق ادا نہ کیا اور وہ حرکتیں کیں جن سے اللہ کی خوشنودی کے بجائے الٹا اس کا غضب مول لے بیٹھے۔

اس مقام کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ایک نظر مسیحی رہبانیت کی تاریخ پر ڈال لینی چاہیے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد دو سو سال تک عیسائی کلیسا رہبانیت سے نا آشنا تھا۔ مگر ابتدا ہی سے مسیحیت میں اس کے جراثیم پائے جاتے تھے اور وہ تخیلات اس کے اندر موجود تھے جو اس چیز کو جنم دیتے ہیں۔ ترک و تجرید کو اخلاقی آئیڈیل قرار دینا اور درویشانہ زندگی کو شادی بیاہ اور دنیوی کاروبار کی زندگی کے مقابلے میں اعلیٰ و افضل سمجھنا ہی رہبانیت کی بنیاد ہے، اور یہ دونوں چیزیں مسیحیت میں ابتدا سے موجود تھیں۔ خصوصیت کے ساتھ تجرد کو تقدس کا ہم معنی سمجھنے کی وجہ سے کلیسا میں مذہبی خدمات انجام دینے والوں کے لیے یہ بات ناپسندیدہ خیال کی جاتی تھی کہ وہ شادی کریں، بال بچوں والے ہوں اور خانہ داری کے بکھیڑوں میں پڑیں۔ اسی چیز نے تیسری صدی تک پہنچتے پہنچتے ایک فتنے کی شکل اختیار کر لی اور رہبانیت ایک وبا کی طرح مسیحیت میں پھیلنی شروع ہوئی۔ تاریخی طور پر اس کے تین بڑے اسباب تھے :

ایک یہ کہ قدیم مشرک سوسائٹی میں شہوانیت، بدکرداری اور دنیا پرستی جس شدت کے ساتھ پھیلی ہوئی تھی اس کا توڑ کرنے کے لیے عیسائی علماء نے اعتدال کی راہ اختیار کرنے کے بجائے انتہا پسندی کی راہ اختیار کی۔ انہوں نے عفت پر اتنا زور دیا کہ عورت اور مرد کا تعلق بجائے خود نجس قرار پا گیا، خواہ وہ نکاح ہی کی صورت میں ہو۔ انہوں نے دنیا پرستی کے خلاف اتنی شدت برتی کہ آخر کار ایک دین دار آدمی کے لیے سرے سے کسی قسم کی املاک رکھنا ہی گناہ بن گیا اور اخلاق کا معیار یہ ہو گیا کہ آدمی بالکل مفلس اور ہر لحاظ سے تارک الدنیا ہو۔ اسی طرح مشرک سوسائٹی کی لذت پرستی کے جواب میں وہ اس انتہا پر جا پہنچے کہ ترک الذات، نفس کو مارنا اور خواہشات کا قلع قمع کر دینا اخلاق کا مقصود بن گیا، اور طرح طرح کی ریاضتوں سے جسم کو اذیتیں دینا آدمی کی روحانیت کا کمال اور اس کا ثبوت سمجھا جانے لگا۔

دوسرے یہ کہ مسیحیت جب کامیابی کے دور میں داخلہ ہو کر عوام میں پھیلنی شروع ہوئی تو اپنے مذہب کی توسیع و اشاعت کے شوق میں کلیسا ہر اس برائی کو اپنے دائرے میں داخل کرتا چلا گیا جو عام لوگوں میں مقبول تھی۔ اولیاء پرستی نے قدیم معبودوں کی جگہ لے لی۔ ہورس (Horus) اور آئسس (Isis) کے مجسموں کی جگہ مسیح اور مریم کے بت پوجے جانے لگے۔ سیٹرنیلیار (Saturnalia) کی جگہ کرسمس کا تہوار منایا جانے لگا۔ قدیم زمانے کے تعویذ گنڈے، عملیات، فال گیری و غیب گوئی جن بھوت بھگانے کے عمل، سب عیسائی درویشوں نے شروع کر دیے۔ اسی طرح چونکہ عوام اس شخص کو خدا رسیدہ سمجھتے تھے جو گندا اور ننگا ہو اور کسی بھٹ یا کھوہ میں رہے، اس لیے عیسائی کلیسا میں ولایت کا یہی تصور مقبول ہو گیا اور ایسے ہی لوگوں کی کرامتوں کے قصوں سے عیسائیوں کے ہاں "تذکرۃ الاولیاء" قسم کی کتابیں لبریز ہو گئیں۔

تیسرے یہ کہ عیسائیوں کے پاس دین کی سرحدیں متعین کرنے کے لیے کوئی مفصل شریعت اور کوئی واضح سنت موجود نہ تھی۔ شریعت موسوی کو وہ چھوڑ چکے تھے، اور تنہا انجیل کے اندر کوئی مکمل ہدایت نامہ نہ پایا جاتا تھا۔ اس لیے مسیحی علماء کچھ باہر کے فلسفوں اور طور طریقوں سے متاثر ہو کر اور کچھ خود اپنے رجحانات کی بنا پر طرح طرح کی بدعتیں دین میں داخل کرتے چلے گئے۔ رہبانیت بھی انہی بدعتوں میں سے ایک تھی۔ مسیحی مذہب کے علماء اور ائمہ نے اس کا فلسفہ اور اس کا طریق کار بدھ مذہب کے بھکشوؤں سے، ہندو جوگیوں اور سنیاسیوں سے، قدیم مصری فقراء (Anchorites) سے، ایران کے مانویّوں سے، اور افلاطینوس کے پیرو اشراقیوں سے اخذ کیا اور اسی کو تزکیہ نفس کا طریقہ، روحانی ترقی کا

ذریعہ، اور تقرب الی اللہ کا وسیلہ قرار دے لیا۔ اس غلطی کے مرتکب کوئی معمولی درجہ کے لوگ نہ تھے۔ تیسری صدی سے ساتویں صدی عیسوی [یعنی نزول قرآن کے زمانے] تک جو لوگ مشرق اور مغرب میں مسیحیت کے اکابر علماء، بزرگ ترین پیشوا اور امام مانے جاتے ہیں، سینٹ اَتھاناسیوس، سینٹ باسل، سینٹ گریگوری نازیانزین، سینٹ کرائی سُوسٹم، سینٹ ایمبروز، سینٹ جیروم، سینٹ آگسٹائن، سینٹ بنی ڈکٹ، گریگوری اعظم، سب کے سب خود راہب اور رہبانیت کے زبردست علمبردار تھے۔ انہی کی کوششوں سے کلیسا میں رہبانیت نے رواج پایا۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیوں میں رہبانیت کا آغاز مصر سے ہوا۔ اس کا بانی سینٹ انتھونی (St. Anthony) تھا جو 250ء میں پیدا ہوا اور 350ء میں دنیا سے رخصت ہوا۔ اسے پہلا مسیحی راہب قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے فَیُّوم کے علاقے میں پَسپیر کے مقام پر (جو اب دیرالیمون کے نام سے معروف ہے، پہلی خانقاہ قائم کی۔ اس کے بعد دوسری خانقاہ اس نے بحر احمر کے ساحل پر قائم کی جسے اب دیر مارُ انطونیوس کہا جاتا ہے۔ عیسائیوں میں رہبانیت کے بنیادی قواعد اس کی تحریروں اور ہدایات سے ماخوذ ہیں۔ اس آغاز کے بعد یہ سلسلہ مصر میں سیلاب کی طرح پھیل گیا اور جگہ جگہ راہبوں اور راہبات کے لیے خانقاہی قائم ہو گئیں جن میں سے بعض میں تین تین ہزار راہب بیک وقت رہتے تھے۔

325ء میں مصر ہی کے اندر ایک اور مسیحی ولی پاخومیوس نمودار ہوا جس نے دس بڑی خانقاہیں راہبین و راہبات کے لیے بنائیں۔ اس کے بعد یہ سلسلہ شام و فلسطین اور افریقہ و یورپ کے مختلف ملکوں میں پھیلتا چلا گیا۔ کلیسائی نظام کو اول اول اس رہبانیت کے معاملہ میں سخت الجھن سے سابقہ پیش آیا، کیونکہ وہ ترک دنیا اور تجرد اور غریبی و مفلسی کو روحانی زندگی کا آئیڈیل تو سمجھتا تھا، مگر راہبوں کی طرح شادی بیاہ اور اولاد پیدا کرنے اور ملکیت رکھنے کو گناہ بھی نہ ٹھیرا سکتا تھا۔ بالآخر سینٹ اَتھاناسیوس (متوفی 373ء) سینٹ باسل (متوفی 379ء)، سینٹ آگسٹائن (متوفی 430ء) اور گریگوری اعظم (متوفی 609ء) جیسے لوگوں کے اثر سے رہبانیت کے بہت سے قواعد چرچ کے نظام میں باقاعدہ داخل ہو گئے۔

اس راہبانہ بدعت کی چند خصوصیات تھیں جنہیں ہم اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں :

(1) سخت ریاضتوں اور نت نئے طریقوں سے اپنے جسم کو اذیتیں دینا۔ اس معاملہ میں ہر راہب دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا تھا۔ عیسائی اولیاء کے تذکروں میں ان لوگوں کے جو کمالات بیان کیے گئے ہیں وہ کچھ اس قسم کے ہیں: اسکندریہ کا سینٹ مکاریوس ہر وقت اپنے جسم پر 80 پونڈ کا بوجھ اٹھائے رکھتا تھا۔ 6 مہینے تک وہ ایک دلدل میں سوتا رہا اور زہریلی مکھیاں اس کے برہنہ جسم کو کاٹتی رہیں۔ اس کے مرید سینٹ یوسیبیوس نے پیر سے بھی بڑھ کر ریاضت کی۔ وہ 150 پونڈ کا بوجھ اٹھائے پھرتا تھا اور 3 سال تک ایک خشک کنویں میں پڑا رہا۔ سینٹ سابیوس صرف وہ مکئی کھاتا تھا جو مہینہ بھر پانی میں بھیگ کر بدبودار ہو جاتی تھی۔ سینٹ بیساریون 40 دن تک خاردار جھاڑیوں میں پڑا رہا اور 40 سال تک اس نے زمین کو پیٹھ نہیں لگائی۔ سینٹ پاخومیوس نے 15 سال، اور ایک روایت کے مطابق پچاس سال زمین کو پیٹھ لگائے بغیر گزار دیے۔ ایک ولی سینٹ جان تین سال تک عبادت میں کھڑا رہا۔ اس پوری مدت میں وہ نہ کبھی بیٹھا نہ لیٹا۔ آرام کے لیے جس ایک چٹان کا سہارا لے لیتا تھا اور اس کی غذا صرف وہ تبرک تھا جو ہر اتوار کو اس کے لیے لایا جاتا تھا۔ سینٹ سیمیون اِسٹائلائٹ (390-449) جو عیسائیوں کے اولیائے کبار میں شمار ہوتا ہے، ہر ایسٹر سے پہلے پورے چالیس دن فاقہ کرتا تھا۔ ایک دفعہ وہ پورے ایک سال تک ایک ٹانگ پر کھڑا رہا۔ بسا اوقات وہ اپنی خانقاہ سے نکل کر ایک کنویں میں جا رہتا تھا۔ آخر کار اس نے شمالی شام کے قلعہ سیمان کے قریب 60 فٹ بلند ایک ستون بنوایا جس کا بالائی حصہ صرف تین فٹ کے گھیر میں تھا اور اوپر کٹہرا بنا دیا گیا تھا۔ اس ستون پر اس نے پورے تیس سال گزار دیے۔ دھوپ، بارش، سردی، گرمی سب اس پر سے گزرتی رہتی تھیں اور وہ کبھی ستون سے نہ اترتا تھا۔ اس کے مرید سیڑھی لگا کر اس کو کھانا پہنچاتے اور اس کی گندگی صاف کرتے تھے۔ پھر اس نے ایک رسی لے کر اپنے آپ کو اس ستون سے باندھ لیا یہاں تک کہ رسی اس کے گوشت میں پیوست ہو گئی، گوشت سڑ گیا اور اس میں کیڑے

پڑ گئے۔ جب کوئی کیڑا اس کے پھوڑوں گر جاتا تو وہ اسے اٹھا کر پھر پھوڑے ہی میں رکھ لیتا اور کہتا" کھا جو کچھ خدا نے تجھے دیا ہے" مسیحی عوام دور دور سے اس کی زیارت کے لیے آتے تھے۔ جب وہ مرا تو مسیحی عوام کا فیصلہ یہ تھا کہ وہ عیسائی ولی کی بہترین مثال تھا۔

اس دور کے عیسائی اولیاء کی جو خوبیاں بیان کی گئی ہیں وہ ایسی ہی مثالوں سے بھری پری ہیں۔ کسی ولی کی تعریف یہ تھی کہ 30 سال تک وہ بالکل خاموش رہا اور کبھی اسے بولتے نہ دیکھا گیا۔ کسی نے اپنے آپ کو ایک چٹان سے باندھ رکھا تھا۔ کوئی جنگلوں میں مارا مارا پھرتا اور گھاس پھونس کھا کر گزارا کرتا۔ کوئی بھاری بوجھ ہر وقت اٹھائے پھرتا۔ کوئی طوق و سلاسل سے اپنے اعضا جکڑے رکھتا۔ کچھ حضرات جانوروں کے بھٹوں، یا خشک کنوؤں، یا پرانی قبروں میں رہتے تھے۔ اور کچھ دوسرے بزرگ ہر وقت ننگے رہتے اور اپنا ستر اپنے لمبے لمبے بالوں سے چھپاتے اور زمین پر رینگ کر چلتے تھے۔ ایسے ہی ولیوں کی کرامات کے چرچے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے اور ان کے مرنے کے بعد ان کی ہڈیاں خانقاہوں میں محفوظ رکھی جاتی تھیں۔ میں نے خود کوہ سینا کے نیچے سینٹ کیتھرائن کی خانقاہ میں ایسی ہی ہڈیوں کی ایک پوری لائبریری سجی ہوئی دیکھی ہے جس میں کہیں اولیاء کی کھوپڑیاں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں، کہیں پاؤں کی ہڈیاں، اور کہیں ہاتھوں کی ہڈیاں۔ اور ایک ولی کا تو پورا ڈھانچہ ہی شیشے کی ایک الماری میں رکھا ہوا تھا۔

(2) ان کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہر وقت گندے رہتے اور صفائی سے سخت پرہیز کرتے تھے۔ نہانا یا جسم کو پانی لگانا ان کے نزدیک خدا پرستی کے خلاف تھا۔ جسم کی صفائی کو وہ روح کی نجاست سمجھتے تھے۔ سینٹ اتھاناسیوس بڑی عقیدت کے ساتھ سینٹ انتھونی کی یہ خوبی بیان کرتا ہے کہ اس نے مرتے دم تک کبھی اپنے پاؤں نہیں دھوئے۔ سینٹ ابراہام جب سے داخل مسیحیت ہوا، پورے 50 سال اس نے نہ منہ دھویا نہ پاؤں۔ ایک مشہور راہبہ کنواری سلوِیا نے عمر بھر اپنی انگلیوں کے سوا جسم کے کسی حصے پانی نہیں لگنے دیا۔ ایک کانونٹ کی 130 راہبات کی تعریف میں لکھا ہے کہ انہوں نے کبھی اپنے پاؤں نہیں دھوئے، اور غسل کا تو نام سن کر ہی ان کے بدن پر لرزہ چڑھ جاتا تھا۔

(3) اس رہبانیت نے ازدواجی زندگی کو عملاً بالکل حرام کر دیا اور نکاح کے رشتے کو کاٹ پھینکنے میں سخت بیدردی سے کام لیا۔ چوتھی اور پانچویں صدی کی تمام مذہبی تحریریں اس خیال سے بھری ہوئی ہیں کہ تجرد سب سے بڑی اخلاقی قدر ہے، اور عفت کے معنی یہ ہیں کہ آدمی جنسی تعلق سے قطعی احتراز کرے خواہ وہ میاں اور بیوی کا تعلق ہی کیوں نہ ہو۔ پاکیزہ روحانی زندگی کا کمال یہ سمجھا جاتا تھا کہ آدمی اپنے نفس کو بالکل مار دے اور اس میں جسمانی لذت کی کوئی خواہش تک باقی نہ چھوڑے۔ ان لوگوں کے نزدیک خواہش کو مار دینا اس لیے ضروری تھا کہ اس سے حیوانیت کو تقویت پہنچتی ہے، ان کے نزدیک لذت اور گناہ ہم معنی تھے، حتیٰ کہ مسرت بھی ان کی نگاہ میں خدا فراموشی کی مترادف تھی۔ سینٹ باسل ہنسنے اور مسکرانے تک کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ ان ہی تصورات کی بنا پر عورت اور مرد کے درمیان شادی کا تعلق ان کے ہاں قطعی نجس قرار پا گیا تھا۔ راہب کے لیے ضروری تھا کہ وہ شادی کرنا تو درکنار، عورت کی شکل تک نہ دیکھے، اور اگر شادی شدہ ہو تو بیوی کو چھوڑ کر نکل جائے۔ مردوں کی طرح عورتوں کے دل میں بھی یہ بات بٹھائی گئی تھی کہ وہ اگر آسمانی بادشاہت میں داخل ہونا چاہتی ہیں تو ہمیشہ کنواری رہیں، اور شادی شدہ ہوں تو اپنے شوہروں سے الگ ہو جائیں۔ سینٹ جِیروم جیسا ممتاز مسیحی عالم کہتا ہے کہ جو عورت مسیح کی خاطر راہبہ بن کر ساری عمر کنواری رہے وہ مسیح کی دلہن ہے اور اس عورت کی ماں کو خدا، یعنی مسیح، کی ساس (Mother-in-law of God) ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ایک اور مقام پر سینٹ جیروم کہتا ہے کہ "عفت کی کلہاڑی سے ازدواجی تعلق کی لکڑی کو کاٹ پھینکنا سالک کا اولین کام ہے۔"

ان تعلیمات کی وجہ سے مذہبی جذبہ طاری ہونے کے بعد ایک مسیحی مرد یا ایک مسیحی عورت پر اس کا پہلا اثر یہ ہوتا تھا کہ اس کی خوش گوار ازدواجی زندگی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی تھی۔ اور چونکہ مسیحیت میں طلاق و تفریق کا راستہ بند تھا، اس لیے نکاح کے رشتے میں رہتے ہوئے

میاں اور بیوی ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے تھے۔ سینٹ نائٹس St. Nitus دو بچوں کا باپ تھا۔ جب اس پر رہبانیت کا دورہ پڑا تو اس کی بیوی روتی رہ گئی اور وہ اس سے الگ ہو گیا۔ سینٹ اَمون (St. Ammon) نے شادی کی پہلی رات ہی اپنی دلہن کو ازدواجی تعلق کی نجاست پر وعظ سنایا اور دونوں نے بالاتفاق طے کر لیا کہ جیتے جی ایک دوسرے سے الگ رہیں گے۔ سینٹ ابراہام شادی کی پہلی رات ہی اپنی بیوی کو چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ یہی حرکت سینٹ الیکسس (St. Alexis) نے کی۔ اس طرح کے واقعات سے عیسائی اولیاء کے تذکرے بھرے پڑے ہیں۔ [مسلم صوفیاء کے ہاں ابراہیم بن ادہم کا واقعہ ملاحظہ ہو۔]

کلیسا کا نظام تین صدیوں تک اپنے حدود میں ان انتہا پسندانہ تصورات کی کسی نہ کسی طرح مزاحمت کرتا رہا۔ اس زمانے میں ایک پادری کے لیے مجرد ہونا لازم نہ تھا۔ اگر اس نے پادری کے منصب پر فائز ہونے سے پہلے شادی کر رکھی ہو تو وہ بیوی کے ساتھ رہ سکتا تھا، البتہ تقرر کے بعد شادی کرنا اس کے لیے ممنوع تھا۔ نیز کسی ایسے شخص کو پادری مقرر نہیں کیا جا سکتا تھا جس نے کسی بیوہ یا مطلقہ سے شادی کی ہو، یا جس کی دو بیویاں ہوں، یا جس کے گھر میں لونڈی ہو۔ رفتہ رفتہ چوتھی صدی میں یہ خیال پوری طرح زور پکڑ گیا کہ جو شخص کلیسا میں مذہبی خدمات انجام دیتا ہو اس کے لیے شادی شدہ ہونا بڑی گھناؤنی بات ہے۔ 362ء کی گینگرا کونسل (Council of Gengra) آخری مجلس تھی جس میں اس طرح کے خیالات کو خلاف مذہب ٹھیرایا گیا۔ مگر اس کے تھوڑی ہی مدت بعد 386ء کی رومن سیناڈ (Synod) نے تمام پادریوں کو مشورہ دیا کہ وہ ازدواجی تعلقات سے کنارہ کش رہیں، اور دوسرے سال پوپ سائریکیس (Siricius) نے حکم دے دیا کہ جو پادری شادی کرے، شادی شدہ ہونے کی صورت میں اپنی بیوی سے تعلق رکھے، اس کو اس منصب سے معزول کر دیا جائے۔ سینٹ جیروم، سینٹ ایمبروز، اور سینٹ آگسٹائن جیسے اکابر علماء نے بڑے زور شور سے اس فیصلے کی حمایت کی اور تھوڑی سے مزاحمت کے بعد مغربی کلیسا میں یہ پوری شدت کے ساتھ نافذ ہو گیا۔ اس دور میں متعدد کونسلیں ان شکایات پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوئیں کہ جو لوگ پہلے سے شادی شدہ تھے وہ مذہبی خدمات پر مقرر ہونے کے بعد بھی اپنی بیویوں کے ساتھ "ناجائز" تعلقات رکھتے ہیں۔ آخرکار ان کی اصلاح کے لیے یہ قواعد بنائے گئے کہ وہ کھلے مقامات پر سوئیں، اپنی بیویوں سے کبھی علیحدگی میں نہ ملیں، اور ان کی ملاقات کے وقت کم از کم دو آدمی موجود ہوں۔ سینٹ گریگوری ایک پادری کی تعریف میں لکھتا ہے کہ 40 سال تک وہ اپنی بیوی سے الگ رہا حتی کہ مرتے وقت جب اس کی بیوی اس کے قریب گئی تو اس نے کہا، عورت، دور ہٹ جا!

(4) سب سے زیادہ دردناک باب اس رہبانیت کا یہ ہے کہ اس نے ماں باپ، بھائی بہنوں کی محبت، اور باپ کے لیے اولاد تک سے آدمی کا رشتہ کاٹ دیا۔ مسیحی ولیوں کی نگاہ میں بیٹے کے لیے ماں باپ کی محبت، بھائی کے لیے بھائی بہنوں کی محبت، اور باپ کے لیے اولاد کی محبت بھی ایک گناہ تھی۔ ان نزدیک روحانی ترقی کے لیے یہ ناگزیر تھا کہ آدمی ان سارے تعلقات کو توڑ دے۔ مسیحی اولیاء کے تذکروں میں اس کے ایسے ایسے دل دوز واقعات ملتے ہیں جنہیں پڑھ کر انسان کے لیے ضبط کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک راہب ایواگریَس (Evagrius) سالہا سال سے صحرا میں ریاضتیں کر رہا تھا۔ ایک روز یکایک اس کے پاس اس کی ماں اور اس کے باپ کے خطوط پہنچے جو برسوں سے اس کی جدائی میں تڑپ رہے تھے۔ اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں ان خطوں کو پڑھ کر اس کے دل میں انسانی محبت کے جذبات نہ جاگ اٹھیں۔ اس نے ان کو کھولے بغیر فوراً آگ میں جھونک دیا۔

سینٹ تھیوڈورس کی ماں اور بہن بہت سے پادریوں کے سفارشی خطوط لے کر اس خانقاہ میں پہنچیں جس میں وہ مقیم تھا اور خواہش کی کہ وہ صرف ایک نظر بیٹے اور بھائی کو دیکھ لیں۔ مگر اس نے ان کے سامنے آنے تک سے انکار کر دیا۔ سینٹ مارکس (St. Marcus) کی ماں اس سے ملنے کے لیے اس کی خانقاہ میں گئی اور خانقاہ کے شیخ (Abbot) کی خوشامدیں کر کے اس کو راضی کیا کہ وہ بیٹے کو ماں کے سامنے آنے حکم دے۔ مگر

بیٹا کسی طرح ماں سے نہ ملنا چاہتا تھا۔ آخر کار اس نے شیخ کے حکم کی تعمیل اس طرح کی کہ بھیس بدل کر ماں کے سامنے گیا اور آنکھیں بند کر لیں اس طرح نہ ماں نے بیٹے کو پہچانا، نہ بیٹے نے ماں کی شکل دیکھی۔

ایک اور ولی سینٹ پوئمن (St. Poemen) اور اس کے 6 بھائی مصر کی ایک صحرائی خانقاہ میں رہتے تھے۔ برسوں بعد ان کی بوڑھی ماں کو ان کا پتہ معلوم ہوا اور وہ ان سے ملنے کے لیے وہاں پہنچی۔ بیٹے ماں کو دور سے دیکھتے ہی بھاگ کر اپنے حجرے میں چلے گئے اور دروازہ بند کر لیا۔ ماں باہر بیٹھ کر رونے لگی اور اس نے چیخ چیخ کر کہا میں اس بڑھاپے میں اتنی دور چل کر صرف تمہیں دیکھنے آئی ہوں، تمہارا کیا نقصان ہو گا اگر میں تمہاری شکلیں دیکھ لوں۔ کیا میں تمہاری ماں نہیں ہوں؟ مگر ان ولیوں نے دروازہ نہ کھولا اور ماں سے کہہ دیا کہ ہم تجھ سے خدا کے ہاں ملیں گے۔

اس سے بھی زیادہ دردناک قصہ سینٹ سائمن اِسٹائلائٹس (St. Simeon Stylites) کا ہے جو ماں باپ کو چھوڑ کر 27 سال غائب رہا۔ باپ اس کے غم میں مر گیا۔ ماں زندہ بھی بیٹے کی ولایت کے چرچے جب دور و نزدیک پھیل گے تو اس کو پتہ چلا کہ وہ کہاں ہے۔ بے چاری اس سے ملنے کے لیے اس کی خانقاہ پر پہنچے۔ مگر وہاں کسی عورت کو داخلے کی اجازت نہ تھی۔ اس نے لاکھ منت سماجت کی کہ بیٹا یا تو اسے اندر بلالے یا باہر نکل کر اسے اپنی صورت دکھادے۔ مگر اس "ولی اللہ" نے صاف انکار کر دیا۔ تین رات اور تین دن وہ خانقاہ کے دروازے پر پڑی رہی اور آخر کار وہیں لیٹ کر اس نے جان دے دی۔ تب ولی صاحب نکل کر آئے۔ ماں کی لاش پر آنسو بہائے اور اس کی مغفرت کے لیے دعا کی۔

ایسی ہی بے دردی ان ولیوں نے بہنوں کے ساتھ اور اپنی اولاد کے ساتھ برتی۔ ایک شخص میوٹیس (Mutius) کا قصہ لکھا ہے کہ وہ خوشحال آدمی تھا۔ یکایک اس پر مذہبی جذبہ طاری ہوا اور وہ اپنے 8 سال کے اکلوتے بیٹے کو لے کر ایک خانقاہ میں جا پہنچا۔ وہاں اس کی روحانی ترقی کے لیے ضروری تھا کہ وہ بیٹے کی محبت دل سے نکال دے۔ اس لیے پہلے تو بیٹے کو اس سے جدا کر دیا گیا۔ پھر اس کی آنکھوں کے سامنے ایک مدت تک طرح طرح کی سختیاں اس معصوم بچے پر کی جاتی رہی اور وہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ پھر خانقاہ کے شیخ نے اسے حکم دیا کہ اسے لے جا کر اپنے ہاتھ سے دریا میں پھینک دے۔ جب وہ اس حکم کی تعمیل کے لیے بھی تیار ہو گا تو عین اس وقت راہبوں نے بچے کی جان بچائی جب وہ اسے دریا میں پھینکنے لگا تھا۔ اس کے تسلیم کر لیا گیا کہ وہ واقعی مرتبہ ولایت کو پہنچ گیا ہے۔

مسیحی رہبانیت کا نقطہ نظر ان معاملات میں یہ تھا کہ جو شخص خدا کی محبت چاہتا ہو اسے انسانی محبت کی وہ ساری زنجیریں کاٹ دینی چاہئیں جو دنیا میں اس کو اپنے والدین، بھائی بہنوں اور بال بچوں کے ساتھ باندھتی ہیں۔ سینٹ جیروم کہتا ہے کہ "اگر چہ تیرا بھتیجا تیرے گلے میں بانہیں ڈال کر تجھ سے لپٹے، اگر چہ تیری ماں اپنے دودھ کا واسطہ دے کر تجھے روکے، اگر تیرا باپ تجھے روکنے کے لیے تیرے آگے لیٹ جائے، پھر بھی تو سب کو چھوڑ کر اور باپ کے جسم کو روند کر ایک آنسو بہائے بغیر صلیب کے جھنڈے کی طرف دوڑ جا۔ اس معاملہ میں بے رحمی ہی تقویٰ ہے۔" سینٹ گریگوری لکھتا ہے کہ "ایک نوجوان راہب ماں باپ کی محبت دل سے نہ نکال سکا اور ایک رات چپکے سے بھاگ کر ان سے مل آیا۔ خدا نے اس قصور کی سزا اسے یہ دی کہ خانقاہ واپس پہنچتے ہی وہ مر گیا۔ اس کی لاش زمین میں دفن کی گئی تو زمین نے اسے قبول نہ کیا۔ بار بار قبر میں ڈالا جاتا اور زمین اسے نکال کر پھینک دیتی۔ آخر کار سینٹ بنی ڈکٹ نے اس کے سینے پر تبرک رکھا تب قبر نے اسے قبول کیا۔" ایک راہبہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ مرنے کے بعد تین دن عذاب میں اس لیے مبتلا رہی کہ وہ اپنی ماں کی محبت دل سے نہ نکال سکی تھی۔ ایک ولی کی تعریف میں لکھا ہے کہ اس نے کبھی اپنے رشتہ داروں کے سوا کسی کے ساتھ بے دردی نہیں برتی۔

(5) اپنے قریب ترین رشتہ داروں کے ساتھ بے رحمی، سنگدلی اور قساوت برتنے کی جو مشق یہ لوگ کرتے تھے اس کی وجہ سے ان کی انسانی جذبات مر جاتے تھے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ جن لوگوں سے انہیں مذہبی اختلاف ہوتا تھا ان کے مقابلے میں یہ ظلم و ستم کی انتہا کر دیتے تھے۔

چوتھی صدی تک پہنچتے پہنچتے مسیحیت میں 80۔90 فرقے پیدا ہو چکے تھے۔ سینٹ آگسٹائن نے اپنے زمانے میں 88 فرقے گنائے ہیں۔ یہ فرقے ایک دوسرے کے خلاف سخت نفرت رکھتے تھے۔ اس نفرت کی آگ کو بھڑکانے والے بھی راہب ہی تھے اور اس آگ میں مخالف گروہوں کو جلا کر خاک کر دینے کی کوششوں میں بھی راہب ہی پیش پیش ہوتے تھے۔ اسکندریہ اس فرقہ وارانہ کشمکش کا ایک بڑا اکھاڑا تھا۔ وہاں پہلے ایرین (Arian) فرقے کے بشپ نے اتھاناسیوس کی پارٹی پر حملہ کیا، اس کی خانقاہوں سے کنواری راہبات پکڑ پکڑ نکالی گئیں، ان کو ننگا کر کے خاردار شاخوں سے پیٹا گیا اور ان کے جسم پر داغ لگائے گئے تا کہ وہ اپنے عقیدے سے توبہ کریں۔ پھر جب مصر میں کیتھولک گروہ کو غلبہ حاصل ہوا تو اس نے ایرین فرقے کے خلاف یہی سب کچھ کیا، حتیٰ کہ غالب خیال یہ ہے کہ خود ایریس (Arius) کو بھی زہر دے کر مار دیا گیا۔ اسی اسکندریہ میں ایک مرتبہ سینٹ سائرل (St. Cyril) کے مرید راہبوں نے ہنگامہ عظیم برپا کیا، یہاں تک کہ مخالف فرقے کی ایک راہبہ کو پکڑ کر اپنے کلیسا میں لے گئے، اسے قتل کیا، اس کی لاش کی بوٹی بوٹی نوچ ڈالی اور پھر اسے آگ میں جھونک دیا۔ روم کا حال بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھا۔ 366ء میں پوپ لبیریس (Liberius) کی وفات پر دو گروہوں نے پاپائی [Appointment of Pope] کے لیے اپنے اپنے امیدوار کھڑے کیے۔ دونوں کے درمیان سخت خونریزی ہوئی۔ حتیٰ کہ ایک دن میں صرف ایک چرچ سے 137 لاشیں نکالی گئیں۔ [مسلم صوفیاء کے ہاں یہ نوبت نہیں آئی۔]

(6) اس ترک و تجرید اور فقر و درویشی کے ساتھ دولت دنیا سمیٹنے میں بھی کمی نہ کی گئی۔ پانچویں صدی کے آغاز ہی میں حالت یہ ہو چکی تھی کہ روم کا بشپ بادشاہوں کی طرح اپنے محل میں رہتا تھا اور اس کی سواری جب شہر میں نکلتی تھی تو اس کے ٹھاٹھ باٹھ قیصر کی سواری سے کم نہ ہوتے تھے۔ سینٹ جیروم اپنے زمانے [چوتھی صدی کے آخری دور] میں شکایت کرتا ہے کہ بہت سے بشپوں کی دعوتیں اپنی شان میں گورنروں کی دعوتوں کو شرماتی ہیں۔ خانقاہوں اور کنیسوں کی طرف دولت کا یہ بہاؤ ساتویں صدی [نزول قرآن کے زمانے] تک پہنچتے پہنچتے سیلاب کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ یہ بات عوام کے ذہن نشین کرا دی گئی تھی کہ جس کسی سے کوئی گناہ عظیم سرزد ہو جائے اس کی بخشش کسی نہ کسی ولی کی درگاہ پر نذرانہ چڑھانے، یا کسی خانقاہ یا چرچ کو بھینٹ دینے ہی سے ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد وہی دنیا راہبوں کے قدموں میں آ رہی جس سے فرار ان کا طرہ امتیاز تھا۔ خاص طور پر جو چیز اس تنزل کی موجب ہوئی وہ یہ تھی کہ راہبوں کی غیر معمولی ریاضتیں اور ان کی نفس کشی کے کمالات دیکھ کر جب عوام میں ان کے لیے بے عقیدت پیدا ہو گئی تو بہت سے دنیا پرست لوگ لباس درویشی پہن کر راہبوں کے گروہ میں داخل ہو گئے اور انہوں نے ترک دنیا کے بھیس میں جلب دنیا کا کاروبار ایسا چمکایا کہ بڑے بڑے طالبین دنیا ان سے مات کھا گئے۔ [مسلم صوفیاء کے ہاں بھی یہی صورتحال پیش آئی۔ موجودہ دور کی کسی بھی خانقاہ یا مزار پر جا کر اس کا مظاہرہ دیکھا جا سکتا ہے۔]

(7) عفت کے معاملہ میں بھی فطرت سے لڑ کر رہبانیت نے بارہا شکست کھائی اور جب شکست کھائی تو بری طرح کھائی۔ خانقاہوں میں نفس کشی کی کچھ مشقیں ایسی بھی تھیں جن میں راہب اور راہبات مل کر ایک ہی جگہ رہتے تھے اور بسا اوقات ذرا زیادہ مشق کرنے کے لیے ایک ہی بستر پر رات گزارتے تھے۔ مشہور راہب سینٹ ایواگریس (St. Evagrius) بڑی تعریف کے ساتھ فلسطین کے ان راہبوں کے ضبط نفس کا ذکر کرتا ہے جو "اپنے جذبات پر اتنا قابو پا گئے تھے کہ عورتوں کے ساتھ یک جا غسل کرتے تھے اور ان کی دید سے، ان کے لمس سے، حتیٰ کہ ان کے ساتھ ہم آغوشی سے بھی ان کے اوپر طرف غلبہ نہ پاتی تھی۔" غُسل اگرچہ رہبانیت میں سخت ناپسندیدہ تھا مگر نفس کشی کی مشق کے لیے اس طرح کے غسل بھی کر لیے جاتے تھے۔ آخر کار اسی فلسطین کے متعلق نیسا (Nyssa) کا سینٹ گریگوری متوفی 396ء لکھتا ہے کہ وہ بدکرداری کا اڈا بن گیا ہے۔ [مسلم صوفیاء میں اس کی نوبت کم ہی آئی ہے کیونکہ ان کے ہاں شادی کو بالکل متروک نہیں کیا جا سکا ہے۔]

انسانی فطرت کبھی ان لوگوں سے انتقام لیے بغیر نہیں رہتی جو اس سے جنگ کریں۔ رہبانیت اس سے لڑ کر بالآخر بد اخلاقی کے جس گڑھے میں جا گری اس کی داستان آٹھویں صدی سے گیارہویں صدی عیسوی تک کی مذہبی تاریخ کا بد نماترین داغ ہے۔ دسویں صدی کا ایک اطالوی بشپ لکھتا ہے کہ "اگر چرچ میں مذہبی خدمات انجام دینے والوں کے خلاف بد چلنی کی سزائیں نافذ کرنے کا قانون عملاً جاری کر دیا جائے تو لڑکوں [نابالغ بچوں] کے سوا کوئی سزا سے نہ بچ سکے گا، اور اگر حرامی بچوں کو بھی مذہبی خدمات سے الگ کر دینے کا قاعدہ نافذ کیا جائے تو شاید چرچ کے خادموں میں کوئی لڑکا تک باقی نہ رہے۔" قرون متوسطہ کے مصنفین کی کتابیں ان شکایتوں سے بھری ہوئی ہیں کہ راہبات کی خانقاہیں بد اخلاقی کے چکلے بن گئی ہیں، ان کی چار دیواریوں میں نوزائیدہ بچوں کا قتل عام ہو رہا ہے، پادریوں اور چرچ کے مذہبی کارکنوں میں محرمات تک سے ناجائز تعلقات اور خانقاہوں میں خلاف وضع فطری جرائم تک پھیل گئے ہیں، اور کلیساؤں میں اعتراف گناہ (Confession) کی رسم بد کرداری کا ذریعہ بن کر رہ گئی ہے۔

ان تفصیلات سے صحیح طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید یہاں رہبانیت کی بدعت ایجاد کرنے اور پھر اس کا حق ادا نہ کرنے کا ذکر کر کے مسیحیت کے کس بگاڑ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔[16]

ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ مسلم صوفیاء کے واقعات بھی بڑی حد تک عیسائی صوفیاء سے ملتے جلتے ہیں۔ عیسائیوں کے ہاں چونکہ یہ رہبانیت، مسلمانوں سے کئی صدیاں پہلے پیدا ہوئی، اس وجہ سے غالب گمان یہ ہے کہ مجاہدات کا یہ تصور، مسلمانوں میں عیسائیوں سے آیا۔ اس کے علاوہ یہودی کبالہ، ہندو یوگ اور بدھوں کی ترک دنیا کے اثرات بھی مسلم تصوف پر مرتب ہوئے۔

احادیث میں رہبانیت کی مذمت

ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس رہبانیت کی سختی سے مذمت فرمائی ہے۔ اس ضمن میں وہ یہ آیات اور احادیث پیش کرتے ہیں:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنْ الرِّزْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَذَلِكَ نُفَصِّلُ الآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ.

آپ فرمائیے کہ کس نے اللہ کی اس زینت اور رزق کی پاکیزہ چیزوں کو حرام کیا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لیے نکالی ہیں۔ آپ فرمائیے کہ یہ اہل ایمان کے لیے دنیاوی زندگی میں ہیں اور قیامت کے دن خالص انہی کی ہوں گی۔ ہم اسی طرح اپنی نشانیاں اس گروہ کے لیے واضح کرتے ہیں جو کہ علم رکھتی ہے۔ (الاعراف 7:32)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ وَلا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ (87) وَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمْ اللَّهُ حَلالاً طَيِّباً وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي أَنْتُمْ بِهِ مُؤْمِنُونَ (88)

اے اہل ایمان! ان پاکیزہ چیزوں کو حرام مت کرو جو اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں۔ حد سے مت گزرو کہ اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اللہ نے جو حلال اور پاکیزہ رزق تمہیں دیا ہے، اس میں سے کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔ (المائدہ)

حدثنا سعيد بن أبي مريم: أخبرنا محمد بن جعفر: أخبرنا حميد ابن أبي حميد الطويل: أنه سمع أنس بن مالك رضي الله

عنه يقول: جاء ثلاث رهط إلى بيوت أزواج النبي صلى الله عليه وسلم، يسألون عن عبادة النبي صلى الله عليه وسلم، فلما أخبروا كأنهم تقالوها، فقالوا: أين نحن من النبي صلى الله عليه وسلم؟ قد غفر الله له ما تقدم من ذنبه وما تأخر، قال أحدهم: أما أنا فإني أصلي الليل أبدا، وقال آخر: أنا أصوم الدهر ولا أفطر، وقال آخر: أنا أعتزل النساء فلا أتزوج أبدا، فجاء رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: (أنتم الذين قلتم كذا وكذا؟ أما والله أتي لأخشاكم لله وأتقاكم له، لكني أصوم وأفطر، وأصلي وأرقد، وأتزوج النساء، فمن رغب عن سنتي فليس مني)..

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: تین افراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے گھروں کی طرف آئے اور ان سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے متعلق پوچھنے لگے۔ جب انہوں نے تفصیل بیان کی تو انہوں نے آپ کی عبادت کو گویا بہت ہی کم خیال کیا۔ وہ بولے: "کہاں ہم اور کہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم؟ اللہ آپ کی اگلی پچھلی [اجتہادی] خطاؤں کو معاف کر چکا ہے۔" ان میں سے ایک بولا: "میں تو ہمیشہ پوری رات نماز پڑھوں گا۔" دوسرا بولا: "میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا اور کبھی روزہ ترک نہ کروں گا۔" تیسرا بولا: "میں خواتین سے دور رہوں گا اور کبھی شادی نہ کروں گا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ نے فرمایا: "کیا آپ لوگوں نے ایسی ایسی بات کہی ہے؟ اللہ کی قسم! میں آپ سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں اور زیادہ تقوی رکھتا ہوں مگر میں روزہ رکھتا بھی ہوں اور روزہ ترک بھی کرتا ہوں۔ میں نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور خواتین سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ جس نے میری سنت سے اعراض کیا، وہ مجھ سے نہیں۔" (بخاری، کتاب النکاح، حدیث 4776)

حدثنا عمر بن حفص: حدثنا أبي: حدثنا الأعمش: حدثنا مسلم، عن مسروق: قالت عائشة: صنع النبي صلى الله عليه وسلم شيئاً فرخص فيه، فتنزه عنه قوم، فبلغ ذلك النبي صلى الله عليه وسلم، فخطب فحمد الله ثم قال: (ما بال أقوام يتنزهون عن الشيء أصنعه، فوالله إني لأعلمهم بالله، وأشدهم له خشية).

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز کا حکم دیا، پھر اس میں کچھ رعایت فرمادی۔ ایک گروہ نے اس رخصت پر عمل نہ کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ بات پہنچی تو آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا۔ اللہ کی حمد کرنے کے بعد آپ نے فرمایا: "ان لوگوں کا کیا معاملہ ہے جو اس چیز سے بچتے ہیں جو میں نے انہیں رعایت دی ہے۔ اللہ کی قسم! میں اللہ کے معاملے میں ان سے زیادہ جانتا ہوں اور ان سے زیادہ شدت سے اللہ سے ڈرتا ہوں۔" (بخاری، کتاب الادب، حدیث 5750)

حدثنا أحمد بن صالح، ثنا عبد اللّه بن وهب قال: أخبرني سعيد بن عبد الرحمن بن أبي العمياء، أن سهل بن أبي أمامة حدّثه أنه دخل هو وأبوه على أنس بن مالك بالمدينة في زمان عمر بن عبد العزيز وهو أمير المدينة، فإذا هو يصلي صلاةً خفيفة دقيقة كأنها صلاة مسافر أو قريباً منها، فلما سلّم قال أبي: يرحمك اللّه! أرأيت هذه الصلاة المكتوبة أو شيء تنفَّلته قال: إنها المكتوبة، وإنها لصلاة رسول اللّه صلى اللّه عليه وسلم، ما أخطأت إلا شيئاً سهوت عنه فقال: إن رسول اللّه صلى اللّه عليه وسلم كان يقول: "لا تشددوا على أنفسكم فيشدد عليكم، فإن قوماً شددوا على أنفسهم فشدد اللّه عليهم؛ فتلك بقاياهم في الصوامع والديار {رهبانية ابتدعوها ما كتبناها عليهم}".

سہل بن ابی امامہ بیان کرتے ہیں کہ عمر بن عبد العزیز کا زمانہ تھا اور وہ مدینہ کے گورنر تھے۔ وہ اپنے والد کے ساتھ مدینہ میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے گھر داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ انہوں نے مسافروں کی طرح نہایت ہی ہلکی اور آسان سی نماز پڑھی۔ جب سلام دعا ہوئی تو میرے والد نے کہا: "اللہ آپ پر رحم فرمائے! کیا یہ فرض نماز ہے یا کوئی نفل؟" فرمایا: "یہ فرض نماز ہے اور بالکل ویسی ہی نماز ہے جو رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھی ہے۔ میں نے اس میں سوائے کچھ بھول چوک کے کبھی غلطی نہیں کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے: "اپنی جان پر سختی نہ کیجیے ورنہ آپ پر سختی کی جائے گی۔ ایک قوم [عیسائی صوفیاء] نے اپنی جان پر سختی کی تھی تو اللہ نے بھی ان پر سختی فرمائی۔ انہی کے بقایاجات آپ ان گرجوں اور خانقاہوں میں دیکھتے ہیں۔" پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: اور رہبانیت کی بدعت انہوں نے ایجاد کر لی تھی، ہم نے اسے ان پر فرض نہ کیا تھا۔ (ابو داؤد، کتاب الادب، حدیث 4903)

ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ صوفیاء اپنی جان پر سختی کر کے جو مجاہدات کرتے ہیں، وہ قطعی طور پر ان آیات اور احادیث کے خلاف ہیں۔ اس کے برعکس نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعتدال کی تلقین فرمائی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کسی حد تک راہبانہ رجحان رکھتے تھے، آپ نے انہیں اس سے اجتناب کی نصیحت فرمائی:

حدثنا ابن مقاتل: أخبرنا عبد الله: أخبرنا الأوزاعي قال: حدثني يحيى بن أبي كثير قال: حدثني أبو سلمة بن عبد الرحمن قال: حدثني عبد الله بن عمرو بن العاص رضي الله عنهما: قال لي رسول الله صلى الله عليه وسلم: (يا عبد الله، ألم أخبر أنك تصوم النهار وتقوم الليل). فقلت: بلى يا رسول الله، قال: (فلا تفعل، صم وأفطر، وقم ونم، فإن لجسدك عليك حقا، وإن لعينك عليك حقا، وإن لزوجك عليك حقا، وإن لزورك عليك حقا، وإن بحسبك أن تصوم كل شهر ثلاثة أيام، فإن لك بكل حسنة عشر أمثالها، فإن ذلك صيام الدهر كله). فشددت فشدد علي. قلت: يا رسول الله، إني أجد قوة؟. قال: (فصم صيام نبي الله داود عليه السلام ولا تزد عليه). قلت: وما كان صيام نبي الله داود عليه السلام؟. قال: (نصف الدهر). فكان عبد الله يقول بعدما كبر: يا ليتني قبلت رخصة النبي صلى الله عليه وسلم.

سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: "عبداللہ! مجھے علم ہوا ہے کہ آپ [روزانہ] دن کو روزہ رکھ لیتے ہیں اور [ساری] رات نماز پڑھتے ہیں؟" میں نے عرض کیا: "جی ہاں یارسول اللہ!" فرمایا: "ایسا نہ کیجیے۔ کبھی روزہ رکھیے اور کبھی نہ رکھیے۔ رات کو اٹھ [کر نماز بھی پڑھیے] اور نیند بھی پوری کیجیے۔ آپ کے جسم کا آپ پر حق ہے، آپ کی آنکھوں کا آپ پر حق ہے، آپ کی اہلیہ کا آپ پر حق ہے، آپ کے ملنے والے کا بھی آپ پر حق ہے [کہ اس کے ساتھ کھائیں پئیں۔] اگر آپ چاہیں تو ہر مہینے تین دن روزہ رکھ لیا کریں، آپ کے لیے ہر نیکی کا دس گنا اجر ہے تو گویا ایسا ہی ہے جیسے آپ سارا سال روزہ رکھ رہے ہوں گے۔"

عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے [خود پر] سختی کی تو مجھ پر سختی ہو گئی۔ میں نے عرض کیا: "یارسول اللہ! مجھ میں اس سے زائد کی قوت ہے۔" فرمایا: "پھر آپ اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام کا روزہ رکھ لیجیے اور اس سے زیادہ مت کیجیے۔" عرض کیا: "اللہ کے نبی داؤد علیہ الصلوۃ والسلام کا روزہ کیا ہے؟" فرمایا: "ایک دن روزہ رکھنا اور ایک دن نہ رکھنا۔" عبداللہ جب بڑی عمر کو پہنچے تو کہا کرتے تھے: "کاش! میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی آسانی سے فائدہ اٹھایا ہوتا۔" (بخاری، کتاب الصوم، حدیث 1874)

رہبانیت کی مذمت میں عقلی دلائل

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

خالق نے آپ کے اندر جو قوتیں اور صلاحیتیں بھی ودیعت کی ہیں، وہ سب بلا استثنا آپ کے مقصد وجود کے لیے لازمی اور ضروری ہیں، کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو کاٹ پھینکنے کے لائق ہو۔ ان میں سے کوئی چیز کسی برائی کا سبب بنتی ہے تو آپ کے سوء استعمال سے بنتی ہے۔ خرابی شے میں نہیں،

بلکہ آپ کے طریق استعمال میں ہوتی ہے۔ آپ اگر اپنی قوتوں کو صحیح طریقہ پر، صحیح محل میں، استعمال کریں گے تو ان سے اپنی اور اپنی پوری نوع کی خدمت کریں گے اور غلط طریقہ، غلط محل میں، استعمال کریں گے تو ان سے اپنی دنیا اور آخرت، دونوں برباد کریں گے۔ جوگیوں اور راہبوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ انہوں نے جسم اور جسمانی قوتوں کو بجائے خود روح کی ترقی میں مزاحم تصور کیا اور اس تصور کے تحت اپنے جوگیانہ اور راہبانہ نظام میں ان کو ختم کرنے کے لیے جاں گسل ریاضتیں ایجاد کیں جن کے تصور سے بھی وحشت ہوتی ہے۔ حالانکہ اس طرح انہوں نے روح کی ترقی و اصلاح کے مقصد کو کوئی فائدہ پہنچانے کے بجائے الٹا اس کو نہایت شدید نقصان پہنچایا۔ روح انسانی جس طرح آسمان سے غذا حاصل کرتی ہے، اسی طرح زمین سے بھی غذا حاصل کرتی ہے۔ جسم کی قوتیں اگر صحیح طور پر نشو و نما پائیں اور اپنے صحیح محل میں استعمال ہوں تو ان سے روح قوت حاصل کرتی ہے۔ برعکس اس کے اگر جسم بیمار ہو تو بیمار جسم کی روح بھی مضمحل ہو جاتی ہے۔ اس حقیقت کو ایک مثال سے سمجھیے۔ جوگیوں اور راہبوں نے انسان کی جنسی خواہش کو نہایت مہلک ٹھہرایا ہے اور روح کی آزادی اور اس کی تطہیر کے لیے اس کے قلع قمع کو لازمی بتایا ہے، حالانکہ جس شخص کے اندر قوت مردانگی نہ ہو، اس کے اندر فتوت، بسالت اور شجاعت کا پایا جانا بھی ممکن نہیں ہے۔ درآنحالیکہ یہ صفتیں ایک زندہ اور بیدار روح کا اصلی جمال ہیں۔ اگر کسی شخص میں یہ چیزیں نہ ہوں تو وہ نیم مردہ انسان ہے جس کے اندر بعض منفی قسم کی صوفیانہ نیکیاں تو پرورش پاسکتی ہیں اور ہو سکتا ہے کہ وہ محراب و منبر کی زینت بننے کے لیے بھی بعض اوصاف اپنے اندر پیدا کرلے، لیکن یہ ناممکن ہے کہ وہ کوئی ایسا کام کرسکے جس کے لیے فتوت [غیرت مندی] کا جوہر مطلوب ہو سکتا ہے۔

یہ تنبیہ ہم نے اس لیے یہاں ضروری سمجھی ہے کہ اسی راہبانہ تصور کے تحت ہمارے ارباب تصوف نے بھی روح کی تطہیر کے لیے بعض ایسے اعمال و اشغال ایجاد کیے ہیں جن کی شریعت میں اگرچہ کوئی اصل نہیں ہے، لیکن وہ ان کے زیادہ زیادہ اہتمام پر بہت زور دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان کاموں میں جو مشقت اٹھائی جاتی ہے، روح کے لیے اصلی برکت اسی کے اندر ہے۔ کھانے پینے اور لذات کی تقلیل [قلت]، بلکہ ان کے ترک کے لیے وہ نہایت جاں گسل ریاضتیں کرتے ہیں اور ان کا زعم یہ ہے کہ اس سے ان کے اندر باطن کا جو نور پیدا ہوتا ہے، وہ مخفی حقائق سے پردے اٹھادیتا ہے۔

اس طرح کی کوئی چیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہاں ہمیں نہیں ملتی، حالانکہ روحانی پاکیزگی کے اعتبار سے ان کا جو مرتبہ ہے، وہ کسی دوسرے کا نہ ہے، نہ ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس ان کے ہاں ہر معاملہ میں اعتدال و میانہ روی کی تعلیم ملتی ہے اور اگر کسی کے کسی عمل سے اس کے اندر کسی غالیانہ رجحان کا اظہار ہوا ہے تو اس کی حوصلہ شکنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمائی ہے اور حضرات صحابہ نے بھی۔ اگر کسی نے دین کے معاملہ میں تشدد کی راہ اختیار کرنی چاہی تو حضور نے اس کو متنبہ فرمایا کہ "جو دین سے دھینگا مشتی کرنی چاہے گا تو وہ شکست کھا جائے گا۔"[17]

اہل تصوف کا جواب

اس موضوع پر اہل تصوف کا کوئی واضح اور جامع جواب ہماری نظر سے نہیں گزر سکا جس میں انہوں نے موضوع بنا کر اس پر بحث کی ہو البتہ تصوف کے حق میں لکھی گئی کتب میں ضمنی طور پر بعض باتیں ملتی ہیں۔

آیت مجاہدہ

صوفیاء اپنے نقطہ نظر کے حق میں اس آیت کریمہ کو پیش کرتے ہیں:

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ.

جن لوگوں نے ہماری راہ میں مجاہدہ کیا، انہیں ہم اپنی جانب ہدایت دیں گے۔ اللہ نیکی کرنے والوں کے یقیناً ساتھ ہے۔ (العنکبوت 29:69)

ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ اس آیت کریمہ میں مجاہدہ کا مطلب وہ ریاضتیں اور چلے نہیں ہیں جو صوفیاء سر انجام دیتے ہیں۔ اس سے مراد وہ جدوجہد اور کوشش ہے جو انسان حق کی تلاش میں اللہ کے لیے سر انجام دیتا ہے۔ لفظ مجاہدہ کی صحیح تشریح وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ سے منقول ہے۔ ان حضرات نے کبھی ترک دنیا والا مجاہدہ نہیں کیا بلکہ ہمیشہ دنیا میں رہتے ہوئے نیکی پر عمل کی کوشش کی اور راہ حق میں تکالیف سہیں۔ یہی وہ مجاہدہ ہے جس کا قرآن نے حکم دیا ہے۔ اس مجاہدے کی تشریح خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے طرز عمل سے فرمادی ہے کہ محض بھوکا رہنا اور جنسی تعلقات منقطع کرنا مجاہدہ نہیں ہے۔ مجاہدہ اس بات کا نام ہے کہ راہ خدا میں اگر انسان پر اللہ تعالی کی جانب سے کوئی تکالیف آ پڑیں تو وہ انہیں صبر سے برداشت کرے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایسا ہی کیا اور جب ان کے حالات بہتر ہوئے تو انہوں نے دنیاوی زندگی کو بھرپور انجوائے بھی کیا۔

غار حرا بطور دلیل

بعض صوفیاء مجاہدات اور مراقبات کے حق میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غار حرا میں مراقبے فرمائے۔ آپ دنیا کو بالکل ترک کر کے شہر سے دور غار میں تشریف لے جاتے اور وہاں مراقبہ فرماتے۔ اس کے جواب میں ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ یہ واقعہ نزول وحی سے پہلے کا ہے۔ وحی کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ اس کے بعد آپ نے زیادہ سے زیادہ ترک دنیا کی جو اجازت دی، وہ رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف کی صورت ہے۔ آپ نے سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کو مجاہدات سے خود منع فرمایا۔ پھر غار حرا میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام زیادہ سے زیادہ چند دن کا ہوا کرتا تھا اور آپ اپنا کھانے پینے کا سامان لے کر جاتے۔ پھر کچھ دن بعد واپس آکر اپنے خاندان کے حقوق ادا فرماتے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھر والوں کے حقوق تلف کر کے اعتکاف کیا ہو۔

اصحاب صفہ

بعض صوفیاء اپنے مجاہدات کے حق میں اصحاب صفہ کے عمل کو بھی بطور دلیل پیش کرتے ہیں بلکہ لفظ "صوفی" کو بھی "صفہ" سے اخذ کردہ بتاتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اصحاب صفہ وہ صحابہ تھے جنہوں نے دنیا کو ترک کر کے خود کو صرف دین کے لیے وقف کر لیا تھا۔ یہ حضرات سارا دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہتے، آپ سے دین سیکھتے اور اپنا تزکیہ کرتے۔ صوفیاء بھی یہی کرتے

ہیں۔

اس کے جواب میں ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ صوفیاء کا یہ دعوی غلط ہے۔ اصحاب صفہ ہر گز تارک الدنیا راہب نہیں تھے بلکہ یہ وہ لوگ تھے جو ہجرت کر کے آتے اور ان کے پاس ٹھکانہ نہ ہوتا تو عارضی طور پر مسجد نبوی کے پاس چبوترے پر ٹھہر جاتے۔ ان کا کوئی تعلق تصوف سے نہ تھا۔ ابن تیمیہ (661-728/1263-1327) لکھتے ہیں:

> ہجرت کرنے والے مسلمان دو قسم کے تھے۔ بعض اہل و عیال کے ساتھ آتے تھے اور بعض تن تنہا نکل کھڑے ہوتے تھے۔ انصار انہیں اپنے ہاں مہمان اتارتے تھے کیونکہ انہوں نے بیعت اسی بات پر کی تھی کہ مسلمانوں کو پناہ دیں گے اور ہر طرح کی ہمدردی کریں گے۔۔۔ بعض کو رہنے کے لیے کوئی جگہ نہ ملتی تھی اور وہ مجبوراً صفہ میں پناہ لیتے تھے جو مسجد میں واقع تھا۔ تمام اہل صفہ ہمیشہ اکٹھا نہیں رہتے تھے۔ بعض شادی بیاہ کر کے الگ ہو جاتے اور گھر بسا لیتے تھے جبکہ بعض مناسب وقت کا انتظار کرتے تھے۔ تمام اہل صفہ بیک وقت نہیں آئے تھے، بتدریج آئے تھے اور وقتاً فوقتاً کم زیادہ ہوتے رہتے تھے۔ چنانچہ کبھی دس یا اس سے بھی کم ہو جاتے اور کبھی بیس، تیس، چالیس، ساٹھ، ستر تک بھی پہنچ جاتے۔ [18]

ناقدین کا کہنا یہ ہے کہ کتب رجال میں اصحاب صفہ کے حالات پڑھے جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب صفہ میں قیام کے دوران دین سیکھتے، جنگلوں سے لکڑیاں چن کر اپنی روزی کماتے اور بعد میں کچھ رقم اکٹھی کر کے کوئی کاروبار وغیرہ کر کے گھر بسا لیتے تھے۔ انہیں تارک الدنیا صوفی سمجھنا بالکل خلاف واقع ہے۔

صحابہ کرام کی بھوک

صوفیاء کہتے ہیں کہ ایسی متعدد احادیث موجود ہیں جن میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بھوکا رہنے کا ذکر ہے۔ مثلاً صحیح بخاری کی ایک حدیث میں ہے کہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ پیٹ پر پتھر باندھ کر گزارا کرتے تھے اور کبھی بھوک سے بے ہوش بھی ہو جایا کرتے تھے۔ کچھ یہی کیفیت دیگر اصحاب صفہ کی تھی۔ جنگ خندق کے موقع پر تمام صحابہ پیٹ پر پتھر باندھے خندق کھود رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر دو پتھر باندھ رکھے تھے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ان دنوں انہیں دو سیاہ چیزوں، کھجور اور پانی پر گزارا کرنا پڑتا تھا۔ مجاہدات کر کے صوفیاء ان بزرگوں کی پیروی کرتے ہیں۔

اس کے جواب میں ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بطور مجاہدات کبھی بھوک برداشت نہیں کی۔ جنگوں کے زمانہ میں مدینہ میں خوراک کی تنگی ہو گئی تھی جس کی وجہ سے انہیں یہ بھوک برداشت کرنا پڑی اور انہوں نے اللہ تعالی کے دین کے لیے ایسا کیا۔ جنگ خیبر میں مسلمانوں کی فتح کے بعد یہ کیفیت ختم ہو گئی، مسلمانوں کی مالی حالت بہتر ہوئی اور انہیں پیٹ بھر کر کھانا نصیب ہوا۔ ہاں یہ بات درست ہے کہ بعض احادیث میں بہت زیادہ کھانے سے منع فرمایا گیا ہے کیونکہ یہ صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔

صحابہ کو مجاہدات کی ضرورت نہیں

بعض صوفیاء یہ بھی کہتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ان مجاہدات کی ضرورت نہ تھی کیونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

براہ راست فیض حاصل کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کے صوفیاء کو ان مجاہدات کے ایجاد کرنے کی ضرورت پیش آئی۔

ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نمونہ ہمارے سامنے پیش فرمایا، وہ ہر اعتبار سے کامل ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے بھی دین وہی ہے جو ہمارے لیے ہے۔ اس وجہ سے ان کے اور ہمارے درمیان فرق کرنا درست نہیں ہے۔ اس طرح تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ صحابہ کو پانچ نمازوں کی ضرورت تھی، اور ہم چونکہ برے ماحول میں پیدا ہوئے ہیں، اس وجہ سے ہمیں دس نمازوں کی ضرورت ہے۔ ان پر ایک ماہ کے روزے فرض تھے، ہمیں چھ ماہ کے روزے رکھنے چاہییں۔ وہ سال میں ایک بار حج کرتے تھے، ہم تین بار کریں گے۔ اس طرح دین کی بنیاد ہی ڈھے جائے گی اور اس میں نت نئی بدعات سے اس کا حلیہ بگڑ جائے گا۔

عارضی مجاہدات

بعض صوفیاء اپنے بزرگوں کے عمل کی توجیہ کچھ یوں کرتے ہیں:

- ان بزرگوں کی طرف یہ واقعات غلط منسوب ہیں۔
- اہل تصوف کے ہاں یہ مجاہدات مختصر مدت کے لیے عارضی طور پر کیے جاتے ہیں۔

اس کے جواب میں ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ اگر ان بزرگوں کی طرف واقعات غلط طور پر منسوب ہیں تو پھر صوفیاء کو چاہیے کہ ان کی کھلے عام تردید کریں اور تصوف کی امہات کتب میں سے انہیں نکال باہر کریں۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو کم از کم فٹ نوٹ ہی میں ان پر تنقید کر دیں تاکہ لوگ گمراہ نہ ہوں۔

جہاں تک ان مجاہدات کے عارضی ہونے کا تعلق ہے تو یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ ان واقعات میں چالیس چالیس سال کے مجاہدات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اگر ان مجاہدات کو عارضی بھی تسلیم کر لیا جائے تو ان کا ثبوت نہ تو قرآن میں ملتا ہے اور نہ حدیث میں۔ اس وجہ سے یہ بدعت اور دین سے تجاوز ہیں۔ جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا اور نہ ہی اپنے صحابہ کا تزکیہ نفس ان کے ذریعے کیا، اس میں کوئی خیر نہیں ہو سکتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جہاد کو اسلام کی رہبانیت قرار دیا۔ اس کے علاوہ روزہ، اعتکاف اور حج میں کسی نہ کسی حد تک رہبانیت کے جذبے کی تسکین بھی کر دی گئی ہے۔ یہ وہ زیادہ سے زیادہ حدود ہیں جو رہبانیت کے جذبے کی تسکین کرنے کے لیے اسلام میں مشروع کی گئی ہیں۔

مجاہدات بطور ایک ذریعہ

بعض صوفیاء یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ مجاہدات اصل مقصود نہیں ہیں بلکہ محض ایک ذریعہ ہیں۔ جیسے عہد صحابہ میں کتب کا رواج نہ تھا، بعد میں محدثین اور فقہاء نے کتابیں مرتب کیں۔ اسی طرح صوفیاء نے مجاہدات ایجاد کیے۔ اس کے جواب میں ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ ذریعہ کے طور پر بھی وہی کام کیے جا سکتے ہیں جن کی شریعت میں اجازت ہو۔ صوفیاء کے ان مجاہدات کی واضح ممانعت قرآن و حدیث

میں آئی ہے، جس کی وجہ سے انہیں بطور ذریعہ استعمال کرنا بھی درست نہیں ہے۔

اسائن منٹس

- عیسائی اور مسلم صوفیاء کے مجاہدات کا ایک دوسرے سے موازنہ کیجیے۔ ان میں کیا مشابہت پائی جاتی ہے اور کن امور میں ان کے ہاں اختلاف موجود ہے؟
- احادیث میں ترک دنیا پر مبنی مجاہدات کی ممانعت کے باوجود صوفیاء میں یہ رجحان کیوں پیدا ہوا؟ اس کی نفسیاتی وجوہات بیان کیجیے۔
- مجاہدات کے حق میں صوفیاء قرآن و سنت سے کیا دلائل پیش کرتے ہیں اور ناقدین تصوف اس کا کیا جواب دیتے ہیں؟ صوفیاء کے دلائل کا موازنہ ناقدین کے دلائل سے کیجیے۔

تعمیر شخصیت

اپنے وعدے اور معاہدے ہمیشہ پورے کیجیے۔ اللہ کے ہاں ہمیں ان کے لئے جوابدہ ہونا پڑے گا۔

[1] امیر علاء سنجری (ترجمہ: شمس بریلوی)۔ فوائد الفوائد۔ حصہ اول، پانچویں مجلس۔
[2] حوالہ بالا۔ حصہ سوم۔ نویں مجلس۔
[3] حوالہ بالا۔ حصہ چہارم۔ نویں مجلس۔
[4] حوالہ بالا۔ حصۂ چہارم۔ تینتیسویں مجلس۔
[5] محمد طاہر القادری۔ تذکرے اور صحبتیں۔ ص97۔ لاہور: منہاج القرآن پبلی کیشنز(2008)۔ www.minhajbooks.com (ac. 3 May 2011)
[6] حوالہ بالا۔ ص68۔
[7] فوائد الفوائد۔ حصہ چہارم۔ اٹھائیسویں مجلس۔
[8] حوالہ بالا۔ حصہ سوم۔ دسویں مجلس۔
[9] حوالہ بالا۔ حصہ اول۔ سترہویں مجلس۔
[10] حوالہ بالا۔ حصہ چہارم۔ اٹھائیسویں مجلس۔
[11] تذکرے اور صحبتیں۔ ص69۔
[12] حوالہ بالا۔ ص77-73
[13] حوالہ بالا۔ ص94
[14] حوالہ بالا۔ ص90-83
[15] محمد الیاس قادری۔ پیٹ کا قفل مدینہ۔ ص28-14۔ www.dawateislami.net (ac. 20 May 2011)
[16] سید ابو الاعلیٰ مودودی۔ تفہیم القرآن، سورۃ الحدید، آیت27۔ www.quranurdu.com (ac. 31 Dec 2009)
[17] امین احسن اصلاحی۔ تزکیہ نفس۔ جلد1۔ ص204-200
[18] تقی الدین ابن تیمیہ (661-728/1263-1327)۔ (ترجمہ: عبدالرزاق ملیح آبادی)۔ اصحاب صفہ اور تصوف کی حقیقت۔ ص11۔ لاہور: مکتبہ سلفیہ۔ www.kitabosunnat.com (ac. 27 Apr 2011)

باب 13: معیار تقویٰ اور اوراد و اشغال

اس باب میں ہم تصوف کے دو امور پر تنقید کا مطالعہ کریں گے:

- اہل تصوف کے ہاں تقویٰ کا معیار
- اوراد و اشغال

اہل تصوف کے ہاں تقویٰ کا معیار

صوفیاء کا نقطہ نظر

صوفیاء بہت سے معاملات میں اتنی غیر معمولی احتیاط کرتے ہیں جس کا تصور بھی ایک عام انسان نہیں کر سکتا ہے۔ ان کے ہاں نیکی اور تقویٰ کا معیار نہایت ہی بلند ہے۔ غزالی کی احیاء العلوم سے ہم چند مثالیں پیش کر رہے ہیں جن سے صوفیاء کے معیار کا اندازہ ہوتا ہے۔

> یحییٰ بن یحییٰ سے مروی ہے کہ انہوں نے دوا پی۔ اہلیہ نے عرض کیا کہ آپ نے دوا پی ہے، اگر کچھ گھر میں ٹہل لیں تو بہتر ہو گا۔ فرمایا کہ میں تیس برس سے اپنے نفس کا احتساب کر رہا ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ یہ ٹہلنا دین میں ہے؟ گویا اس خیال سے انہوں نے ٹہلنے کی جرأت نہیں کی کہ یہ ٹہلنا کہیں غیر دینی فعل نہ ہو جائے۔

> سری سقطی فرماتے ہیں کہ ایک دن میں نے پہاڑ پر اگی ہوئی گھاس کھائی اور اس چشمہ سے پانی پیا جو پہاڑ کے پہلو سے نکل رہا تھا، اور دل میں کہا کہ اگر میں نے کسی حلال و طیب غذا کھائی ہے تو شاید وہ یہی دن ہے۔ اسی وقت ایک آواز آئی کہ جس قوت سے تو یہاں تک پہنچا، وہ کیسی تھی؟ کہاں سے حاصل ہوئی؟ [یقیناً کسی حرام کھانے سے۔] اس آواز کے ساتھ ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور نادم ہو کر میں نے اپنے خیال سے رجوع کیا۔

> اسی نوعیت کا ایک واقعہ ذوالنون مصری سے منقول ہے کہ وہ بھوکے پیاسے قید کے دن کاٹ رہے تھے۔ ایک نیک خاتون کے علم میں جب یہ صورتحال آئی تو انہوں نے داروغہ زنداں [یعنی جیلر] کے ذریعہ کھانا بھجوایا لیکن ذوالنون مصری نے یہ کہہ کر کھانا لینے سے انکار کر دیا کہ مجھے یہ کھانا ایک ظالم کے ذریعہ ملا ہے۔ یہ ورع کا اعلیٰ مقام ہے۔

> بشر حافی ان نہروں سے پانی نہیں پیا کرتے تھے جو امراء اور سلطان نے کھدوائیں تھی۔ پانی بذات خود مباح تھا، لیکن وہ جس ذریعہ سے ان تک پہنچ رہا تھا، وہ ان کے نزدیک مال حرام سے بنایا گیا تھا، بعض اکابرین نے انگور کھانے چھوڑ دیے اور باغبانوں سے کہہ دیا کہ تم نے اپنے باغوں کو خراب کر لیا ہے۔ تم ظالم اور بددین امراء کی کھدوائی ہوئی نہروں سے انہیں سیراب کرتے ہو۔۔۔۔

ایک بزرگ نے یہ معلوم ہونے کے بعد چراغ گل کر دیا کہ ان کا غلام ایسے لوگوں کے چراغ سے یہ چراغ جلا کر لایا ہے جن کا مال مکروہ ہے۔ ایک گزرگ نے اس تنور کی چنگاری سے آگ روشن نہیں کی جس میں حرام لکڑی جلائی گئی تھی۔ ایک بزرگ نے شاہی مشعلوں کی روشنی میں کوئی کام کرنے حتی کہ جوتوں کے تسمے باندھنے تک سے پرہیز کیا۔ [1]

تصوف کی بنیادی کتاب "رسالہ قشیریہ" میں ہے:

[توکل یہ ہے کہ] اگر درندے اور سانپ بھی تمہارے گردوپیش حرکت کر رہے ہوں تو تم حرکت مت کرو۔۔۔ ذوالنون کہتے ہیں کہ توکل تدبیر نفس کو چھوڑنے کا نام ہے۔ [2]

فوائد الفوائد میں ہے:

ارشاد فرمایا کہ متقی اور تائب برابر ہیں۔ متقی وہ ہے جس نے اپنی عمر میں کبھی گناہ نہیں کیا اور کوئی معصیت اس سے سرزد نہیں ہوئی اور تائب وہ ہے جس سے گناہ سرزد ہوئے اور اس نے توبہ کی۔ [3]

ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی کتاب "تذکرے اور صحبتیں" میں صوفیاء کی غیر معمولی احتیاط اور تقوی کے چند اور واقعات یہ ہیں:

[ایک مرتبہ ایک کتے سے بایزید بسطامی کی گفتگو ہوئی تو] کتے نے کہا کہ ہم دونوں کا ساتھ رہنا ممکن نہیں کیونکہ میں مردود ہوں اور آپ مقبول بارگاہ۔ دوسرا یہ کہ میں دوسرے دن کے لیے ایک ہڈی بھی جمع نہیں کرتا اور آپ سال بھر کا غلہ جمع کر کے رکھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ صد حیف! جب میں کتے کے ہمراہ رہنے کے قابل بھی نہیں تو پھر خدا کا قرب کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟۔۔۔

ایک رات بایزید ایک سرائے کی دیوار پر اللہ تعالی کی یاد کے لیے گئے صبح تک کوئی ذکر نہ کر سکے۔ میں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ بچپن میں ایک لفظ زبان پر جاری ہو گیا تھا۔ وہ یاد آ گیا تھا، اس لیے شرم آئی کہ اسی زبان سے اللہ تعالی کی یاد کروں۔۔۔ [4]

حضرت داؤد طائی علیہ الرحمۃ کہتے ہیں کہ میں نے بیس سال تک کبھی آپ [ابو حنیفہ] کو تنہائی یا مجمع میں ننگے سر اور ٹانگیں پھیلائے نہیں دیکھا اور جب میں نے عرض کیا کہ تنہائی میں کبھی تو ٹانگیں سیدھی کر لیا کریں تو فرمایا کہ مجمع میں تو بندوں کا احترام کروں اور تنہائی میں خدا کا احترام نہ کروں؟ یہ میرے لیے ممکن نہیں۔۔۔ [5]

حضرت جنید بغدادی فرماتے ہیں اگر کوئی سچی طلب والا دس لاکھ سال تک بھی اللہ تعالی کی طرف متوجہ رہے اور پھر صرف ایک لحظہ کے لیے منہ موڑلے تو اس لمحہ کے دوران وہ جو کچھ کھو بیٹھتا ہے، وہ بمقابلہ اس کے جو اس نے حاصل کیا، کہیں زیادہ ہے۔۔۔ [6]

شیخ عبد القادر جیلانی (470-561/1077-1166) کے والد محترم کے بارے میں اہل تصوف کی متعدد کتب میں لکھا ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ نہر میں بہتا ہوا ایک سیب کھا لیا۔ پھر انہیں خیال آیا کہ ایسا کر کے انہوں نے کسی کا مال ناحق طریقے سے کھایا ہے۔ وہ نہر کے کنارے چلتے چلتے ایک باغ تک پہنچے جس کے سیب اس جیسے تھے، جو وہ کھا بیٹھے تھے۔ انہوں نے باغ کے مالک سے مل کر اپنے قصور کی معافی چاہی۔ مالک نے اس شرط پر معافی کا وعدہ کیا اگر وہ چالیس برس تک اس کی غلامی اختیار کر لیں۔ چنانچہ انہوں نے گھر بار چھوڑ کر ایسا ہی کیا۔ [7]

اسی ضمن میں بعض متفرق واقعات یہ ہیں جنہیں صوفی مآخذ سے علامہ عبد الرحمان کیلانی (d. 1995)نے اپنی کتاب "شریعت و طریقت" میں درج کیا ہے:

بایزید بسطامی کو 72 مرتبہ خدا کا تقرب حاصل ہوا۔ آپ نے ہر دفعہ کہا: میں ابھی پورا کلمہ گو اور مسلمان نہیں ہوا۔ کئی سالوں تک آپ نے ٹوٹی ہوئی لاٹھی اور پرانا جبہ رکھا۔ آخر چالیس دن ریاضت کرتے رہنے کے بعد آپ نے خدا کی بارگاہ میں عرض کی کہ الہی! اگر تو مجھے اپنے فضل و کرم سے باریابی کا شرف عطا فرمائے تو تیرا کیا نقصان ہے؟ ہاتف نے آواز دی: "بایزید! تو اس ٹوٹی ہوئی لاٹھی اور پرانے جبے سے ہماری بارگاہ میں حاضر ہونا چاہتا ہے۔" آپ نے اسی وقت دونوں کو زمین پر پھینک دیا اور آپ کا مقصد حاصل ہو گیا۔"[8]

حضرت بایزید بسطامی نے کسی امام کے پیچھے نماز پڑھی۔ بعد از فراغت امام نے پوچھا: "یا حضرت! آپ مانگتے بھی کسی سے کچھ نہیں کرتے بھی کچھ نہیں تو گزر بسر کیسے ہوتی ہے؟" آپ نے فرمایا: "ٹھہرو! میں نماز کا اعادہ کر لوں، کیونکہ جو اپنے رازق کو نہیں پہچانتا، اس کے پیچھے نماز جائز ہے۔[9]

جب کوئی آپ [حضرت سفیان ثوری] کی دعوت کرتا تو ردنہ کرتے کیونکہ حدیث میں ہے کہ جو دعوت دے اسے قبول کرو۔ لیکن روٹی اپنے گھر سے لے جاتے اور وہی کھاتے۔ صاحب خانہ کی دریافت پر فرماتے کہ تمہیں تو اپنی روٹی کا حال معلوم ہے مگر مجھے معلوم نہیں کہ حلال مال سے ہے یا حرام سے۔ مجھے اپنی روٹی کا علم ہے کہ حلال سے ہے۔ تمہارے بلانے سے میں آ گیا لیکن روٹی اپنی کھاؤں گا۔"[11]

ایک بار آپ [احمد بن حرب] کی والدہ شریفہ نے ایک مرغ ذبح کیا اور کہا: "یہ مرغ میرے گھر کا پالا ہوا ہے، اس میں کچھ شک و شبہ نہیں۔ اسے کھاؤ۔" آپ نے کہا: "یہ وہی مرغ تو ہے جو ایک روز ہمسائے کے کوٹھے پر چلا گیا اور وہاں سے دانے کھا آیا تھا۔ یہ میرے لیے حلال نہیں۔"[10]

ناقدین تصوف کا نقطہ نظر

ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ صوفیاء نے غلو کرتے ہوئے اپنا معیار اس قدر بلند کر لیا ہے کہ اس تک پہنچنا عملاً ممکن ہی نہیں ہے۔ احتیاط میں اتنا غلو دین اسلام کے مزاج ہی سے متصادم ہے۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا کہ انسان یا تو مایوس ہو کر عمل ہی ترک کر دیتا ہے یا پھر ایک معاملے میں غلو کرتے ہوئے دین کے دیگر احکام چھوڑ دیتا ہے۔

اگر عبادت کا معیار یہ ہو کہ انسان کبھی نہ سوئے اور ہر رات میں ہزار رکعت پڑھے تو پھر وہ بیوی بچوں کے حقوق کیسے ادا کرے گا، رزق حلال کیسے کمائے گا اور دیگر فرائض کیسے انجام دے سکے گا؟ پھر ہزار رکعتیں رات میں پڑھنا ممکن ہی نہیں کیونکہ اگر ایک منٹ میں ایک رکعت بھی پڑھی جائے تو ہزار رکعتوں کے لیے سولہ گھنٹے چالیس منٹ درکار ہوں گے اور سردیوں کی طویل راتیں بھی کم از کم ہمارے خطے میں اتنی طویل نہیں ہوتی ہیں۔ اسی طرح حلال و حرام کا معیار اگر یہ مان لیا جائے کہ شدید بھوک کے عالم میں حلال کھانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا جائے کہ اسے مجھ تک پہنچانے میں ایک ظالم کے ہاتھ لگے ہیں تو پھر دنیا کی کون سی چیز حلال رہ جاتی ہے؟

اس غلو کے پیدا ہونے کے اسباب سے متعلق مولانا امین احسن اصلاحی (1904-1997) لکھتے ہیں:

انسان کے اندر یہ عام کمزوری پائی جاتی ہے کہ جن چیزوں کے ساتھ اس کا تعلق محض عقلی ہی نہیں بلکہ جذباتی بھی ہوتا ہے، ان کے معاملے میں وہ

بسا اوقات غیر متوازن اور غیر معتدل ہو جایا کرتا ہے۔ آدمی اپنے بیوی بچوں سے محبت کرتا ہے تو صرف محبت ہی نہیں کرتا بلکہ بسا اوقات اس محبت میں وہ ایسا اندھا ہو جاتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ عداوت بھی کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ اس اندھے پن میں اس کو خدا کے حقوق کا بھی کچھ ہوش نہیں رہ جاتا۔ اگر اسے اپنے قبیلہ یا قوم یا ملک سے محبت ہے تو ان کی عصبیت اس پر بسا اوقات اتنی غالب آ جاتی ہے کہ وہ ان کے لئے پوری انسانیت کا دشمن بن جاتا ہے۔ حد یہ ہے کہ ان کی حمایت میں خود خدا سے بھی لڑنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

یہی چیز مذہب کے دائرہ میں آ کر اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے کیونکہ مذہب کے ساتھ اولاً تو عام لوگوں کا تعلق عقلی کم اور جذباتی زیادہ ہوتا ہے اور اگر عقلی ہوتا بھی ہے تو بھی اس معاملے میں انسان کے جذبات اتنے شدید ہوتے ہیں کہ عقل کے لئے ان کو ضبط میں رکھنا آسان کام نہیں ہوتا۔ یہ جام وسنداں کی بازی کھیلنا ہر شخص کے بس کا کام نہیں ہے۔ چنانچہ اس دائرہ کے اندر ایسا بہت ہوتا ہے کہ آدمی کو جس حد پر رک جانا چاہئے وہاں آ کر وہ نہیں رکتا بلکہ اس حد کو پھلانگ کر آگے نکل جانا چاہتا ہے۔ اگر ایک شخص اس کا مرشد ہے تو وہ اس کو مرشد ہی کے درجہ پر نہیں رکھے گا بلکہ اس کی خواہش ہو گی کہ وہ کسی طرح اس کو رسالت کے مرتبہ پر فائز کر دے۔ اسی طرح اگر ایک ذات کو خدا نے منصب رسالت سے سرفراز فرمایا ہے تو یہ اپنے جوش عقیدت میں یہ چاہے گا کہ اس کو خدا کی صفات میں بھی کچھ نہ کچھ شریک کر دے۔ اگر اس سے کسی کام کا مطالبہ پاؤ سیر کیا گیا ہے تو وہ چاہے گا کہ وہ اس کو بڑھا کر سیر بھر کر دے۔

اس غلو پسندی نے دنیا میں بڑی بڑی بدعتوں کی بنیادیں ڈالی ہیں۔ اسی کے سبب سے عیسائیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنایا، اسی کے سبب سے انہوں نے اپنے صوفیوں اور عالموں کو اربابا من دون اللہ کا درجہ دیا اور یہی چیز تھی جس نے ان کو رھبانیت کے فتنہ میں مبتلا کیا۔ [11]

مسلمانوں میں اس غلو کے ارتقاء سے متعلق مولانا اصلاحی لکھتے ہیں:

لیکن [قرآن وحدیث کی] ان نہایت واضح تاکیدات و تنبیہات کے باوجود مسلمانوں کے اندر بھی غلو پسندی کی یہ بیماری پھیلی اور اس سے ہمارے فکر و عمل کے ہر گوشے میں مختلف قسم کی بدعتیں داخل ہو گئیں۔ اس سے عقائد بھی متاثر ہوئے، احکام و قوانین بھی متاثر ہوئے اور عبادات و اخلاق بھی اس کی زد میں آ ئے۔

عقائد و نظریات میں یہ فتنہ بیشتر علم کلام کی راہ سے گھسا اور عبادات و اخلاق میں زیادہ تر تصوف کی راہ سے۔ اس طرح کی ساری چیزوں پر تفصیل کے ساتھ بحث کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ ہم صرف مثال کے طور پر اشاعرہ کے جبر [انسان مجبور محض ہے]، معتزلہ کے نظریہ اختیار [انسان کو کلی اختیار حاصل ہے]، معطلہ اور مجسمہ کے نظریات تعطیل و تجسیم اور حضرات صوفیاء کے نظریہ وحدت الوجود کی طرف اشارہ کر دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ نجات کے معاملے میں خوارج کی تنگ نظری [کہ گناہ کبیرہ کرنے والے کی نجات ممکن نہیں] اور مرجیہ کی بے قیدی اور اباحت [کہ جو چاہے کر لو، نجات ہو ہی جانی ہے] بھی اسی ذیل میں شمار کیے جانے کے لائق ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو خلق قرآن کے جس فتنہ کے سبب سے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا، وہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

اسی طرح فقہ میں بعض خود ساختہ اصولوں کو اساس بنا کر تخریج در تخریج کا جو سلسلہ شروع ہوا، اور خیالی صورتیں فرض کر کر کے جو مسائل پیدا کیے گئے، اس کے سبب سے ہماری فقہ میں بھی ہر باب کے تحت ایسی بے شمار جزئیات داخل ہو گئیں جو زندگی کو بالکل تنگ کر دینے والی اور آدمی کے فکر و عمل کی آزادی کو بالکل سلب کر لینے والی ہیں۔ جو باتیں شریعت نے ہر آدمی کی سمجھ بوجھ پر چھوڑی تھیں اور جن میں وہ اپنی عقل سے کام

لے کر ان کے مختلف پہلوؤں میں سے کسی پہلو کو بھی اختیار کر سکتا تھا، ان کی ایک خاص شکل معین کر دی گئی، اور اس کو اس درجہ اہمیت دے دی گئی کہ اس سے معمولی انحراف خود دین سے انحراف سمجھا جانے لگا۔

اس غلو پسندی کا سب سے زیادہ مظاہرہ ان مسائل میں ہوا ہے جو مختلف فقہی مذاہب میں کسی سبب سے مابہ النزاع بن گئے ہیں۔ یہ مسائل ہیں تو عموماً بالکل جزوی اور فروعی نوعیت کے، لیکن ہر مسلک کی کتابوں میں اتنی شد و مد سے ان پر بحثیں ہوئی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ دین کے اصلی مسائل یہی ہیں اور انسان کی نجات کا تمام تر انحصار انہی کے اختیار کرنے یا نہ کرنے پر ہے۔ یہ بحثیں ہر مسلک کے حامیوں کی طرف سے تصنیفات و تالیفات میں بھی پورے زور و قوت کے ساتھ اٹھائی گئی ہیں اور انہی پر ایک ایک مسجد اور ایک ایک مدرسہ میں آئے دن مناظرہ کی مجلسیں بھی گرم ہوتی رہتی ہیں بلکہ بسا اوقات ان کے سبب سے مسلمانوں کے اندر جنگ و جدل، تکفیر و تفسیق [کافر و فاسق قرار دینا]، گرفتاری و مقدمہ بازی اور قتل و آتش زنی تک نوبتیں پہنچتی ہیں۔

غلو کے سبب سے عبادات و اخلاق میں زیادہ تر بدعتیں تصوف کی راہ سے آئی ہیں۔ صوفیاء نے تزکیہ نفس، تقرب الہی اور ذکر و عبادت کی بعض ایسی صورتیں ایجاد کی ہیں جن کا کتاب و سنت میں کوئی نشان نہیں ملتا ہے۔ پر مشقت ریاضتیں، چلہ کشی اور عملیات، ان کے ہاں ایسی مثالیں موجود ہیں جن کا دین بہتر ہونا تو درکنار، ان کا جواز بھی مشکل ہی سے ثابت کیا جا سکتا ہے بلکہ ان میں سے بعض کے تو بدعت ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔ میں نے ایک مرتبہ خود ایک بزرگ کو دیکھا کہ وہ ایک پاؤں سے کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ [الٹے لٹک کر نماز بھی اسی زمرے میں آتی ہے۔]

ممکن ہے کسی کو خیال ہو کہ اس طرح کی چیزیں صرف بدعت پسند صوفیوں ہی کے ہاں پائی جاتی ہیں۔ جو صوفیاء کتاب و سنت پر عامل ہیں، ان کے ہاں اس طرح کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ یہ خیال اگر حقیقت کے مطابق ثابت ہو جائے تو مجھے اس سے نہایت خوشی ہو گی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں تصوف کا جو حصہ پاکیزہ ہے، بعض چیزیں اس میں بھی ایسی ملتی ہیں جن کے بدعت ہونے میں کسی کلام کی گنجائش نہیں ہے۔ مثلاً ہر شخص جانتا ہے کہ تصور شیخ کو محبت الہی کا ایک زینہ سمجھا گیا ہے اور ہمارے صوفیانہ لٹریچر میں اس کی جو توجیہ عموماً کی گئی ہے، اس کی روشنی میں یہ کتاب و سنت کے صریح خلاف نظر آتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کے قائل بعض ایسے لوگ بھی ہیں جن کے لائق احترام ہونے میں کوئی شخص بھی اختلاف نہیں کر سکتا۔

صوفیانہ لٹریچر میں اس غلو کا سب سے زیادہ مظاہرہ اس حصے میں ہوا ہے جہاں یہ حضرات صبر، شکر، زہد، قناعت، توکل، انابت، عبودیت، خشیت اور محبت و رضا وغیرہ کی حقیقتیں بیان کرتے ہیں۔ یہ بحثیں آپ تصوف کی کسی قابل اعتماد کتاب میں پڑھیے، میں اس کے لیے رسالہ قشیریہ یا قوت القلوب یا امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی احیاء العلوم کے پڑھنے کا مشورہ دیتا ہوں۔ یہ کتابیں صوفیانہ لٹریچر میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اصلاح نفس کے نقطہ نظر سے ان کتابوں کو نہ صرف پڑھنا بلکہ بار بار پڑھتے رہنا نہایت ضروری ہے۔

ان کتابوں میں جب آدمی ان مباحث کو پڑھتا ہے تو پہلی نظر میں ان کی دل کشی مسحور کر لیتی ہے لیکن جب آدمی ان کا تجزیہ کرنے بیٹھتا ہے اور یہ چیز بھی اس کے پیش نظر ہوتی ہے کہ ان کو عملی زندگی میں اپنانا بھی ہے تو پھر وہ اکثر جگہ یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ باتیں اگرچہ بڑی ہی اعلی، بڑی ہی پاکیزہ اور بڑی ہی زریں ہیں، لیکن ان کو اپنانا صرف ان ہی بزرگوں کا کام تھا، جنہوں نے یہ لکھی ہیں یا جو گزر چکے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو وہ یہ رائے قائم کرنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے کہ انسان اپنے بشری تقاضوں سے دست کش ہوئے بغیر شاید ان کو اپنا ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ علامہ ابن قیم

نے مدارج السالکین میں سلوک کے مقامات پر بحث کرتے ہوئے جگہ جگہ یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اگر فلاں چیز کی حقیقت یہ ہے جو ارباب تصوف پیش کرتے ہیں تو پھر اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ اس مقام کو صحابہ بلکہ انبیاء بھی حاصؒل نہ کر سکے۔۔۔۔

[تصوف کی مشہور کتاب منازل السائرین کے مصنف] شیخ ابو اسماعیل نے توبہ، توکل، صبر، رضا وغیرہ کی شرح میں یہ طریق اختیار کیا ہے کہ ہر چیز کے تین درجے بیان کرتے ہیں: پہلا درجہ عوام کا، دوسرا درجہ خواص [خاص لوگوں] کا، تیسرا درجہ اخص الخواص [نہایت خاص لوگوں] یا بالفاظ دیگر کاملین و عارفین کا۔ عموماً پہلے درجے ہی کا معیار وہ ایسا بلند قائم کرتے ہیں کہ آدمی یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ قرآن آدمی کو جہاں تک لے جانا چاہتا ہے، وہ تو بس یہیں تک ہے اور اگر اس میں کسی پہلو سے کوئی کسر ہے تو دوسرے میں تو وہ بہر حال پوری ہو جاتی ہے۔ رہا تیسرا درجہ تو وہ صاف ایک مافوق بشریت درجہ معلوم ہوتا ہے۔[12]

ناقدین تصوف کے دلائل

ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ دین اسلام کا مزاج یہ ہے کہ یہ نہایت ہی آسان ہے۔ اگر انسان مشکل میں ہو، تو دین کے احکام میں اسی درجے میں رخصت دے دی جاتی ہے۔ انسان اگر نماز کھڑا ہو کر پڑھنے کی طاقت نہ رکھے، تو بیٹھ کر پڑھ لے، اس کی بھی طاقت نہ رکھے تو لیٹ کر پڑھ لے۔ اس کی بھی طاقت نہ ہو تو اشاروں سے پڑھ لے۔ اگر کسی شخص پر بیماری کا غلبہ ہو اور وہ بے ہوش رہے تو اشاروں سے نماز بھی قضا کرنے کی اسے اجازت دے دی جاتی ہے۔ یہی حال روزوں اور دیگر عبادات کا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمْ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِيضاً أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمْ الْيُسْرَ وَلا يُرِيدُ بِكُمْ الْعُسْرَ.

تو آپ لوگوں میں سے جو کوئی اس مہینے [رمضان] کو پائے، اسے چاہیے کہ وہ اس میں روزے رکھے۔ اور جو کوئی مریض یا مسافر ہو، تو وہ اور دنوں میں گنتی پوری کر لے۔ اللہ آپ لوگوں کے لیے آسانی چاہتا ہے، تنگی نہیں چاہتا۔ (البقرۃ 2:185)

یہود و نصاریٰ کے علماء اور مشائخ نے ان پر مشکل احکام کا جو بوجھ لاد رکھا تھا، اللہ تعالیٰ نے اسے بوجھ اور بیڑیوں سے تعبیر کرتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نشانی یہ بیان فرمائی کہ آپ ان سختیوں کو ختم کرنے والے ہیں:

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوباً عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالإِنجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنْ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمْ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمْ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالأَغْلالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ أُوْلَئِكَ هُمْ الْمُفْلِحُونَ.

وہ لوگ جو ان رسول، جو کہ نبی امی ہیں، کی پیروی کرتے ہیں۔ جن کے بارے میں وہ اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں کہ وہ انہیں نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع فرمائیں گے، ان کے لیے پاکیزہ چیزوں کو حلال اور خبیث چیزوں کو حرام فرمائیں گے اور ان سے وہ بوجھ اور بیڑیاں اتار پھینکیں گے، جو ان پر لاد دی گئی ہیں۔ تو جو آپ پر ایمان لائیں اور آپ کی تائید اور مدد کریں گے اور اس نور کی پیروی کریں گے جو آپ کے ساتھ نازل ہوا، تو وہی فلاح پانے والے ہیں۔ (الاعراف 7:157)

حدیث میں بھی یہی بات بیان ہوئی ہے:

حدثنا عمر بن حفص: حدثنا أبي: حدثنا الأعمش: حدثنا مسلم، عن مسروق: قالت عائشة: صنع النبي صلى الله عليه وسلم شيئاً فرخص فيه، فتنزه عنه قوم، فبلغ ذلك النبي صلى الله عليه وسلم، فخطب فحمد الله ثم قال: (ما بال أقوام يتنزهون عن الشيء أصنعه، فوالله إني لأعلمهم بالله، وأشدهم له خشية).

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز کا حکم دیا، پھر اس میں کچھ رعایت فرما دی۔ ایک گروہ نے اس رخصت پر عمل نہ کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ بات پہنچی تو آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا۔ اللہ کی حمد کرنے کے بعد آپ نے فرمایا: "ان لوگوں کا کیا معاملہ ہے جو اس چیز سے بچتے ہیں جو میں نے انہیں رعایت دی ہے۔ اللہ کی قسم! میں اللہ کے معاملے میں ان سے زیادہ جانتا ہوں اور ان سے زیادہ شدت سے اللہ سے ڈرتا ہوں۔" (بخاری، کتاب الادب، حدیث 5750)

حدثنا أبو اليمان قال: أخبرنا شعيب، عن الزهري قال: أخبرني عبيد الله بن عبد الله بن عتبة بن مسعود: أن أبا هريرة قال: قام أعرابي فبال في المسجد، فتناوله الناس، فقال لهم النبي صلى الله عليه وسلم: (دعوه وهريقوا على بوله سجلا من ماء، أو ذنوبا من ماء، فإنما بعثتم ميسرين، ولم تبعثوا معسرين).

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دیہاتی کھڑا ہوا اور اس نے مسجد میں پیشاب کر دیا۔ لوگوں نے اسے پکڑ لیا۔ ان سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اسے چھوڑ دیجیے اور اس کے پیشاب پر پانی کا ایک ڈول بہا دیجیے۔ آپ لوگ تو آسانی پیدا کرنے کے لیے مبعوث کیے گئے ہیں، تنگی پیدا کرنے کے لیے نہیں۔" (بخاری، کتاب الطہارت، حدیث 220)

ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ دینی احکام سے متعلق بہت سی آسانیاں اور رخصتیں دی گئی ہیں۔ سفر میں نماز کو نصف کر دیا گیا ہے، اسی طرح صحیح بخاری کی احادیث کے مطابق شدید گرمی، شدید سردی اور بارش کے باجماعت نماز حتیٰ کہ جمعہ کی نماز چھوڑ دینے کی اجازت بھی دی گئی ہے۔[13] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں کس قدر آسانی ہے۔ دین کا مزاج یہ نہیں ہے کہ بعید از کار وہموں کی بنیاد پر حلال و حرام میں شک کیا جائے۔

حدثنا يوسف بن موسى: حدثنا أبو خالد الأحمر قال: سمعت هشام بن عروة يحدث عن أبيه، عن عائشة قالت: قالوا: يا رسول الله، إن هنا أقواماً حديثاً عهدهم بشرك، يأتوننا بلحمان، لا ندري: يذكرون اسم الله عليها أم لا؟ قال: (اذكروا أنتم اسم الله وكلوا).

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ لوگوں نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! بعض ایسی اقوام ہیں جو [اسلام میں] نئی ہیں اور ابھی ان کا شرک کا زمانہ نیا نیا گزرا ہے۔ وہ ہمارے پاس گوشت لاتے ہیں اور ہمیں علم نہیں ہوتا کہ انہوں نے اس پر اللہ کا نام لیا ہے یا نہیں؟" فرمایا: "آپ اس پر اللہ کا نام لے کر کھا لیجیے۔" (بخاری، کتاب التوحید، حدیث 6963)

صوفیانہ وظائف، اشغال و اوراد

اس باب میں ہم ناقدین تصوف کی دوسری تنقید کا مطالعہ کریں گے جو صوفیاء کے اشغال و اوراد سے متعلق ہے۔ صوفیاء کے ہاں لاکھوں

کی تعداد میں وظائف پڑھے جاتے ہیں اور ناقدین تصوف ان پر تنقید کرتے ہیں۔

اشغال و اوراد کی تفصیلات

صوفیاء کے ہاں ایسے بہت سے وظائف اور اوراد پڑھے جاتے ہیں یا پڑھنے کے لیے دیے جاتے ہیں، جن کا کوئی ذکر نہ قرآن میں ملتا ہے اور نہ حدیث میں۔ اس کی چند مثالیں یہ ہیں:

میں نے ہر نماز جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا فرمائی تھی، پڑھی۔ ایک وقت مجھے معلوم ہوا کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز معکوس بھی پڑھی ہے۔ میں نے رسی اپنے پاؤں میں باندھی اور کنویں میں [الٹے] لٹک کر نماز معکوس ادا کی۔[14]

آپ نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ تم معہ چند یاران دیگر ایک لاکھ مرتبہ سورۃ فاتحہ پڑھو اور کو تم ہی پڑھنے کے لیے ان لوگوں میں تقسیم کر دو۔ میں نے یہ حال اپنے پیر بھائیوں سے جو خانقاہ میں موجود تھے، کہا اور ان میں تقسیم کی۔ کسی نے پانچ ہزار اور کسی نے چار ہزار پڑھنے کا وعدہ کیا۔ میں نے دس ہزار اپنے ذمہ لیں۔ یہ ورد ایک ہفتہ یا اس سے بھی کم میں تمام ہو گیا۔[15]

اس کے بعد گفتگو نماز اویس قرنی کے بارے میں ہوئی۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ نماز اویس قرنی رجب کی تیسری، چوتھی، پانچویں تاریخ کو پڑھی جاتی ہے۔ بعدہ فرمایا کہ بعضوں نے تیرہویں، چودہویں اور پندرہویں تاریخ اس نماز کے لیے مقرر فرمائی ہے۔[16]

دولت قدم بوسی حاصل ہوئی۔ جس وقت بندہ نے زمین بوسی کی، آپ نے از راہ لطافت فرمایا کہ بعد نماز ظہر دس رکعتیں پانچ سلام سے پڑھا کرو اور ان میں دس سورتیں آخر قرآن شریف کی پڑھو۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ اس نماز کا نام صلوۃ خضر ہے اور جو شخص پیوستہ اس نماز کو پڑھے گا، اس کو حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقات نصیب ہو گی۔[17]

تصوف کی مشہور کتاب بہجۃ الاسرار میں ایک اور نماز کا بیان ہے جسے نماز غوثیہ کہا جاتا ہے:

حضرت شیخ ابو القاسم عمر البزار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت سیدنا شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ: "جو شخص مجھ کو مصیبت میں پکارے تو اس کی وہ مصیبت جاتی رہے گی اور جس تکلیف میں مجھے پکارے تو اس کی وہ تکلیف جاتی رہے گی۔" پھر فرمایا کہ "جو شخص دو رکعت نماز پڑھے اور ہر رکعت میں سورہء فاتحہ کے بعد سورہء اخلاص گیارہ بار پڑھے پھر سلام کے بعد سرور کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم پر درود پاک پڑھے اور مجھ کو یاد کرے اور عراق کی جانب گیارہ قدم چلے اور میرا نام لے کر اپنی حاجت طلب کرے تو اللہ عزوجل کے حکم سے اس کی حاجت پوری ہو جائے گی۔"[18]

اس کے علاوہ بہت سے اوراد و وظائف صوفیاء کے ہاں عام ہیں جن میں درود لکھی، درود تاج، قصیدہ غوثیہ، درود تنجینا وغیرہ عام ہیں۔ ان سب کا کوئی ذکر کتاب و سنت میں نہیں ملتا ہے۔ عام طور پر صوفی حلقوں میں کئی کئی ہزار اور لاکھ مرتبہ ان کا ورد کیا جاتا ہے۔

ناقدین تصوف کا نقطہ نظر

ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ یہ تمام اوراد و اشغال صوفیاء کی ایجاد ہیں۔ ان کا نہ تو قرآن مجید میں کہیں ذکر ملتا ہے اور نہ ہی حدیث میں۔

اگر ان میں کوئی خیر ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں اپنی امت کو تعلیم فرماتے۔ آپ نے ایسا نہیں کیا، اس وجہ سے ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ جو شخص دین میں ایسے اضافے کرتا ہے، وہ معاذ اللہ لاشعوری طور پر یہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ قرآن و سنت کامل نہیں ہیں اور ان میں اضافے کی ضرورت ہے۔ ناقدین تصوف اس ضمن میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں:

حدثنا يعقوب: حدثنا إبراهيم بن سعد، عن أبيه، عن القاسم بن محمد، عن عائشة رضي الله عنها قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من أحدث في أمرنا هذا ما ليس فيه فهو رد.

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس نے ہمارے معاملے میں کوئی نئی چیز ایجاد کی جس پر ہم نہیں ہیں، تو وہ مردود عمل ہے۔ (بخاری، کتاب الصلح، حدیث 2550)

اس معاملے میں اہل تصوف کا جواب یہی ہے کہ بدعت کی دو قسمیں ہیں: ایک اچھی بدعت اور دوسرے بری بدعت۔ ان کے یہ وظائف اچھی بدعت یا بدعت حسنہ کے ضمن میں آتے ہیں۔

اسائن منٹس

- صوفیاء کے اندر ایسے کون سے معاملات پائے جاتے ہیں، جو ناقدین کی نظر میں غلو کہلائے جا سکتے ہیں۔ چند مثالیں دیجیے۔
- صوفیاء کے اوراد و وظائف پر اہل تصوف کا اعتراض کیا ہے؟

تعمیر شخصیت

حسد کرنے والا کسی اور کو نقصان پہنچانے کی بجائے صرف خود ہی کو نقصان پہنچاتا ہے۔

[1]ابو حامد غزالی۔ احیاء العلوم الدین۔ جلد 2۔ کتاب الحلال والحرام

[2] ابو القاسم القشیری (376-465/986-1072)۔(تحقیق: عبد الحلیم محمود اور محمود بن شریف)۔الرسالة القشيرية۔باب توکل۔ قاہرہ: مؤسسہ دار الشعب (1989) www.al-mostafa.com (ac. 13 May 2011)

[3] امیر علاء سنجری (ترجمہ: شمس بریلوی)۔ فوائد الفوائد۔ حصہ اول، مجلس اول

[4] محمد طاہر القادری۔ تذکرے اور صحبتیں۔ ص94

[5]حوالہ بالا۔ ص97

[6]حوالہ بالا۔ ص110

[7]بہجۃ الاسرار۔

[8] مرشد کامل بحوالہ شریعت وطریقت

[9] روح تصوف

[10] مقربان حق بحوالہ شریعت وطریقت۔ ان واقعات کے لیے تفصیلی حوالہ کی ضرورت نہیں۔ صوفیاء کے تذکروں پر مشتمل کسی بھی کتاب میں ایسے ڈھیروں واقعات مل سکتے ہیں۔

[11]امین احسن اصلاحی۔ تزکیہ نفس۔ جلد 1۔ ص201-202۔

[12]حوالہ بالا۔ صح205-207۔

[13]بخاری، کتاب الجمعہ، حدیث 859

[14] فوائد الفوائد، حصہ اول، پانچویں مجلس

[15]حوالہ بالا۔ حصہ دوم۔ سترہویں مجلس۔

[16]حوالہ بالا۔ حصہ اول۔ اکیسویں مجلس۔

[17] حوالہ بالا۔ حصہ اول۔ چھبیسویں مجلس۔

[18] بہجۃ الاسرار، ذکر فضل اصحابہ وبشراہم

باب 14: صوفیاء کا علم نفسیات، اخفاء اور موضوع احادیث

اس باب میں ہم اہل تصوف پر تین قسم کی تنقیدات کا مطالعہ کریں گے:

- صوفیاء کا علم نفسیات
- علم تزکیہ کا مخفی ہونا
- موضوع یا جعلی احادیث کا بھرپور استعمال

صوفیاء کا علم نفسیات

چونکہ تزکیہ نفس کا تعلق انسانی شخصیت اور اس کی نفسیات سے ہے، اس وجہ سے اہل تصوف نے علم نفسیات میں غیر معمولی دلچسپی لی ہے۔ مشہور صوفی امام غزالی نے انسانی نفسیات پر اس درجے کا غیر معمولی کام کیا جس کی تعریف ناقدین تصوف بھی کرتے ہیں۔ تاہم صوفیاء کے علم نفسیات میں چند امور ایسے ہیں جن پر کلام کیا جا سکتا ہے:

مرتبہ احسان

اہل تصوف "احسان" کو ایک مقام اور مرتبہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں مرتبہ احسان کو پانے کے لیے تصوف کے اس پورے پراسیس سے گزرنا پڑتا ہے۔ ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ یہ بات درست نہیں ہے۔ احسان ایک عقلی اور منطقی عمل ہے، جس کی تعریف اس حدیث میں بیان ہوئی ہے:

> قال: ما الإحسان؟ قال: (أن تعبد الله كأنك تراه، فإن لم تكن تراه فإنه يراك).
>
> [جبرائیل نے] عرض کیا: "احسان کیا ہے؟" [رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے] فرمایا: "وہ یہ ہے کہ آپ اللہ کی عبادت اس طرح کیجیے جیسے آپ اسے دیکھ رہے ہیں۔ اگر آپ اسے نہ دیکھتے ہوں تو وہ تو آپ کو دیکھتا ہی ہے۔" (بخاری، کتاب الایمان، حدیث 50)

ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ اگر انسان نماز میں اپنی توجہ کو اللہ تعالی کی طرف مرکوز کر لے اور یہ تصور کرے کہ وہ اللہ تعالی کے دربار میں حاضر ہے، تو ایسا آسانی سے ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے کسی چلے، مراقبے یا وظیفے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک سادہ اور آسان عمل ہے اور ہر شخص ایسا کر سکتا ہے۔ جب کوئی شخص پانچ نمازوں میں ایسا کرے گا تو بڑی حد تک امکان یہ ہے کہ اللہ تعالی کی نظر میں ہونے کا یہ تصور نمازوں کے درمیانی اوقات میں بھی اس کے سامنے رہے گا اور وہ اس کی بدولت گناہوں سے بچ سکے گا۔ یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب انسان نماز کے معانی سے واقف ہو۔ مولانا امین احسن اصلاحی (1904-1997) لکھتے ہیں:

اس زمانہ میں عوام کو بہت بڑا طبقہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو عربی زبان سے ناواقف ہونے کی وجہ سے سرے جانتے ہی نہیں کہ وہ نماز میں جو کچھ پڑھتے ہیں، اس میں کس بات کا اقرار اور کس بات کا انکار کرتے ہیں۔ وہ نماز کے الفاظ کو منتروں کی طرح پڑھتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ خواہ ہم ان کے معنی مطلب سمجھیں یا نہ سمجھیں، یہ منتر کارگر ہو کے رہیں گے۔ ان کے نزدیک سارا جادو بس ان الفاظ میں ہے۔ اگر الفاظ الٹے سیدھے زبان سے ادا ہو گئے تو تیر نشانہ پر لگ گیا۔

دوسرے بہت سارے لوگ ہیں جو ان الفاظ کے معنی سے تو بے خبر نہیں ہیں لیکن یا تو غفلت کے سبب سے دھیان نہیں کرتے یا دھیان کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ یہ جس طرح قرآن کی تلاوت محض بطور تبرک کرتے ہیں، اسی طرح نماز میں اس کی دعائیں بطور تبرک پڑھ لیتے ہیں۔

یہ صورتحال خواہ جہالت کے سبب سے ہو یا غفلت اور غلط فہمی کے سبب سے، نماز کو بالکل بے اثر اور بے مقصد بنا کے رکھ دیتی ہے۔ کم از کم تزکیہ نفس کے نصب العین کو تو اس نماز سے مشکل ہی سے کوئی فائدہ پہنچتا ہے۔ اس خرابی کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ جو لوگ عربی زبان سے ناواقف ہیں، وہ کم از کم ان سورتوں اور دعاؤں کے معنی مطلب تو ضرور سیکھ لیں جو عموماً نمازوں میں پڑھی جاتی ہیں۔ یہ کام تھوڑی سی محنت اور بہت معمولی اہتمام سے ہر شخص کر سکتا ہے۔ جو لوگ اتنا بھی نہیں کر سکتے، نہ وہ نماز کی اہمیت سے واقف ہیں نہ دین کی اہمیت سے۔

رہے وہ لوگ جو عربی زبان سے واقف ہیں یا کم از کم نماز کی دعاؤں کے حد تک واقف ہیں، ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ نماز میں جو کچھ سنیں یا پڑھیں، اس کے لفظ لفظ کے معنی پر دھیان کریں۔ آدمی کا ذہن اگر کسی چیز پر جمنے اور غور کرنے کا عادی نہ ہو تو شروع شروع میں وہ اس میں مشقت اور اجنبیت محسوس کرتا ہے لیکن یہ محض عادت کی خرابی ہے۔ اللہ تعالی نے ہمارے ذہن کو سوچنے اور سمجھنے کے لیے بنایا ہے، ہرزہ گردی کے لیے نہیں بنایا ہے۔ اس وجہ سے اگر وہ اس راہ پر لگایا جائے تو تھوڑی سے محنت سے لگ جاتا ہے اور جب لگ جاتا ہے تو پھر اس سے الگ ہو کر وہ زندگی میں کوئی لذت ہی محسوس نہیں کرتا۔

یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ جب ایک ہی طرح کی دعائیں اور سورتیں ہر نماز میں پڑھی جاتی ہیں اور وہ معلوم ہیں تو پھر ان میں ہر روز اور ہر وقت غور کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ایک مرتبہ جب اس کو سمجھ لیا تو یہ کافی ہے۔ جو لوگ یہ بات کہتے ہیں، وہ نماز کی اور نماز کی دعاؤں کی حقیقت سے ناواقف ہیں۔ نماز معلومات کے اضافہ کے لیے نہیں پڑھی جاتی بلکہ اللہ تعالی کے ساتھ اپنے عہد کی تجدید، اس سے راہنمائی اور استعانت کی طلب اور توبہ واستغفار کے لیے پڑھی جاتی ہے۔ یہ مقصد آخر بے سمجھے بوجھے الفاظ دہرا دینے سے کس طرح حاصل ہو سکتا ہے جب کہ آدمی کا ذہن اور دماغ حاضر نہ ہو۔[1]

ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ اس طریقے سے مرتبہ احسان آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے کسی لمبے چوڑے وظیفے، چلے یا مراقبے کی ضرورت نہیں ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ انسان نماز کا معنی سیکھ لے اور تھوڑی دیر کے لیے اپنے ذہن کو اللہ تعالی کے حضور، حاضر رکھنے کی مشق کر لے۔

نفس کی اقسام اور اس کے درجات

صوفیاء، نفس کی تین اقسام قرار دیتے ہیں۔ سید شبیر احمد کاکاخیل لکھتے ہیں:

انسان کے اندر ایک ہی قوت ہے جس سے کسی چیز کی خواہش ہوتی ہے۔ اس کا نام نفس ہے خواہ وہ خواہش خیر ہو یا شر اور یہ نفس تین طرح پر ہے ۔(1) امّارہ، (2) لوّامہ، (3) مطمئنہ

نفس امّارہ: یہ ہے اکثر شر کی خواہش کرے اور نادم بھی نہ ہو اسی درجے کا نام ہوائے نفس ہے۔

نفس لوّامہ: شر کی طرف خواہش بھی کرے اور نادم بھی ہو۔

نفس مطمئنہ: بیش از بیش خواہش خیر کرے۔ اس کو مطمئنہ کہتے ہیں۔[2]

صوفیاء کا کہنا یہ ہے کہ مجاہدات اور ریاضتوں کی مدد سے نفس امارہ کو لوامہ اور پھر لوامہ کو مطمئنہ کے درجے میں لایا جا سکتا ہے اور یہی تصوف کا مقصد ہے۔ اس کے جواب میں ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ نفس کی یہ تعریف غلط ہے۔ قرآن مجید میں یہ نفس کی یہ تینوں اقسام بیان ہوئی ہیں۔ قرآن کی رو سے نفس امارہ، انسان کے اندر وہ قوت ہے جو اسے برائی پر اکساتی ہے۔ نفس لوامہ وہ قوت ہے جو اسے کوئی برائی کرنے پر ملامت کرتی ہے اور نیکی کرنے پر اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ اسے عام زبان میں "ضمیر (Conscience)" کہا جاتا ہے۔ نفس مطمئنہ اس انسان کو کہا گیا ہے جو قیامت کے دن کامیاب ہو جائے گا اور اسے جنت میں داخلے کی اجازت ملے گی۔

وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلاَّ مَا رَحِمَ رَبِّي إِنَّ رَبِّي غَفُورٌ رَحِيمٌ.

[یوسف نے کہا] میں اپنے نفس کی براءت کو بیان نہیں کر رہا۔ یقیناً نفس امارہ تو برائی ہی کی تلقین کرتا ہے سوائے اس کے کہ میرا رب رحم فرمائے۔ میرا رب بڑا غفور و رحیم ہے۔(یوسف 12:53)

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ (27) ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَرْضِيَّةً (28) فَادْخُلِي فِي عِبَادِي (29) وَادْخُلِي جَنَّتِي (30)

اے مطمئن نفس! اپنے رب کی طرف راضی خوشی لوٹ جاؤ۔ میرے بندوں میں داخل ہو کر میری جنت میں داخل ہو جاؤ۔ (الفجر)

لا أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ (1) وَلا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (2) أَيَحْسَبُ الإِنسَانُ أَلَّنْ نَجْمَعَ عِظَامَهُ (3) بَلَى قَادِرِينَ عَلَى أَنْ نُسَوِّيَ بَنَانَهُ (4)

یوم قیامت کی قسم! ملامت کرنے والے نفس کی قسم! کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کریں گے؟ ہاں ہاں! ہم اس پر قادر ہیں کہ اسے پوری طرح بنا کھڑا کریں۔ (القیامہ)

ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ سورۃ القیامہ کی آیات سے نفس لوامہ کی تعریف واضح ہو جاتی ہے۔ عربی زبان کا یہ عام قاعدہ ہے کہ وہ جس چیز کو ثبوت میں پیش کرنا چاہتے ہیں تو یہ کہنے کی بجائے "میں اس چیز کو بطور ثبوت پیش کرتا ہوں" مختصراً کہہ دیتے ہیں، " اس چیز کی قسم!"۔ قرآن مجید کی قسمیں اسی قاعدے پر مشتمل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے نفس لوامہ کو اس حقیقت کے لیے بطور ثبوت پیش کیا ہے کہ وہ روز قیامت لوگوں کو دوبارہ زندہ کر کے ان کا حساب لے گا۔ آیات کریمہ کا مطلب یہ ہوا کہ: میں نفس لوامہ کو جو تمہیں برائیوں پر ملامت کرتا رہتا ہے، اس بات کے ثبوت میں پیش کرتا ہوں کہ ہم اسے دوبارہ زندگی دے کر کھڑا کریں گے اور اس کا حساب لیں گے۔

ناقدین تصوف مزید کہتے ہیں کہ صوفی حضرات نے انسان کے اس زبردست پوٹینشل کو نظر انداز کر دیا ہے جو نفس لوامہ کی صورت میں اس کے اندر اللہ تعالی نے رکھ دیا ہے۔ اس کی بجائے انہوں نے تزکیہ نفس کے لیے اپنی فکر و فہم کو کچل کر خود کو مرشد کا غلام بنانے کی تلقین کی ہے۔ اگر وہ نفس لوامہ کے اس زبردست پوٹینشل کو نظر انداز نہ کرتے تو انہیں نفسیاتی غلامی کے اس پورے سلسلے کی ضرورت نہ ہوتی، جسے وہ تصوف کی متفق علیہ روایت قرار دیتے ہیں۔

تزکیہ نفس کا بنیادی طریقہ یہ ہے کہ انسان کے اس ضمیر یا نفس لوامہ کو بیدار کر دیا جائے اور اس کے ذہن کی ایسی تربیت کی جائے کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز پر کان دھرنے لگے۔ جب انسان کوئی غلط کام کرتا ہے تو یہ ضمیر کبھی خاموش نہیں بیٹھتا بلکہ اسے مسلسل تنگ کرتا رہتا ہے اور اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ اس گناہ کی تلافی کرے۔ جس شخص کا نفس امارہ اس پر غالب آ جاتا ہے، وہ نشہ میں غرق ہو کر یا کسی اور طریقے سے ضمیر کی اس آواز کو دبا دیتا ہے۔ یہی وہ ضمیر ہے جو اگر جاگ جائے تو بڑے بڑے مجرم اللہ تعالی کے حضور حاضر ہو کر توبہ کر لیتے ہیں۔

لطائف کا تصور

بہت سے اہل تصوف کے ہاں یہ تصور موجود ہے کہ انسانی جسم میں چند مخصوص مقامات ہیں جن کا روحانیت سے تعلق ہے۔ ان میں سے ہر مقام کو وہ "لطیفہ" کہتے ہیں۔ جب ایک سالک ایک خاص انداز میں اللہ تعالی کا ذکر کرتا ہے تو وہ ان مقامات پر خاص اثرات محسوس کرتا ہے۔ لطائف یہ ہیں: دل کا مقام، دائیں پستان کے نیچے دل کے مقابل مقام، دونوں کے درمیان کا مقام، پیشانی کا مقام، دماغ کے بیچ کا مقام اور ناف کے نیچے کا مقام۔ سید شبیر احمد کاکا خیل تصوف سے متعلق عام پوچھے جانے والے سوالات میں ان لطائف کی تفصیل کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> سوال: آپ نے فرمایا تھا کہ ذکر دل سے بھی ہوتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے؟
>
> جواب: جی ہاں یہ ممکن ہے اور انتہائی لذیذ اور مفید ذکر ہے۔
>
> سوال: اس کی کچھ مزید تفصیل بتا سکتے ہیں؟
>
> جواب: جی ہاں، اس کو حاصل کرنے کے طریقے ہیں۔ نقشبندیہ میں یہ ابتدا میں تلقین کیا جاتا ہے جبکہ چشتیہ میں کچھ تیاری کے بعد یہ تلقین کیا جاتا ہے اور بعض کو ذکر لسانی کثرت سے کرنے سے یہ نعمت حاصل ہو جاتی ہے اور یہ زیادہ پائیدار ہوتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ ہر وقت اور ہر جگہ ہو سکتا ہے۔ ذکر قلبی سے آدمی دائم الذکر بن سکتا ہے۔ یہی ذکر قلبی جب مزید راسخ ہو جاتا ہے تو اس کا اثر جسم کے دوسرے حصوں میں سرایت کر جاتا ہے اور مختلف مقامات پر اس کا اثر محسوس ہونے لگتا ہے۔ اس وقت ان کو لطائف کا جاری ہونا کہتے ہیں۔
>
> سوال: کیا یہ لطائف خود بخود جاری ہوتے ہیں یا ان کو کوشش سے بھی جاری کیا جا سکتا ہے۔
>
> جواب: جی ہاں یہ کوشش کی جا سکتی ہے۔ نقشبندیہ حضرات ان کو یکے بعد دیگرے ایک ترتیب سے جاری کرتے ہیں اور چشتی حضرات صرف قلب

کو اصل لطیفہ سمجھتے ہیں اور باقی لطائف کو اس کی فروعات مانتے ہیں جو کہ قلب پر محنت سے خود بخود حاصل ہو جاتے ہیں۔

سوال: اس چیز کا پتہ کیسے چلتا ہے کہ لطائف جاری ہوئے ہیں یا نہیں؟

جواب: ہر ہر لطیفہ کی اپنی جگہ ہے۔ لطیفہ قلب دل کی جگہ، لطیفہ روح دائیں پستان کے نیچے قلب کے محاذ میں ہوتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان لطیفہ سِر ہوتا ہے۔ ہونٹوں اور بعض کی تحقیق کے مطابق پیشانی کے مقام پر لطیفہ خفی ہوتا ہے اور ام الدماغ یعنی سر کے بیچ لطیفہ اخفیٰ ہوتا ہے۔ لطیفہ نفس ناف کے مقام پر ہوتا ہے۔ ان کے مقامات میں بعض کشفی اختلافات بھی ہیں۔ ان مقامات پر سالک کو ذکر محسوس ہوتا ہے جو کہ اللہ، اللہ، اللہ ہو یا لا الہ الا اللہ کا ذکر ہوتا ہے۔ ان مقامات کے اپنے انوارات بھی ہوتے ہیں جو اہل کشف کو نظر آتے ہیں۔ اس لیے بعض حضرات نے ان کے انوارات کے بارے میں بھی تحریر فرمایا ہے لیکن ان انوارات کا سب کو نظر آنا ضروری نہیں۔ کیونکہ یہ کشفی ہیں اور بعض کو کشف سے مناسبت نہیں ہوتی۔ لیکن کشف کوئی مقصود نہیں ہے۔[3]

بہت سے صوفی حضرات "قلب جاری کرنے" کی مشق کرواتے ہیں۔ اس میں وہ کچھ ایسا نفسیاتی عمل کرتے ہیں جس سے لطیفہ قلب جاری ہو جاتا ہے اور دل کا مقام کچھ اس طریقے سے پھڑکنے لگتا ہے کہ دیکھنے والے کو محسوس ہوتا ہے۔

ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ ان لطائف کا دین اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ تصور اہل تصوف کے ہاں جوگیوں وغیرہ سے آیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی اس کی تلقین نہیں فرمائی۔ اگر ان کی کوئی دینی اہمیت ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی تلقین اپنے صحابہ کو کرتے۔ حدیث کے پورے ذخیرے میں ایک بھی ایسی روایت موجود نہیں ہے جس میں آپ نے انہیں ایسا کرنے کا حکم دیا ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک بدعت ہے جو صوفیاء نے دین میں داخل کی ہے۔

ناقدین تصوف مزید یہ کہتے ہیں کہ احادیث میں بیان ہونے والے اذکار کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہایت ہی سادہ اذکار ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زیادہ سے زیادہ سو مرتبہ ذکر کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس میں بھی قلب جاری کرنے کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ اگر اس قلب کے جاری ہونے میں کوئی خیر ہوتی تو ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا قلب جاری فرماتے اور یہی سلسلہ صحابہ جاری فرماتے۔ احادیث کے پورے ذخیرے میں ایسی کوئی روایت نہیں ملتی جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے ذکر کے لیے قلب جاری فرمایا ہو۔ اس کے برعکس ان کے ہاں ذکر کا تصور یہ ملتا ہے کہ اللہ تعالی کا ذکر کرنے کے ساتھ اس میں غور و فکر بھی کیا جائے تاکہ انسان عقلی اعتبار سے اللہ تعالی کی طرف مائل ہو۔ قرآن مجید نے اسی کی تلقین کی ہے:

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالأَرْضِ وَاخْتِلافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لآيَاتٍ لأُولِي الأَلْبَابِ (190) الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَاماً وَقُعُوداً وَعَلَى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلاً سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (191)

یقیناً آسمان و زمین کی تخلیق اور رات و دن کی تبدیلیوں میں اہل عقل کے لیے نشانیاں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کا ذکر کھڑے، بیٹھے اور لیٹے کرتے

ہیں اور آسمان و زمین کی تخلیق میں غور و فکر کرتے ہوئے کہتے ہیں: "ہمارے رب! تو نے اسے بے کار نہیں بنایا۔ تو پاک ہے، ہمیں آگ کے عذاب سے بچالے۔" (آل عمران)

قرآن مجید کی اس واضح تعلیم کے برعکس صوفیاء کے ہاں بغیر سوچے سمجھے ذکر کا رواج ہے اور غور و فکر اور تدبر کی دعوت کا کہیں سراغ نہیں ملتا ہے۔ نہ تو وہ ذکر کے اندر غور و فکر کرتے ہیں اور نہ ہی قرآن مجید میں۔ ابن تیمیہ (661-728/1263-1327) لکھتے ہیں:

اہل عبادت و تصوف، ذکر پر سختی سے عمل کا حکم دیتے ہیں اور اسے حق کی طرف پہنچنے کا ذریعہ بتاتے ہیں۔ یہ اس وقت اچھا ہے جب وہ اس کے ساتھ قرآن و سنت میں تدبر کو ملا لیتے اور اس کی پیروی بھی کرتے۔[4]

مولانا امین احسن اصلاحی (1904-1997) لکھتے ہیں:

محض تبرک کے طور پر الفاظ کی تلاوت کر لینا اور قرآن کے معانی کی طرف دھیان نہ کرنا صحابہ کا طریقہ نہیں ہے۔ یہ طریقہ تو اس وقت سے رائج ہوا ہے جب لوگوں نے قرآن مجید کو ایک صحیفہ ہدایت و معرفت اور ایک خزانہ علم و حکم سمجھنے کے بجائے محض حصول برکت کی ایک کتاب سمجھنا شروع کر دیا۔ جب زندگی کے مسائل سے قرآن کا تعلق صرف اس قدر رہ گیا کہ دم نزع اس کے ذریعے سے جانکنی کی سختیوں کو آسان کیا جائے اور مرنے کے بعد اس کے ذریعہ سے میت کو ایصال ثواب کیا جائے۔ جب زندگی کے نشیب و فراز میں راہنما ہونے کے بجائے اس کا مصرف صرف یہ رہ گیا کہ ہم جس ضلالت کا بھی ارتکاب کریں، اس کے ذریعے سے اس کا افتتاح کریں تاکہ یہ برکت دے کر اس ضلالت کو ہدایت بنا دیا کرے۔ جب لوگوں نے اس کو تعویذ کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا تاکہ جب وہ اپنے شیطانی مقاصد کی تکمیل کے لیے نکلیں تو قرآن ان کی حفاظت کرے کہ اس راہ سے کہیں ان کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔

دنیا کی شاید ہی کوئی کتاب ہو جس نے قرآن سے زیادہ اس بات پر زور دیا ہو کہ اس کا حقیقی فائدہ صرف اس شکل میں حاصل کی اجا سکتا ہے کہ اس کو پورے غور و تدبر کے ساتھ پڑھا جائے۔ لیکن یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ دنیا میں یہی کتاب ہے جو ہمیشہ آنکھ بند کر کے پڑھی جاتی ہے۔ معمولی سے معمولی چیز بھی آدمی پڑھتا ہے تو اس کے لیے سب سے پہلے وہ اپنے دماغ کو حاضر کرنے کی کوشش کرتا ہے، تاکہ اس کو سمجھ سکے۔ لیکن قرآن کے ساتھ لوگوں کا یہ عجیب معاملہ ہے کہ جب اس کو پڑھنے کا ارادہ کرتے ہیں تو سب سے پہلے اپنے دماغ پر پٹی باندھ لیتے ہیں کہ مبادا کہیں اس کے کسی لفظ کا مفہوم دماغ کو چھو جائے۔[5]

تزکیہ نفس کے علم کا مخفی ہونا

اہل تصوف کا نقطہ نظر یہ ہے کہ تزکیہ نفس کے لیے انسان کا کسی ایسے سلسلے میں بیعت ہونا ضروری ہے جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں "شجرہ طریقت" کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کے ہاں تصور یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کی تربیت فرمائی اور ان کے سینوں میں کچھ راز منتقل فرمائے، پھر صحابہ نے تابعین کی تربیت کی اور یہی راز ان کی طرف منتقل کیے۔ انہوں نے یہی معاملہ تبع تابعین کے ساتھ کیا۔ یہ سلسلہ سینہ بہ سینہ اب تک چلا آ رہا ہے۔ تمام صوفی سلسلے حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچتے ہیں جبکہ نقشبندی سلسلہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے منسوب ہے۔ حضرت عمر، عثمان اور دیگر

صحابہ رضی اللہ عنہم تک کوئی سلسلہ نہیں پہنچتا ہے۔

ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ تزکیہ نفس کا علم ہر انسان کی ضرورت ہے اور اسی تزکیہ کو قرآن مجید نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد قرار دیا ہے۔ ایسا ممکن ہی نہیں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چپکے چپکے بعض صحابہ کو یہ تلقین کر دیا ہو اور انہوں نے بھی آگے اسے سینہ بہ سینہ منتقل کیا ہو۔ مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

> تزکیہ کا علم کوئی راز نہیں ہو سکتا جو صرف خاص خاص اشخاص ہی کو معلوم ہو اور انہی سے سینہ بہ سینہ وہ دوسروں کو منتقل ہو۔ تزکیہ ایک عام ضرورت کی چیز ہے، ہر شخص آخرت کی نجات و فلاح کے لیے اس کا محتاج ہے۔ انبیاء آتے ہی اس لیے کہ وہ افراد کا بھی تزکیہ کریں اور معاشرہ کا بھی تزکیہ کریں۔ پھر جو چیز اس قدر عمومی ضرورت کی ہو، اس کو صرف چند خاص خاص افراد کے سینہ کا راز بنا کے کس طرح چھوڑا جا سکتا ہے؟
>
> یہ الگ بات ہے کہ ہر شخص، ہر علم کا اہل نہیں ہوا کرتا، اس وجہ سے اگر ایک شخص اس علم کا ذوق رکھنے والا نہ ہو گا تو وہ اس سے محروم رہے گا۔ علی ہذا القیاس۔ اہل علم میں فرق مراتب بھی ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے سارے جاننے والے ایک درجہ کے نہیں ہو سکتے، لیکن یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ یہ کوئی "پراسرار" علم ہے جس کے جاننے والے صحابہ کے زمانہ میں بھی چند ہی افراد تھے اور بعد میں بھی خال خال افراد ہی ہوئے [جبکہ سلسلہ ہائے طریقت صرف دو ہی صحابہ سے چلے۔]
>
> جو چیز ہوا اور پانی کی طرح ہر شخص کے لیے ضروری ہے، یہ کس طرح ممکن ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کو بس ایک دو آدمیوں کے کانوں میں پھونک کر چلے جائیں، دوسروں کو اس کی خبر ہی نہ ہونے پائے اور یہ دو ایک آدمی بھی اس کو عام کرنے کی بجائے، اس کو راز بنا کر رکھ چھوڑیں اور صرف انہی اشخاص پر اس راز کو کھولیں جو ان کے محرم راز بن جائیں۔ علم کیمیا [سونا بنانے کا فن] کی تعلیم میں تو یہ راز داری چل سکتی ہے لیکن تزکیہ اگر عام ضرورت کی چیز ہے [اور اس کی عام ضرورت کی چیز ہونے سے انکار کرنا ممکن نہیں ہے] تو اس میں اس راز داری کا چلنا نہ ممکن ہے اور نہ قرین مصلحت۔
>
> ہمارے حنفی علماء عام ضرورت کی چیزوں میں عموماً خبر احاد [ایک آدمی کی بیان کردہ روایت] کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس چیز کا تعلق عام ضرورت سے ہے، اس کے بارے میں ایک دو طریقوں [ذرائع] سے روایت کے کیا معنی؟ لیکن یہی حضرات جب تصوف کے کوچے میں آتے ہیں تو تزکیہ کے علم کو ایک راز ثابت کرنے میں بڑا فخر محسوس کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان باتوں کو اہل ظاہر کیا جانیں، یہ "اسرار و مواجید" ہیں۔ وہ اس فخر کے نشہ میں اس بات کو بالکل بھول جاتے ہیں کہ اگر تصوف کا منشا تزکیہ نفس ہے تو تزکیہ نفس تو ایک عام ضرورت کی چیز ہے، پھر ایک عام ضرورت کا تقاضا ایک ایسے علم سے کیسے پورا ہو سکتا ہے جو صرف چند سینوں کا ایک راز ہو؟[6]

ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ تزکیہ نفس ہر شخص کی ضرورت ہے، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی شکل میں تزکیہ نفس کا پورا نصاب نازل کر دیا ہے۔ قرآن مجید نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کا مقصد تزکیہ نفس کو قرار دیا ہے اور اس کا طریقہ کار یہ بیان کیا ہے:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولاً مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمْ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ.

[ابراہیم و اسماعیل نے دعا کی] اے ہمارے رب! ان [ہماری اولاد] میں ایک رسول بھیج جو ان پر تیری آیات تلاوت کرے، انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور [اس طریقے سے] ان کا تزکیہ کرے۔ یقیناً تو ہی زبردست اور صاحب حکمت ہے۔ (البقرۃ 2:129)

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولاً مِنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمْ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلالٍ مُبِينٍ.

یقیناً اللہ کا اہل ایمان پر احسان ہوا جب اس نے ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا۔ وہ ان پر اللہ کی آیتیں تلاوت کرتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے اور [اس کے لیے] انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اس سے پہلے تو وہ کھلی گمراہی میں تھے۔ (آل عمران 3:164)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری زندگی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تزکیہ فرمایا۔ اس لیے آپ کی احادیث اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات پڑھنے سے تزکیہ نفس ہو سکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمان تزکیہ نفس کے لیے قرآن و حدیث کو پڑھیں۔ افسوس کہ اہل تصوف کے بہت سے حلقوں میں قرآن مجید کی بے سوچے سمجھے تلاوت پر تو بہت زور دیا جاتا ہے مگر ترجمہ پڑھنے سے سختی سے منع کیا جاتا ہے۔ اسی طرح انہیں ضعیف اور جعلی احادیث تو بہت سنائی جاتی ہیں مگر حدیث کے مستند مجموعوں کو دیکھنے سے بھی منع کیا جاتا ہے۔

موضوع اور ضعیف احادیث کا استعمال

ناقدین تصوف کا صوفیاء پر ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ ان کے ہاں بڑے پیمانے پر موضوع اور ضعیف احادیث کی نشر و اشاعت کی جاتی ہے۔ موضوع کا مطلب ہوتا ہے، "وضع شدہ" یعنی جعلی احادیث۔ جبکہ ضعیف احادیث وہ ہوتی ہیں جن کے بارے میں یہ شک ہو کہ ان کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف درست ہے یا نہیں۔ اہل تصوف کے ہاں تو ایسی ایسی احادیث عام بیان کی جاتی ہیں جن کا کوئی سراغ کتب حدیث میں نہیں ملتا ہے۔ تصوف کی کوئی عام چھوٹی موٹی کتاب نہیں بلکہ امہات کتب اٹھا کر دیکھ لیجیے تو ان میں موضوع اور ضعیف احادیث کی بھرمار ملے گی۔ امام غزالی کی احیاء العلوم الدین پر سب سے بڑی تنقید بھی یہی ہے کہ یہ کتاب موضوع اور ضعیف احادیث سے بھری پڑی ہے۔

ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جھوٹ یا مشکوک بات کو منسوب کرنے کا معاملہ اتنا سنگین ہے کہ اس پر جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔ ناقدین تصوف اس ضمن میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں:

وحدثنا أبو بكر بن أبي شيبة. حدثنا غندر، عن شعبة. ح وحدثنا محمد بن المثنى وابن بشار. قالا: حدثنا محمد بن جعفر. حدثنا شعبة، عن منصور، عن ربعي بن حراش؛ أنه سمع عليا رضي الله عنه يخطب. قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "لا تكذبوا علي فإنه من يكذب علي يلج النار".

سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مجھ سے جھوٹ منسوب نہ کرو۔ یقیناً جو شخص میری

جانب جھوٹ منسوب کرے گا، وہ جہنم میں داخل ہو گا۔" (مسلم، حدیث 1)

وحدثني زهير بن حرب. حدثنا إسماعيل، يعني ابن علية، عن عبدالعزيز بن صهيب، عن أنس بن مالك؛ أنه قال: إنه ليمنعني أن أحدثكم حديثا كثيرا – أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: "من تعمد علي كذبا فليتبوأ مقعده من النار".

سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھے آپ لوگوں سے کثرت سے حدیث بیان کرنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان روکتا ہے: "جس نے جان بوجھ کر مجھ سے جھوٹ منسوب کیا تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔" (مسلم، حدیث 2)

اہل تصوف کے اس معاملے میں تین موقف ہیں۔

- وہ صوفیاء جو دینی علوم سے واقف ہیں اور شریعت کو مانتے ہیں، اس معاملے میں ناقدین تصوف سے متفق ہیں کہ موضوع اور ضعیف احادیث کو بیان نہیں کرنا چاہیے۔ اگر انہیں بیان کرنے کی ضرورت بھی ہو تو یہ بتا دینا لازم ہے کہ حدیث جعلی یا ضعیف ہے۔
- وہ صوفیاء جو شریعت اور شرعی علوم کو کوئی حیثیت نہیں دیتے، یہ کہتے ہیں کہ یہ احادیث ان کے کشف کی بنیاد پر درست ہیں۔ بعض صوفیاء تو یہ دعوی کرتے ہیں کہ انہوں نے ان احادیث کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پیش کیا اور آپ سے ان کی تصدیق کروالی۔
- صوفیاء میں سے بعض یہ کہتے ہیں کہ فضائل اعمال میں ضعیف احادیث روایت کرنا جائز ہے اور محدثین کا ایک گروہ بھی اسے درست سمجھتا ہے۔

پہلے نقطہ نظر کے صوفیاء، اس معاملے میں ناقدین تصوف سے متفق ہیں تاہم وہ اتنی جرأت محسوس نہیں کرتے کہ اپنے اکابرین کی غلطی تسلیم کر لیں۔ دوسرے نقطہ نظر کے بارے میں ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ اگر کشف کی بنیاد پر احادیث روایت کی جانے لگیں تو پھر دین کی ساری عمارت ڈھے جائے گی۔ کوئی بھی شخص کشف کی بنیاد پر کوئی بھی دعوی کرے گا اور اس کی تائید میں کشفی احادیث پیش کرے گا۔ پھر نہ ختم نبوت کی کوئی حیثیت رہ جائے گی اور نہ ہی قرآن و حدیث کے مجموعوں کی۔ اکثر جھوٹے نبیوں نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ مرزا غلام احمد قادیانی صاحب نے بھی اپنی نبوت کی بنیاد کشف ہی پر رکھی ہے۔

تیسرے نقطہ نظر کے بارے میں ناقدین تصوف کچھ تفصیل بیان کرتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ صوفیاء نہ صرف ضعیف بلکہ جھوٹی اور جعلی احادیث بھی بکثرت روایت کرتے ہیں اور انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس بات پر تمام علماء اور محدثین کا اتفاق رائے ہے کہ موضوع حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی حیثیت سے پیش کرنا ایک گناہ عظیم ہے۔ اس گناہ کا ارتکاب کرنے والا کس طریقے سے تزکیہ نفس جیسا عمل سر انجام دے سکتا ہے۔

یہ درست ہے کہ اس معاملے میں محدثین کے ہاں اختلاف رائے پایا جاتا ہے کہ فضائل اعمال میں ضعیف احادیث بیان کی جائیں یا نہیں۔

جو محدثین فضائل اعمال میں ضعیف احادیث کی روایت کی اجازت دیتے ہیں وہ اس کے ساتھ اس کی شرائط بھی بیان کرتے ہیں جو کہ یہ ہیں:

- حدیث کے ضعف (کمزوری) کو بیان کر دیا جائے تاکہ سننے یا پڑھنے والا کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔
- ضعیف حدیث کی بنیاد پر کسی نئے عمل کی بنیاد نہ پڑتی ہو۔ حدیث کسی ایسے عمل کے بارے میں ہو، جو قرآن مجید یا صحیح احادیث سے ثابت ہو۔ جیسے اللہ تعالی کی رضا کے لیے غریبوں کی مدد کرنا ایک اچھا عمل ہے جو کہ خود قرآن مجید سے ثابت ہے۔ اب اگر کسی ضعیف حدیث میں اسی کی ترغیب ہو، تو اسے بیان کیا جا سکتا ہے۔

ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ صوفیاء ان شرائط کو پورا کیے بغیر کثرت سے ضعیف اور جھوٹی احادیث روایت کرتے ہیں، ان کی حیثیت کے بارے میں کچھ نہیں بتاتے ہیں اور ان احادیث کی بنیاد پر نت نئے وظیفے اور اشغال ایجاد کرتے رہتے ہیں۔ اس کی چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

صلوۃ معکوس

صلوۃ معکوس کا مطلب ہے الٹے لٹک کر نماز پڑھنا۔ فوائد الفوائد میں درج ہے۔

> میں نے ہر نماز جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا فرمائی تھی، پڑھی۔ ایک وقت مجھے معلوم ہوا کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز معکوس بھی پڑھی ہے۔ میں نے رسی اپنے پاؤں میں باندھی اور کنویں میں [الٹے] لٹک کر نماز معکوس ادا کی۔[7]

ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ نماز معکوس کا یہ تصور کسی ضعیف سے ضعیف حدیث میں بھی بیان نہیں ہوا ہے۔

شیطان بطور مرشد

صوفیاء کے ہاں یہ روایت عام بیان کی جاتی ہے کہ جس کا کوئی پیر نہیں، اس کا مرشد شیطان ہے۔ ریاض احمد گوہر شاہی صاحب بیان کرتے ہیں:

> حدیث مبارکہ میں بھی اس طرح ہے: من لا شیخ لہ' فشیخہ الشیطان۔ ترجمہ: جس کا مرشد نہیں اس کا مرشد شیطان ہے۔ (منارہ نور بحوالہ علوم العارفین)

ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ اس موضوع کی کوئی حدیث، کتب حدیث میں نہیں پائی جاتی ہے۔

امام مسلم کا بیان

مشہور محدث اور صحیح مسلم کے مصنف، امام مسلم بن حجاج (204-261/819-875) نے اپنے زمانے کے صوفیاء اور عبادت گزار لوگوں

سے متعلق، صحیح مسلم کے مقدمہ میں مشہور محدثین کا یہ تبصرہ نقل کیا ہے:

وحدثني محمد بن أبي عتاب. قال: حدثني عفان، عن محمد بن يحيى بن سعيد القطان، عن أبيه، قال: لم نر الصالحين في شئ أكذب منهم في الحديث. قال ابن أبي عتاب: فلقيت أنا محمد بن يحيى بن سعيد القطان، فسألته عنه. فقال عن أبيه: لم تر أهل الخير في شئ، أكذب منهم في الحديث. قال مسلم: يقول: يجري الكذب على لسانهم ولا يتعمدون الكذب.

یحیی بن سعید القطان کہتے ہیں: "ہم نے ان صالحین سے زیادہ کسی کو حدیث کے معاملہ میں جھوٹ بولنے والا نہیں دیکھا۔" ابن ابی عتاب کہتے ہیں کہ پھر مجھ سے محمد بن یحیی بن سعید القطان کی ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے یہی بات پوچھی۔ وہ کہنے لگے: "ہاں، میرے والد فرماتے تھے کہ تم ان اہل خیر سے زیادہ کسی کو بھی حدیث کے معاملے میں جھوٹ بولنے والا نہ پاؤ گے۔" امام مسلم خود کہتے ہیں: "جھوٹ ان کی زبانوں سے بے ساختہ جاری ہو جاتا ہے، چاہے جھوٹ بولنے کا ارادہ نہ بھی رکھتے ہوں۔" (مقدمہ صحیح مسلم)

بعض اہل تصوف یہ کہتے ہیں کہ امام صاحب نے صالحین اور اہل خیر کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اس میں صوفیاء کا ذکر کہاں ہے۔ اس کے جواب میں ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ اس زمانے میں صوفیاء صالحین، زہاد اور اہل خیر کے نام سے مشہور تھے۔ صوفی کا لفظ تو بہت بعد میں عام ہوا ہے۔ پھر صوفیاء کے علاوہ کوئی ایسا گروہ نہیں ہے جو بکثرت عبادت کرتا ہو اور ساتھ ہی جھوٹی احادیث بھی روایت کرتا ہو۔

مطالعہ حدیث اور جرح و تعدیل کے فن کی مذمت

بعض صوفیاء کے اپنے اقوال سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ حدیث پڑھنے اور اس کو پرکھنے کے فن کو پسند نہ کیا کرتے تھے۔ امام ابن قیم نے اپنی کتاب "مدارج السالکین" میں صوفیاء کے ایسے اقوال کیے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ احادیث پڑھنے اور ان کی چھان بین کے فن کو پسند نہ کرتے تھے۔

إذا رأيت الصوفي يشتغل بحدثنا فاغسل يدك منه.

جب تم کسی صوفی کو دیکھو کہ وہ "ہم سے حدیث بیان کی" کے چکر میں پڑ گیا ہے تو بس اس سے ہاتھ دھو لو۔[8]

صوفیاء کا کہنا یہ ہے کہ جرح و تعدیل میں راویوں کی خامیاں بیان کی جاتی ہیں، جو کہ غیبت کے زمرے میں آتی ہیں۔ اس کے جواب میں محدثین کہتے ہیں کہ وہ کسی ذاتی عناد کے باعث راویوں کی خامیاں بیان نہیں کرتے ہیں بلکہ اس وجہ سے ایسا کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب جھوٹ منسوب نہ ہو جائے۔ یہ محدثین کسی بھی حدیث کو قبول کرنے سے پہلے ایک کڑا معیار مقرر کر کے اس کا جائزہ لیتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح اور مستند ہے بھی یا نہیں۔ ان کی دلیل وہی حدیث ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جھوٹ منسوب کرنے والے کو سخت وعید سنائی گئی ہے۔ اس کے علاوہ یہ حدیث بھی ہے:

وحدثنا عبيدالله بن معاذ العنبري. حدثنا أبي. ح وحدثنا محمد بن المثنى. حدثنا عبدالرحمن بن مهدي. قالا: حدثنا شعبة، عن خبيب بن عبدالرحمن، عن حفص بن عاصم، عن أبي هريرة؛ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "كفى

بالمرء كذبا أن يحدث بكل ما سمع".

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "آدمی کے لیے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ جو سنے، اسے [بغیر تحقیق] آگے بیان کر دے۔" (مسلم، حدیث 5)

اسائن منٹس

- ناقدین تصوف کا کہنا ہے کہ صوفیاء کے ہاں موضوع احادیث بکثرت بیان کی جاتی ہیں جبکہ قرآن مجید اور صحیح احادیث سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ دو تین صوفی بزرگوں کے بیانات سن کر یا ان کی کتب پڑھ کر اس الزام کی تصدیق یا تردید کیجیے۔
- اس بات پر صوفیاء اور ان کے ناقدین متفق ہیں کہ تزکیہ نفس ہر انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ دونوں کے ہاں تزکیہ نفس کے تصور اور طریق کار میں کیا فرق ہے؟
- اہل تصوف کے علم نفسیات پر ناقدین کی تنقید کیا ہے؟

تعمیر شخصیت مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے لوگ محفوظ رہیں۔

[1] امین احسن اصلاحی۔ تزکیہ نفس۔ جلد 1۔ ص 245-244۔

[2] سید شبیر احمد کاکاخیل۔ تصوف سے متعلق پوچھے جانے والے عام سوالات۔ www.tazkiya.org (ac. 22 Apr 2011)

[3] حوالہ بالا۔

[4] ابن تیمیہ۔ مجموعۃ الفتاوی۔ جلد 5۔

[5] اصلاحی۔ تزکیہ نفس۔ جلد 1۔ ص 92-91۔

[6] حوالہ بالا۔ ص 21۔

[7] امیر علاء سنجری۔ فوائد الفوائد۔ حصہ اول۔ پانچویں مجلس۔

[8] ابن قیم۔ مدارج السالکین۔

باب 15: مخالف شریعت صوفیاء

جیسا کہ ہم شروع میں بیان کر چکے ہیں کہ صوفیاء کا ایک گروہ تو شریعت کا مانتا ہے اور اس کا پابند ہے جبکہ ان کا دوسرا گروہ شریعت کی پابندی نہیں کرتا ہے۔ پابند شریعت صوفیاء بھی مخالف شریعت صوفیاء پر کڑی تنقید کرتے ہیں۔ اس باب میں ہم مخالف شریعت صوفیاء پر ناقدین تصوف کی تنقید کا مطالعہ کریں گے۔

مخالف شریعت صوفیاء کے واقعات

مخالف شریعت صوفیاء کے ہاں ظاہر اور باطن پر بڑا زور دیا جاتا ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ شرعی احکام عام لوگوں کے لیے ہیں۔ وہ یہ مثال پیش کرتے ہیں کہ جیسے طلباء پر اساتذہ مخصوص نوعیت کی پابندیاں عائد کرتے ہیں، انہیں وقت پر اسکول بلاتے ہیں، ہوم ورک دیتے ہیں، ٹائم ٹیبل کی پابندی کرواتے ہیں، مخصوص اوقات پر مخصوص اسباق پڑھاتے ہیں۔ جب طالب علم ایک خاص سطح پر پہنچ جاتا ہے تو اس پر سے یہ پابندیاں ہٹالی جاتی ہیں۔ بالکل اسی طرح شریعت عام لوگوں کے لیے ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کی تربیت نفس ہو جائے۔ جب انسان تصوف اور سلوک کی منازل طے کر چکتا ہے تو اس سے شریعت کی پابندیاں ہٹالی جاتی ہیں۔ اس ضمن میں ہم اہل تصوف کی کتب ہی سے چند اقتباسات پیش کر رہے ہیں جن سے اس نقطہ نظر کی تفصیلات معلوم ہو سکتی ہیں۔ صوفی بزرگ خواجہ عبدالحکیم انصاری (1893-1977) لکھتے ہیں:

> دوران سلوک میں ہر قسم کے صوفیوں اور فقیروں کی صحبت میں بیٹھا کرتا تھا۔ مجھے بڑی عجیب معلومات حاصل ہوئیں۔ میں نے ہر طرح اور ہر رنگ کے فقیر دیکھے۔ مثلاً قلندر، ملنگ، رندولی، رقص و سرود کے رسیا، مے ناب کے متوالے اور خصوصاً رسول شاہی، جو نماز روزے سے منع کرتے، شراب اور چرس وغیرہ کو جائز بلکہ ضروری سمجھتے ہیں اور خلاف شرع اعمال کرتے ہیں۔ کشف و کرامات ان سے بھی سرزد ہوتی ہیں۔ مزید تحقیق پر پتہ چلا کہ یہ سب وحدت الوجود کو ماننے والے ہیں، جن کو اسلامی تصوف اور فقر محمدی سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ہندوؤں کے یوگ اور دوسری مشقوں کے ذریعے روحانی طاقت پیدا کر لیتے ہیں۔[1]

لاہور کے مشہور صوفی، شیخ حسین لاہوری جو کہ مادھولال حسین کے نام سے معروف ہیں اور ان کے مزار پر میلہ چراغاں لگتا ہے، کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ایک ہندو لڑکے مادھو لال کے عشق میں مبتلا ہوئے اور اس پر ایسی نظر ڈالی کہ وہ بھی ہر وقت ان کے ساتھ رہنے لگا۔ میلہ چراغاں کے موقع پر اب بھی لڑکے زنانہ سرخ لباس پہن کر رقص کرتے ہیں۔

> [شیخ حسین لاہوری المعروف مادھولال حسین(d. 1052/1642)] بہلول دریائی(d. 983/1575) کے خلیفہ تھے۔ 36 سال ویرانے میں ریاضت و مجاہدہ کیا۔ رات کو داتا گنج بخش کے مزار پر اعتکاف میں بیٹھتے، آپ نے طریقہ ملامتیہ اختیار کر لیا۔ داراشکوہ نے انہیں ملامتیوں کے گروہ کا سردار لکھا ہے۔ چار ابرو کا صفایا، ہاتھ میں شراب کا پیالہ، سرود و نغمہ، چنگ و رباب، تمام قیود شرعی سے آزاد، جس طرف چاہتے، نکل جاتے۔۔۔۔

نقل ہے کہ حسین کے دشمنوں نے اکبر بادشاہ سے شکایت کی کہ لاہور میں ایک شیخ حسین نامی ہے، داڑھی مونچھیں منڈواتا ہے، سرخ لباس پہنتا ہے اور کھلے بندوں خلاف شریعت امور کا مرتکب ہوتا ہے۔ ایک حسین لڑکے مادھو کو اپنے پاس رکھتا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ڈھول کی آواز پر رقص کرتا ہے۔ اس کے باوجود باطنی ولایت کا دعویدار بھی ہے۔ بادشاہ نے اسے بلایا تو حسین اسی طرح مست و مخمور جام و صراحی لیے دربار میں حاضر ہوئے۔ اکبر نے کہا: "تو سلسلہ قادریہ کا پیرو ہو کر یہ مے نوشی اور امرد پرستی [ہم جنس پرستی] کیوں کرتا ہے؟" اس کے جواب میں حسین نے اپنی صراحی سے ایک پیالہ اکبر کے سامنے پیش کیا۔ اکبر نے دیکھا تو وہ سرد پانی تھا۔ دوسرا پیالہ پیش کیا تو وہ شربت سے پر تھا، اسی طرح تیسرا پیالہ دودھ سے۔۔۔۔

جب تک کوئی شخص داڑھی مونچھ کا صفایانہ کرا دیتا، اس وقت تک مرید نہ سمجھا جاتا۔ وہ اپنے ہاتھ سے مرید کو شراب کا پیالہ دیتے، اگر وہ پی لیتا تو مریدوں میں سمجھا جاتا ورنہ مجلس سے باہر نکال دیا جاتا۔ ان ظاہری بدعتوں اور خلاف شریعت باتوں کے باوجود ولی سمجھے جاتے تھے۔۔۔ دارا شکوہ نے "حسنات العارفین" میں ان کی بڑی تعریف کی اور ایک دو کرامتوں کا ذکر بھی کیا ہے۔[2]

کچھ ایسے ہی واقعات سندھ کے مشہور صوفی لال شہباز قلندر (d. 672/1274) سے منسوب ہیں۔ سیہون میں ان کے مزار پر بھی عرس کے موقع پر درویش سرخ لباس پہن کر رقص کرتے ہیں۔ ان کا موقف یہ ہوتا ہے کہ ہم معاذ اللہ خدا کی بیوی ہیں۔ تصوف کی کتب میں بعض عجیب و غریب واقعات بھی ملتے ہیں۔ تذکرہ غوثیہ میں ایک واقعہ ہے:

فقیر صاحب نے فرمایا کہ بعد نماز عشاء ہماری روٹی مسجد میں لے آنا، جب ہم روٹی لے کر مسجد میں پہنچے تو دیکھا کہ میاں صاحب ایک گدھی سے [جنسی عمل میں] مصروف ہیں۔ میں نے منہ پھیر لیا، پھر جو دیکھا تو نماز پڑھتے ہیں۔ بعد فراغت کھانا کھایا، باتیں کرنے لگے۔[3]

ایسے ہی ایک واقعہ کا مشہور صوفی عبد الوہاب الشعرانی نے اپنی کتاب "طبقات الکبری" میں ذکر کیا ہے:

[شیخ علی وحیش] جب کسی شخص کو شہر یا اس سے باہر دیکھتے کہ وہ گدھی پر سوار ہے تو اس سے کہتے: ٹھہرو اور اس کا سر پکڑ لو حتی کہ میں اس سے جنسی عمل کر لوں۔ اگر وہ شخص انکار کرتا تو زمین میں گڑ جاتا اور اس کے لیے قدم اٹھانا دشوار ہو جاتا۔ اگر وہ مان جاتا تو شرمندگی محسوس کرتا۔[4]

سندھ کے مشہور صوفی اور انجمن سرفروشان اسلام کے بانی ریاض احمد گوہر شاہی (1941-2002) اپنے روحانی سفر کے تجربات کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

جب میں مغرب کی نماز اور فاتحہ سے فارغ ہوا تو وہی مستانی [ایک مزار کی مجاورن] میرے پاس آئی اور بڑے اخلاق اور پیار سے کہا: بھائی اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتاؤ ہم حاضر ہیں۔ اور مجھے اپنی جھونپڑی میں لے گئی اور اُبلے ہوئے نمکین چاول کھانے کو دیے اور پھر ایک بھنگ کا گلاس پیش کیا، جسے میں نے قبول نہ کیا۔ کہنے لگی: تو زیارتی ہے یا فقر کے لئے آیا ہے؟ میں نے کہا: فقر کے لئے آیا ہوں۔ کہنے لگی: فقیر لوگ بھنگ چرس پیتے ہیں۔ میں نے کہا: یہ نشہ ہے جو شریعت میں حرام ہے۔ کہنے لگی: کیا تو نے حضرت خضرؑ اور موسیٰؑ کا واقعہ نہیں سنا؟ موسیٰؑ شریعت کے عالم تھے اور خضرؑ طریقت کے فقیر تھے۔ جو موسیٰؑ کے نزدیک گناہ تھا وہ خضرؑ کے نزدیک کارِ ثواب تھا۔ سن ہم فقیر اسے کیوں پیتے ہیں جب دنیا کا خیال اور عزیزوں کی یاد ستاتی ہے تو ہم بھنگ یا چرس پی لیتے ہیں، ان کے پینے سے سب خیالات کافور ہو جاتے ہیں اور بس اللہ ہی یاد رہتا ہے دوسری بات لوگ ہمیں فقیر سمجھ کر ہمارے پیچھے لگ جاتے ہیں اور ہمارے اس فعل سے وہ متنفر ہو جاتے ہیں اور ہمیں بھی ملامت ملتی ہے جو ہمارے لئے

سلامتی ہے۔[5]

سیہون شریف سے سیدھا مستانی کی جھونپڑی میں پہنچا اور لیٹ گیا۔ اتنے میں مستانی باادب کھڑی ہو گئی اور مجھے بھی کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔ میں بھی مستانی کی طرح باادب کھڑا ہو گیا مستانی نے کہا کہ قلندر پاکؒ اور بھٹ شاہؒ والے آئے ہیں اور کہتے ہیں کہ ریاض کو گھر کی یاد ستا رہی ہے۔ کافی کوشش کرتا ہے کہ بھول جاؤں مگر بھول نہیں پاتا۔ اس کو ایک گلاس بھنگ کا پلا دو تا کہ ذہن سے سب خیال نکل جائیں۔ اس کے بعد مستانی نے جھک کر سلام کیا اور بیٹھ کر بھنگ کوٹنے لگی۔ اس کا خیال تھا یہ اب ضرور بھنگ پیے گا لیکن وہ بھنگ کوٹتی رہی اور میں چلہ گاہ کی طرف چل دیا۔

آج چلہ گاہ میں جب ذکر سے فارغ ہوا تو اونگھ آگئی۔ کیا دیکھتا ہوں ایک بزرگ سفید ریش چھوٹا قد میرے سامنے موجود ہے اور بڑے غصے سے کہہ رہا ہے کہ تو نے بھنگ کیوں نہیں پی۔ میں نے کہا شریعت میں حرام ہے۔ اس نے کہا شرع اور عشق میں فرق ہے۔ کوئی بھی نشہ جس سے فسق و فجور پیدا ہو، بہن بیٹی کی تمیز نہ رہے، خلق خدا کو بھی آزار ہو، واقعی وہ حرام ہے اور جو نشہ اللہ کے عشق میں اضافہ کرے، یکسوئی قائم رہے، خلق خدا کو بھی تکلیف نہ ہو، وہ مباح بلکہ جائز ہے۔ پھر اس نے کہا: قرآن مجید میں صرف شراب کے نشے کی ممانعت ہے۔ جو اس وقت عام تھی بھنگ چرس کا کہیں بھی ذکر نہیں ملتا صرف علماء نے اس کے نشے کو حرام کہا ہے اگر بات صرف نشے کی ہے تو پان میں بھی نشہ ہے، تمباکو میں بھی نشہ ہے، اناج میں بھی نشہ ہے، عورت میں بھی نشہ ہے، دولت میں بھی نشہ ہے، تو پھر سب نشے ترک کر دو۔ اب وہ بزرگ بھنگ کا گلاس پیش کرتے ہیں اور میں پی جاتا ہوں اور اس کو بے حد لذیذ پایا۔

سوچتا ہوں بھنگ کتنا ذائقہ دار شربت ہے۔ خواہ مخواہ ہمارے عالموں نے اسے حرام کہہ دیا جب آنکھ کھلی تو سورج چڑھ چکا تھا، اب میرے پاؤں خود بخود مستانی کی جھونپڑی کی طرف جانے لگے۔ مستانی نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور کہا: رات کو بھٹ شاہؒ والے آئے تھے اور تمہیں بھنگ پلا کر چلے گئے۔ تم نے ذائقہ تو چکھ لیا ہو گا۔ یہی ہے شرابِ طہورا۔ مستانی نے کہا: بھٹ شاہؒ والے حکم دے گئے ہیں، اس کو روزانہ ایک گلاس الائچی ڈال کر پلایا کرو۔

میں سوچ رہا تھا پیوں یا نہ پیوں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیونکہ کچھ بزرگوں کے حالات کتابوں میں پڑھے تھے کہ ان کی ولایت مسلّم تھی لیکن ان سے بظاہر کئی خلاف شریعت کام سرزد ہوئے۔ جیسا کہ سمن سرکار کا بھنگ پینا، لال شاہؒ کا نسوار اور چرس پینا، سدا سہاگنؒ کا عورتوں سا لباس پہننا اور نماز نہ پڑھنا، امیر کلال کا کبڈی کھیلنا، سعید خزاری کا کتوں کے ساتھ شکار کرنا، خضر علیہ السلام کا بچے کو قتل کرنا، قلندر پاکؒ کا نماز نہ پڑھنا، داڑھی چھوٹی اور مونچھیں بڑی رکھنا، حتیٰ کہ رقص کرنا، رابعہ بصری کا طوائفہ بن کر بیٹھ جانا، شاہ عبد العزیزؒ کے زمانے میں ایک ولیہ کا ننگے تن گھومنا۔

لیکن سخی سلطان باھُوؒ نے فرمایا تھا کہ بامرتبہ تصدیق اور نقالیہ زندیق ہیں۔ مجھے بھی ماسوائے باطن کے ظاہر میں کچھ بھی تصدیق کا ثبوت نہ تھا۔ خیال آتا کہ کہیں پی کر زندیق نہ ہو جاؤں۔ پھر خیال آتا کہ اگر بامرتبہ ہوا تو اس لذیز نعمت سے محروم رہوں گا۔ آخر یہی فیصلہ کیا، تھوڑا سا چکھ لیتے ہیں، اگر رات کی طرح لذیز ہوا تو واقعی ہی شراباً طہوراہی ہو گا۔

آج مستانی میرے اقرار پر بہت خوش ہے۔ اس نے بھنگ میں پستہ، بادام اور الائچی بھی ڈالی ہے۔ گلاس میں برف بھی پڑی ہوئی ہے۔ گلاس ہاتھوں میں لیتا ہوں، ہاتھ کانپتے ہیں اور اوپر کو نہیں اٹھتے۔ ہمت کر کے منہ تک لے آتا ہوں۔ دیکھتا ہوں چھپکلی نما کیڑے شربت میں نیچے اوپر ہو رہے ہیں۔ میں نے گھبرا کر گلاس رکھ دیا اور اٹھ کر چپ چاپ چلا گیا۔[6]

صوفی بزرگ گوہر شاہی صاحب کی فراہم کردہ ان تفصیلات کا جائزہ کوئی بھی شخص کسی بھی مزار پر جا کر لے سکتا ہے۔ خاص کر عرس

کے موقع پر یہ تمام امور بڑے پیمانے پر سر انجام دیے جاتے ہیں۔

پابند شریعت صوفیاء کا نقطہ نظر

پابند شریعت صوفیاء اس بات کے بڑی شدت سے قائل ہیں کہ شریعت ہی اصل ہے اور اس کی پیروی کے بغیر سلوک اور طریقت کی کوئی منزل طے نہیں ہو سکتی ہے۔ ان میں سے بعض وہ ہیں جو اوپر بیان کردہ واقعات کو سن کر مخالف شریعت صوفیاء کو گمراہ اور جاہل قرار دیتے ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ شریعت کی مخالفت کرنے والے سرے سے صوفی ہی نہیں ہیں بلکہ وہ گمراہ لوگ ہیں جو کہ صوفیت کا لباس پہن کر اہل تصوف کی صفوں میں گھس آئے۔ شامی صوفی شیخ عبدالقادر عیسی(1919-1991) اپنی عربی کتاب "حقائق عن التصوف" میں لکھتے ہیں:

> قیامت تک انسانوں کے ہر گروہ میں خیر و شر تو موجود رہے گا۔ صوفیاء بھی سبھی ایک سے نہیں ہیں۔ جیسے تمام علماء، فقہاء، استاذ، جج، تاجر اور امراء ایک سے نہیں ہوتے، ان میں نیک اور نیک ترین لوگ بھی ہوتے ہیں اور برے اور بدترین لوگ بھی۔ یہ واضح معاملہ ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ جمہور کا موقف یہ ہے کہ حق کو پہچاننے سے اس کے اہل پہچانے جاتے ہیں۔ لوگ حق کے ذریعے جانچے جاتے ہیں نہ کہ حق کو لوگوں کے ذریعے۔ ہم بھی تصوف کے ان منحرف مدعیوں پر تنقید کرتے ہیں جو اللہ تعالی کے دین سے ہٹ گئے۔[7]

شیخ عیسی کے برعکس بعض پابند شریعت صوفیاء بھی، ان مخالفین شریعت کے عمل کا جواز پیش کرتے ہیں جس کی تفصیل یہ ہے:

- جب انسان سلوک کی ایک خاص منزل پر پہنچ جاتا ہے تو اس سے شرعی ذمہ داریاں اٹھالی جاتی ہیں۔
- جو ولی حالت سکر یا جذب میں ہو، اس سے شرعی ذمہ داریاں ساقط ہو جاتی ہیں۔
- ایسے صوفیاء فرقہ ملامتیہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ایسی حرکتوں سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ ان سے نفرت کریں تاکہ وہ پوری یکسوئی سے اللہ تعالی کی عبادت کر سکیں۔
- صوفیاء کے یہ واقعات سرے سے ہی غلط ہیں اور انہیں صوفیاء کی کتب میں داخل کیا گیا ہے اور ایسا کرنے والے باطنی فرقہ کے پیروکار تھے۔

اب ہم ان چاروں جوازات کے بارے میں اہل تصوف اور ان کے ناقدین کا نقطہ نظر پیش کرتے ہیں۔

1۔ شرعی ذمہ داریوں کا سقوط

بعض صوفیاء کا یہ موقف ہے کہ ایک خاص مقام پر پہنچنے کے بعد صوفی سے شرعی ذمہ داریاں اٹھالی جاتی ہیں کیونکہ وہ مشاہدہ حق کر لیتا ہے اور اس کا ایمان، ایمان بالغیب (بغیر دیکھے ایمان لانا) نہیں رہ جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ سے منسوب کتاب "فیوض الحرمین" میں درج

ہے:

ایک نہایت اعلیٰ تحقیق یہ ہے کہ بہت سے اولیاء پر یہ الہام کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو تمام شرعی احکام کی تعمیل سے بری کر دیا ہے اور ان کو طاعت و عبادت کے معاملہ میں اختیار دے دیا ہے کہ وہ چاہیں تو کریں اور اگر نہ چاہیں تو نہ کریں۔ مجھ سے میرے بزرگ اور والد رضی اللہ عنہ نے اپنے بارے میں یہ بیان فرمایا کہ خود ان کو بھی اسی طرح کا الہام ہوا تھا لیکن انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی کہ وہ ان کے اوپر شرعی ذمہ داریوں کو قائم رکھے اور انہوں نے قوانین و احکام کی پابندی ہی کو اختیار کیا۔ ان کا مسلک یہ نہیں تھا کہ کوئی عاقل و بالغ شرعی ذمہ داریوں سے بری قرار دیا جا سکتا ہے لیکن میں نے ان کو دیکھا کہ وہ اپنے الہام کو بھی حق سمجھتے ہیں اور اپنے مسلک کو بھی حق سمجھتے ہیں اور ان دونوں کے درمیان تطبیق (Reconciliation) دینے میں ان کو کچھ حیرانی سی پیش آ رہی ہے۔

مجھے اپنے بزرگ اور چچا کی نسبت بھی یہ معلوم ہوا کہ وہ اپنے بارے میں یہ فرماتے تھے کہ ان کو بھی ذمہ داریوں سے بری ہونے کا الہام ہوا تھا۔ ان کو غیب سے کہا گیا تھا کہ اگر تم جنت کی لیے ہماری عبادت کرتے تھے تو ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ تمہیں اس میں داخل کریں گے اور اگر تم ہماری رضا کے لیے عبادت کرتے تھے تو ہم تم سے راضی ہو چکے اور اس کے بعد کبھی ناراض نہ ہوں گے۔ تو انہوں نے عرض کیا: میرے رب! میں تیری عبادت محض تیرے لیے کرتا ہوں، کسی اور چیز کے لیے نہیں کرتا ہوں۔ چچا کا میلان اس بات کی طرف تھا کہ کاملین سے شرعی ذمہ داریاں ساقط کر دی جاتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ خود ہی ان کے اوپر ان کے اختیار کے بغیر شرعی قوانین کو جاری رکھتا ہے اور اسی قسم کی روایت دوسرے بہت سے اولیاء اللہ سے ہے۔[8]

اس کے جواب میں ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ اگر اس بات کو درست مان لیا جائے تو پھر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت عام لوگوں کے لیے ہے، خواص اس سے بے نیاز ہے۔ اس کے بعد یہی ہو گا کہ جس شخص کا شریعت کی پابندیوں کو قبول کرنے کو دل نہ چاہے، وہ یہ اعلان کر دے گا کہ میں مخصوص منازل طے کر چکا ہوں، مجھے اب شریعت کی پابندی کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر یہی بات تھی تو سب سے بڑھ کر کامل تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء راشدین ہیں۔ ان حضرات سے شریعت کی پابندی کیوں نہیں اٹھوائی گئی۔

وہ مزید کہتے ہیں کہ عین ممکن ہے کہ کشف میں انسان کو یہ آواز سنائی دے کہ تم سے شریعت کی پابندیاں اٹھالی گئیں، لیکن ایسا کشف شیطان کی جانب سے ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی جانب سے نہیں ہو سکتا ہے۔ اہل تصوف ہی کی کتب میں شیخ عبدالقادر جیلانی (470-561/1077-1166) کا یہ واقعہ ملتا ہے کہ ایک مرتبہ کشف میں انہیں اسی قسم کی بات کہی گئی کہ تم پر تمام شرعی پابندیاں اٹھالی گئی ہیں۔ انہوں نے بھانپ لیا کہ یہ شیطان بول رہا ہے، انہوں نے فوراً لاحول پڑھی تو وہ آواز غائب ہوتے ہوئے بولی: "عبدالقادر! تمہیں تمہارے علم نے بچا لیا ہے ورنہ میں اس طرح سے ستر صوفیاء کو گمراہ کر چکا ہوں۔" انہوں نے فرمایا: "لعین! جاتے ہوئے بھی مجھے گمراہ کرنا چاہتا ہے۔ مجھے میرے علم نے نہیں بلکہ اللہ کے فضل نے بچایا ہے۔"

مشہور صوفی مفسر علامہ الوسی نے تفسیر روح البیان میں چند نامور صوفیاء جیسے سری سقطی، جنید بغدادی، شیخ عبدالقادر جیلانی، امام غزالی، اور شیخ احمد سرہندی کے اقوال نقل کیے ہیں کہ اکابر اہل تصوف کے نزدیک بھی کسی ایسے الہام پر عمل کرنا خود صاحب الہام کے لیے

بھی جائز نہیں ہے جو شریعت کے خلاف ہو۔

2۔ جذب اور سکر

بعض لوگ کہتے ہیں کہ صوفیاء سے حالت جذب اور سکر میں غیر شرعی کام سرزد ہو جاتے ہیں۔ چونکہ وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہوتے، اس وجہ سے ان پر شرعی احکام کا اطلاق ہی نہیں ہوتا ہے۔ ریاض احمد گوہر شاہی صاحب (1941-2002) ان صوفیاء کے خلاف شریعت امور سے متعلق لکھتے ہیں:

> بہت سے اولیاء بھی مرتبہ کے بعد خلافِ شرع کاموں کا شکار ہوئے جیسے مظفر آباد میں سہیلی سرکارؒ۔ نہ نماز پڑھتے، نہ داڑھی رکھتے وفات کے بعد مولویوں نے کہا کہ یہ بے دین تھا اس وجہ سے ہم اس کا جنازہ نہیں پڑھائیں گے لیکن جب منہ سے کپڑا اٹھایا تو ریش موجود تھی۔ مری میں لال شاہؒ ننگے بیٹھے رہتے، نسوار کا نشہ کرتے رہتے اور نماز بھی نہ پڑھتے۔ لیکن جو کلام منہ سے نکالتے پورا ہو جاتا۔ سدا سہاگن بھی عورتوں جیسا سرخ لباس اور چوڑیاں پہنتے۔ سخی سلطان باہُوؒ فرماتے ہیں کہ جب کوئی جسم عشق الٰہی سے نور ہو جاتا ہے، اگر حرام کا لقمہ بھی کھالے تو نور کی گرمی اس نجاست کو حلال بنا دیتی ہے۔
>
> کچھ لوگ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ایسے نہیں کیا۔ نبی حالت صحو میں رہتے ہیں کیونکہ ان سے دین کی تکمیل ہوتی ہے۔ ولی سکر اور جذب میں بھی آتے ہیں۔ اگر ان میں کوئی خلافِ شریعت بات پیدا ہو جائے تو دین کا نہ کچھ بدلتا ہے اور نہ کچھ بگڑتا ہے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں کوئی خلافِ شرع بات پیدا ہو جاتی تو وہ سنت بن جاتی اور دین میں خرابی کا باعث بنتی۔ امیر کلالؒ بچپن سے ہی کبڈی کھیلا کرتے تھے ولایت کے بعد بھی آپ کبڈی کا شوق فرماتے لیکن ان کے وصال کے ان کے خلیفوں نے ایسا نہیں کیا۔ اگر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کبڈی کھیلتے۔ آج امت اس کو بھی سنت بنا لیتی یہی وجہ ہے کہ نبوت سکر و جذب اور گناہ و بدعت سے مبرّا اور معصوم ہے لیکن ولایت مبرّا نہیں۔
>
> اگر کوئی ولی ظاہر و باطن میں مقام بکمالیت تک پہنچ جائے تو وہ بھی مبرّا ہو جاتا ہے اور اسی کے لئے حدیث ہے: "میرے عالم بنی اسرائیل کے نبیوں کی مانند ہوں گے۔"[9]

آخری پیراگراف میں گوہر شاہی صاحب کی عبارت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ ظاہر و باطن میں کمال کے درجے پر پہنچنے والا صوفی گناہوں اور خطاؤں سے معصوم ہو جاتا ہے۔ اس موضوع پر تفصیل سے ہم "عصمت اولیاء" کے عنوان کے تحت گفتگو کر چکے ہیں۔

اس کے جواب میں ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ انسان ہوش و حواس میں نہ ہو، تو اسے کسی چیز کا ہوش نہیں ہوتا ہے۔ ایسا شخص پھر کس طرح لال لباس اور چوڑیاں پہن سکتا ہے، خوبصورت لونڈوں سے عشق کر سکتا ہے، نسوار اور چرس پی سکتا ہے، اور گدھوں سے بدفعلی کر سکتا ہے؟ واقعات میں جیسی تفصیل ملتی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حضرات پورے ہوش و حواس میں یہ فعل سرانجام دیا کرتے تھے۔ رہی یہ بات کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے لیے شریعت اور ہے اور صوفیاء کے لیے اور، تو یہ ایسی بات ہے جس کا کوئی ثبوت قرآن و حدیث میں نہیں ملتا ہے۔ یہ محض ایک دعوی ہے جس کی دلیل کچھ نہیں ہے اور شریعت کی پابندیوں

سے بچنے کے لیے اسے گھڑا گیا ہے۔

3۔ ملامتی فرقہ

بعض پابند شریعت صوفیا کہتے ہیں کہ خلاف شریعت امور انجام دینے والے ایسے صوفی ملامتی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان صوفیوں کو موقف یہ ہے کہ نفس کو کچلنے کا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے ایسے امور سر انجام دیے جائیں جو کہ بظاہر شریعت سے متصادم ہوں۔ اس سے لوگ ان سے نفرت کریں گے، جس سے وہ لوگوں سے دور ہو کر اپنا وقت عبادت اور تزکیہ نفس میں لگائیں گے۔ سید شبیر احمد کاکا خیل لکھتے ہیں:

> سوال: ملامتی کے بارے میں بھی کچھ بتایئے؟
>
> جواب: ملامتی اولیاء کی وہ قسم ہے جو اعمال تو کرتے ہیں لیکن اس میں اخفاء کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس لیے ہر کام کو ایسے انداز سے کرتے ہیں کہ لوگ اس کو برا آدمی سمجھتے ہیں حالانکہ وہ حقیقت میں اچھا عمل کر رہا ہوتا ہے۔ مثلاً بایزید بسطامی (رحمۃ اللہ علیہ) ایک دفعہ سفر سے آرہے تھے تو ایک خلقت استقبال کے لیے امڈ آئی۔ رمضان شریف کا مہینہ تھا آپ نے گدڑی سے ایک روٹی کا ٹکڑا اٹھایا اور سب کے سامنے کھا لیا۔ سب الٹے پیروں واپس ہوئے کہ یہ کیسا ولی ہے کہ روزہ میں کھاتا ہے۔ آپ نے ایک رازدار کو بتایا کہ لوگ کتنے سادہ ہیں کہ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ مسافر پر روزہ نہیں۔
>
> سوال: آخر وہ اپنے آپ کو کیوں چھپاتے ہیں؟ ان سے تو لوگوں کو ان کا فیض نہیں ملے گا؟
>
> جواب: بعض حضرات کا فیض صرف مخصوص لوگوں کے لیے ہوتا ہے اس لیے باقی لوگوں سے اپنے آپ کو چھپاتے ہیں تاکہ ان کے معمولات میں حرج نہ ہو۔ اس ضمن میں وہ عوام کو وقت کے ضیاع کا سبب سمجھتے ہیں۔[10]

اس کے جواب میں ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ تزکیہ نفس کا یہ طریقہ نہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمایا اور نہ ہی کسی صحابی کی سمجھ میں آیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد ایک لاکھ سے متجاوز ہے اور ان میں سے کسی نے ملامتی انداز اختیار نہیں فرمایا۔ دوسرا یہ کہ بایزید بسطامی صاحب کی مثال میں تو واضح ہے کہ انہوں نے فی الحقیقت کوئی خلاف شریعت کام نہیں کیا لیکن دیگر ملامتی صوفیاء کے افعال ایسے ہوتے ہیں جن کی کوئی بھی توجیہ ممکن نہیں ہے جیسے ہم جنس پرستی، جانوروں سے بد فعلی، ترک نماز وغیرہ۔

4۔ الحاق اور تدسیس

جیسا کہ ہم دوسرے ابواب میں بیان کرتے چلے آرہے ہیں کہ بعض پابند شریعت صوفیاء کا کہنا یہ ہے کہ یہ واقعات سرے سے ہی غلط ہیں اور انہیں فرقہ باطنیہ کے پیروکاروں نے صوفیاء کی کتابوں میں داخل کیا ہے۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی لکھتے ہیں:

> قرامطہ [فرقہ باطنیہ کا ایک گروہ جسے چوتھی صدی ہجری میں غیر معمولی سیاسی اقتدار حاصل ہوا] نے مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لیے جہاں اور ہتھکنڈے استعمال کیے، وہاں یہ حربہ بھی استعمال کیا کہ اپنی مجلسوں میں مسلسل اس گمراہ کن عقیدے کی تبلیغ کی کہ "شریعت اور طریقت دو

جداگانہ چیزیں ہیں اور جب ایک شخص طریقت کے دائرے میں قدم رکھتا ہے تو اس کے لیے شریعت کی پابندی لازمی نہیں رہتی۔ جی چاہے پابندی کرے، جی چاہے نہ کرے۔"

ملوکیت نے دین اور دنیامیں تفریق توپہلے ہی سے قائم کر دی تھی اور اس غیر اسلامی تعلیم نے مسلمانوں کی اجتماعی، اخلاقی اور دینی زندگی کو تباہ کر دیا تھا، رہی سہی کسر اس غیر اسلامی تصوف نے پوری کر دی، کیونکہ شریعت اور طریقت کی تفریق سے اباحت مطلقہ [یعنی ہر چیز جائز ہے] کا دروازہ کھل گیااور مسلمانوں کی روحانی زندگی ختم ہو کر رہ گئی۔

قرامطہ کو اس تفریق کی ضرورت اس لیے بھی پیش آئی کہ اگرچہ انہوں نے مصلحتاً تصوف کا لبادہ اوڑھ لیا تھا مگر دل تو بدستور غیر اسلامی تھا۔ اس لیے انہوں نے اس "نکتہ معرفت" کو شدومد کے ساتھ پیش کیا تاکہ کوئی شخص ان پر عدم پابندی شرع کا الزام عائد نہ کر سکے۔ علاوہ بریں ان جعلی صوفیوں کے حاشیہ نشینوں نے عوام کو یہ کہہ کر گمراہ کیا کہ نماز پنج گانہ تو عوام کے لیے ہے، یہ حضرات تو ہر وقت نماز میں مشغول رہتے ہیں۔

اس تعلیم کا نتیجہ یہ نکلا کہ رفتہ رفتہ مسلمانوں میں قلندری اور ملامتی درویشوں کی جماعتیں پیدا ہو گئیں۔ ان دونوں جماعتوں کے افراد پابندی شریعت سے آزاد رہتے تھے بلکہ اس آزادی میں فخر محسوس کرتے تھے اور تحقیر شریعت کو اپنے لیے طغرائے امتیاز بناتے تھے۔

قلندروں کی جماعت نے سیاحت اور صحرانوردی کو اپنا شعار بنالیا کیونکہ اس طرح سیر و تفریح کے مواقع بھی بآسانی میسر آسکتے تھے اور جدوجہد کے بغیر زندگی بسر ہو سکتی تھی، یعنی جس شہر میں پہنچے، وہاں کے مسلمانوں پر اپنے تقدس [ترک دنیا] کا سکہ جما کر اعلیٰ درجہ کی ضیافت کا انتظام کر لیا۔ رفتہ رفتہ ان کے اخلاق بالکل تباہ ہو گئے، بخوف طوالت، تفصیل سے اجتناب کرتا ہوں۔

رہے ملامتی فرقے کے لوگ تو انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کو سب سے زیادہ ضعف پہنچایا کیونکہ دین کی بنیاد ہی منہدم کر دی۔ انہوں نے ہر اس فعل کا ارتکاب کیا جس کی شریعت نے ممانعت فرمائی ہے۔ قرامطہ نے ان کو یہ نکتہ عجیبہ جسے ابلیسی ذہانت کا شاہکار کہنا زیادہ مناسب ہو گا، سمجھایا کہ:

1۔ تصوف کا مقصود ہے، نفس امارہ کو مغلوب کرنا۔

2۔ اس کے مغلوب کرنے کا ایک طریقہ اس کی تذلیل بھی ہے۔

3۔ اس لیے ایسے کام کرو جن کی وجہ سے لوگ تمہیں برا کہیں۔

4۔ جب لوگ تمہیں برا سمجھیں گے، گالیاں دیں گے، دین اسلام سے خارج کر دیں گے، تمہارا سوشل بائیکاٹ کریں گے تو یقیناً نفس امارہ، نفس مطمئنہ میں تبدیل ہو جائے گا۔

چونکہ اتباع شریعت نفس پر گراں ہے، اس لیے یہ "ملامتی طریقہ" بہت جلد مقبول ہو گیا اور آج بھی ہندوپاکستان کے مختلف شہروں میں آپ کو ایسے لوگ مل سکتے ہیں جو:

1۔ علانیہ شریعت اور طریقت میں تفریق کرتے ہیں اور پیر ہونے کے باوجود نہ نماز پڑھتے ہیں، نہ روزہ رکھتے ہیں، نہ اتباع شریعت کرتے ہیں۔ وجہ کیا ہے؟ صرف یہ کہ وہ کہتے ہیں کہ اب ہم روحانیت کے اس مقام پر فائز ہیں جہاں یہ رسوم ظاہری بے کار ہو جاتی ہیں اور اپنے زعم باطل کی تائید میں یہ آیت پیش کر دیتے ہیں: یعنی "اپنے رب کی اس وقت تک عبادت کر جب تک تجھ میں یقین کی کیفیت پیدا نہ ہو۔" اس کے بعد وہ کہتے ہیں

کہ چونکہ ہمارے اندر یقین پیدا ہو چکا ہے، اس لیے اب ہمیں عبادت کی ضرورت نہیں ہے۔ حالانکہ افضل الرسل، خیر البشر، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم آخر وقت تک نماز پڑھتے رہے!

2۔ درویشی کے پردے میں منہیات کا ارتکاب کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ہم تو اس لیے شراب پیتے ہیں کہ لوگ ہمیں برا سمجھیں اور اس طرح ہمارا نفس مردہ ہو جائے جو مقصود اسلام ہے۔ یہ "بے شرع" اور "خلاف شرع" صوفی جو دراصل ملاحدہ اور زنادقہ کی جماعت کے دو افراد ہیں، پانچویں صدی سے دنیائے اسلام میں اپنی فتنہ پردازی اور شرارت انگیزی میں مصروف ہیں۔ میں صرف ایک شخص کا ذکر کروں گا جس کا نام مادھو لال حسین ہے۔ یہ شخص اکبر کے عہد میں لاہور میں رہتا تھا۔ ایک طرف اپنے اشعار میں خالص توحید اور عشق الٰہی کا درس دیتا تھا، دوسری طرف ایک کھتری بچہ مادھو کے عشق میں گرفتار تھا اور بلا تامل خلاف شرع امور کا ارتکاب کرتا تھا۔

ملامتی فرقے کے درویش لاہور کے علاوہ دلی میں بھی تھے۔ اسی لیے حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ: "جو صوفی شریعت اور طریقت میں فرق کرتا ہے، وہ صوفی نہیں ہے بلکہ فرقہ باطنیہ سے تعلق رکھتا ہے۔"[11]

مخالف شریعت صوفیاء سے متعلق پابند شریعت اہل تصوف کے یہ چار نقطہ ہائے نظر ہمیں مل سکتے ہیں جو ہم نے یہاں بیان کر دیے ہیں۔

ناقدین تصوف کا نقطہ نظر

ناقدین تصوف کا نقطہ نظر بالعموم یہ ہے کہ شریعت و طریقت کے اس فرق کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اہل حدیث حضرات عام طور پر ان صوفیاء کو ہی گمراہ قرار دیتے ہیں جن سے یہ واقعات منسوب ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ صحیح اور غلط تصوف میں فرق کرنا درست نہیں بلکہ پورے کا پورا تصوف ہی گمراہی پر مبنی ہے۔ وہ مخالف شریعت اور پابند شریعت صوفیاء کی اس تقسیم کو بھی تسلیم نہیں کرتے جسے ہم نے اس کتاب میں بیان کیا ہے۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر لکھتے ہیں:

ابتدا میں میرا خیال یہ تھا کہ بعض غالی لوگوں کی وجہ سے تصوف اور صوفی بدنام ہوئے ہیں اور ان کے اس غلو کی وجہ سے ہر طرف سے ان پر طعن و تشنیع ہو رہی ہے اور انہیں شیعیت سے مشابہت دی جا رہی ہے، لیکن جب میں نے اس موضوع کو گہرائی میں جا کر پڑھا اور صوفیوں کی کتابوں اور خطوط کا مطالعہ کیا، ان کے طریقوں اور اجتماعات کا مشاہدہ کیا، ان کی خود نوشتوں اور تراجم کے بارے تحقیق کی تو میرے سامنے یہ بات آئی کہ شیعہ کی طرح ان کے ہاں بھی کسی بھی معاملے میں اعتدال نہیں ہے۔ اعتدال ان کے ہاں عنقا ہے۔ جس طرح کوئی شیعہ اس وقت تک کامل شیعہ نہیں کہلاتا جب تک وہ غالی اور متشدد نہ ہو، اسی طرح کوئی بھی صوفی اس وقت تک صوفی نہیں کہلاتا جب تک وہ اپنے عقائد میں غلو نہ کرے۔ اور اسے اولیاء اللہ میں سے اس وقت تک شمار نہیں کیا جاتا، جب تک کہ وہ مخلوق کے لیے بھی اسی طرح کی صفات ثابت نہ کرے، جیسا کہ باری تعالی کے لیے ہیں۔

اسی طرح ابتدا میں میرا خیال یہ تھا کہ میں تصوف کے موضوع پر جو کتاب لکھوں گا، اس کا موضوع ہو گا: "تصوف، اعتدال اور غلو کے درمیان" لیکن جب میں نے یہ کتاب لکھی تو مجھے محسوس ہوا کہ اس طرح کا کوئی موضوع اسم بامسمی نہ ہو گا اور موضوع اور کتاب کے درمیان کوئی مناسبت نہیں ہو گی۔ اس لیے کہ تمام تر کوششوں کے باوجود میں صوفیوں میں اعتدال والی کوئی بات تلاش نہ کر سکا۔ میری خواہش تھی کہ میں اعتدال والا

پہلو ان میں تلاش کروں اور ان کے حق میں دلائل دوں اگر توافق کی کوئی راہ نکلے تو اس کی تعریف و توصیف کروں اور ان کے باقی مسائل پر مدافعانہ لہجہ اختیار کروں۔ لیکن صوفیوں کی کتابوں کی طویل اور گہری تحقیق کے بعد میرے سامنے دو ہی راستے تھے، یا تو میں خدانخواستہ شیطان کی پیروی کرتے ہوئے بغیر کسی دلیل اور حجت کے خواہ مخواہ ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرتا، یا میں حق اور سچ بات کہتا اور اس بارے میں کسی ملامت کرنے والے کا خوف بھی دل میں نہ رکھتا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان دوسرے لوگوں میں شمار کرے، مجھے صادقین میں سے بنائے اور مجھے استقامت اور ثابت قدمی عطا کرے۔[12]

تصوف کے بعض ناقدین شریعت و طریقت کی اس تقسیم کو فرقہ باطنیہ کی سازش قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انہوں نے اسے صوفیوں کے لبادے میں اسے اسلام میں لا گھسایا۔ یہ حضرات یوسف سلیم چشتی صاحب کی دی ہوئی ان تفصیلات سے اتفاق کرتے ہیں۔ مشہور ناقد تصوف، مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

میں خود [چشتی صاحب کے] اس مقالے سے غایت درجہ متاثر ہوا ہوں۔ ارباب تصوف کی چیزیں پڑھتے ہوئے مجھے ہمیشہ ان کی کتاب و سنت سے ہٹی ہوئی باتوں سے وحشت ہوتی تھی۔ میں ان چیزوں کو خود تصوف کی خرابی پر محمول کرتا تھا، لیکن پروفیسر صاحب کے اس مقالہ سے مجھ پر پہلی مرتبہ یہ بات بدلائل واضح ہوئی کہ ہمارے تصوف میں بھی انہی چور دروازوں سے بہت سے فتنے داخل ہوئے ہیں جن سے تاریخ، حدیث، فقہ، تفسیر، ادب اور فلسفہ میں داخل ہوئے ہیں۔ اس حقیقت کے واضح ہونے سے نفس تصوف سے میری بیزاری کم ہوئی ہے۔ اب میں زیادہ قصور ان لوگوں کا سمجھتا ہوں، جو اپنی سادگی اور عامیانہ تقلید کے سبب سے روافض اور سبائیوں کی دسیسہ کاریوں سے آگاہ نہ ہو سکے اور تصوف کے چشمہ صافی کو انہوں نے ایک جوہڑ بنا کے رکھ دیا۔[13]

مولانا اصلاحی اپنی کتاب "تزکیہ نفس" میں لکھتے ہیں:

یہود نے جب چاہا کہ اپنی نفس پرستیوں کے لیے کوئی شرعی سند جواز پیدا کریں تو انہوں نے یہ نظریہ بنایا کہ ہم چونکہ حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق [علیہما الصلوۃ والسلامُ] کی اولاد اور خدا کے محبوب اور چہیتے ہیں، اس وجہ سے ہم خواہ کچھ بھی کر گزریں، ہمارے لیے دائمی عذاب دوزخ نہیں ہے۔ اول تو ہم دوزخ میں ڈالے ہی نہیں جائیں گے، لیکن اگر ڈالے بھی گئے تو چند دنوں سے زیادہ کے لیے نہیں۔ اپنے اس نظریے کو، جو محض نفس پرستی کی تحریک سے پیدا ہوا تھا، انہوں نے اپنے دین میں گھسا دیا تو ظاہر ہے کہ ان کی ساری شریعت، ان کی خواہشوں کے سانچے میں ڈھل گئی۔ اس کے اندر جو حقوق اور جو درجے اور مرتبے ان کے لیے بیان ہوئے تھے، ان کا تو وہ اپنے آپ کو پورا پورا موروثی حق دار سمجھتے تھے، لیکن جو ذمہ داریاں اس میں بیان ہوئی تھیں، ان کی سرے سے ان کو کوئی پروا ہی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ اپنے مذکور نظریہ کی بدولت جزا اور سزا اور دوزخ کی فکر سے بالکل فارغ البال ہو گئے تھے۔ اس وجہ سے قرآن مجید میں یہ فرمایا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب کو اپنی خواہشوں کا ایک مجموعہ سمجھ رکھا ہے جس میں وہی باتیں لکھی ہوئی ہیں جو ان کے نفس کو پسند ہیں۔

اسی طرح جب ان کے اندر سود کا رواج ہوا تو انہوں نے یہ نظریہ پیدا کیا کہ سود اگر حرام ہے تو خود اپنی قوم کے افراد یعنی بنی اسرائیل سے لینا حرام ہے، نہ کہ دوسری کافر قوموں سے، اس نظریہ کو انہوں نے اپنے دین میں گھسایا اور پھر اس راہ سے انہوں نے اپنے ساری سودی کاروبار کو جائز کر لیا۔

اسی طرح عیسائیوں میں پال نے جب رومیوں میں عیسائیت کو مرغوب و مقبول بنانا چاہا تو اس نے سود اور شراب کو جائز قرار دے دیا اور اس کے

لیے تاویل یہ کہ سود اور شراب کی حرمت اگر وارد ہے تو توریت میں وارد ہے، نہ کہ انجیل میں۔ اس وجہ سے بنی اسرائیل کے افراد کے لیے تو یہ چیزیں بے شک ناجائز ہیں لیکن دوسری قوموں کے جو لوگ مسیحیت قبول کریں، ان کے لیے اس کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

مسلمانوں پر اتباع ہوا کے تحت بدعتوں کا حملہ مختلف طرف سے ہوا۔ سب سے زیادہ یہ جنس باطنیہ نے پیدا کی، انھوں نے شریعت کی تمام قیود سے اپنے آپ کو آزاد کر لینے اور خواہشات نفس کی پوری پوری چھوٹ دے دینے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ شریعت کی تمام اصطلاحات کا مفہوم ہی یکسر بدل کے رکھ دیا۔ ان کی تعریف کے لحاظ سے نہ نبی نبی رہا، نہ قرآن قرآن اور نہ روزہ روزہ رہا اور نہ نماز نماز۔ ہر چیز کے ظاہر و باطن کو انہوں نے اس طرح مسخ کر دیا کہ شریعت کا پورا حلیہ ہی بگڑ کے رہ گیا۔ مثلاً نبی اس ذات کا نام ہے جس پر قوت قدسیہ کا فیضان ہوا، معاد [قیامت] سے مراد ہر چیز کا اپنی حقیقت کی طرف لوٹ آنا ہے۔ جنابت سے مراد افشائے راز ہے، غسل سے مراد تجدید عہد ہے، زنا سے مراد علم باطن کے نطفہ کو کسی ایسی ہستی کی طرف منتقل کرنا ہے جو عہد میں شریک نہ ہو، طہارت سے مراد مذہب باطنیہ کے سوا ہر مذہب سے برأت ہے، صلوۃ سے مراد امام وقت کی طرف دعوت، زکوۃ سے مراد ذی صلاحیت لوگوں میں علم کی اشاعت ہے۔ فرقہ اسماعیلیہ اور بابیوں بہائیوں کا سارا نظام اسی طرح کے عجائب و غرائب پر کھڑا ہے۔ شیعوں کے ہاں متعہ اور اس طرح کی بعض دوسری چیزیں اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہیں۔ قادیانیوں نے بھی باطنیہ سے بہت کچھ لیا ہے۔

لیکن اس زمانہ میں باطنیہ کے حقیقی وارث، منکرین حدیث ہیں۔ انہوں نے سنت کا انکار کرنے کے بعد تمام شرعی اصطلاحات، روزہ، نماز، حج، قربانی، جنت، دوزخ اور آخرت وغیرہ کی جو تاویلیں کرنی شروع کی ہیں، ان سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ان کے مقصد اور باطنیہ کے مقصد، ان کے طریق تاویل اور باطنیہ کے طریق تاویل میں سر مو فرق نہیں ہے۔ آپ باطنیہ کے نظریات و عقائد اور ان کے نظریات و عقائد، ان کی تاویلیں اور باطنیہ کی تاویلیں آمنے سامنے رکھ لیجیے تو یہ حقیقت آپ پر بالکل واضح ہو جائے گی کہ یہ دونوں ایک ہی اب وجد کی اولاد اور ایک ہی شجرۃ الزقوم کے برگ و بار ہیں۔[14]

اسائن منٹس

- شریعت کی پابندیوں سے آزادی کے حق میں مخالف شریعت صوفیاء کے دلائل کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔
- پابند شریعت صوفیاء، صوفی اکابرین کے خلاف شریعت معاملات کا کیا جواز پیش کرتے ہیں؟
- ناقدین تصوف کے خیال میں شریعت کی عدم پابندی کی نفسیاتی وجوہات کیا تھیں؟ مولانا اصلاحی اور علامہ احسان الٰہی ظہیر کے اقتباس کی روشنی میں جواب دیجیے۔

تعمیر شخصیت

خدا ایک ہی ہے۔ ہمیں اسی کی عبادت کرنی چاہیے اور صرف اسی سے مدد مانگنی چاہیے۔

[1] حقیقت وحدت الوجود بحوالہ شریعت وطریقت از عبد الرحمن کیلانی۔

[2] خزینۃ الاصفیا بحوالہ شریعت وطریقت

[3] تذکرہ غوثیہ، طبع اول بحوالہ شریعت وطریقت

[4] عبد الوہاب شعرانی۔ طبقات الکبری۔ ذکر علی وحیش من مجاذیب النجاریہ

[5] ریاض احمد گوہر شاہی۔ روحانی سفر۔(www.goharshahi.pk (ac. 23 May 2011

[6] حوالہ بالا۔

[7] عبد القادر عیسی۔ حقائق عن التصوف۔ حلب: دار العرفان۔(www.daraleman.org (ac. 11 Mar 2006

[8] شاہ ولی اللہ۔ فیوض الحرمین، بحوالہ تزکیہ نفس

[9] گوہر شاہی۔ حوالہ بالا۔

[10] سید شبیر احمد کاکا خیل۔ تصوف سے متعلق پوچھے جانے والے عام سوالات۔ (www.tazkiya.org (ac. 22 Apr 2011

[11] یوسف سلیم چشتی۔ اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش۔ ص 43-41۔ لاہور: مرکزی انجمن خدام القرآن۔
http://www.tanzeem.org/books/indexbo.asp (ac. 13 Oct 2011)

[12] احسان الٰہی ظہیر۔ تصوف: تاریخ وحقائق۔ ص 11۔ لاہور: ادارہ ترجمان السنۃ۔(www.kitabosunnat.com (ac. 27 Apr 2011

[13] امین احسن اصلاحی۔ تقریظ، اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش۔

[14] امین احسن اصلاحی۔ تزکیہ نفس۔ جلد 1۔ ص 212-208

باب 16: صوفیاء کا باطنی نظام حکومت

صوفیاء کے ہاں یہ تصور عام ہے کہ اللہ تعالی نے دنیا کا نظام کو چلانے کے لیے کچھ انسانوں کو مقرر کر رکھا ہے۔ ان کی ایک پوری مخروطی تنظیم (Hierarchy) موجود ہے جس کے سربراہ کو "غوث" کہا جاتا ہے۔ پوری کائنات میں ایک شخص ہی غوث ہوتا ہے اور اس کی حکومت کائنات پر چلتی ہے۔ غوث کے نیچے چار افراد ہوتے ہیں جو کہ "قطب" کہلاتے ہیں اور دنیا کے چاروں کونوں پر رہتے ہیں۔ قطب کے نیچے کا درجہ "ابدال" ہے جن کے تحت "نجیب" کام کرتے ہیں۔ ان کے نیچے "نقیب" کا درجہ ہے۔ بعض لوگ قطب اور ابدال کے درمیان "اوتاد" کا درجہ بھی بیان کرتے ہیں۔

برصغیر کے نقشبندی مجددی صوفیاء کے ہاں ایک اور درجہ پایا جاتا ہے جسے وہ "قیوم" کہتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ شیخ احمد سرہندی پہلے قیوم تھے اور ان کے بعد کل پانچ قیوم گزرے ہیں۔ قیوم کا منصب بڑی حد تک "غوث" کے مترادف ہے۔ خواجہ ابو الفیض اپنی مطبوعہ کتاب "روضۃ القیومیہ" (تحریر 1739) میں لکھتے ہیں:

> قیوم اس شخص کو کہتے ہیں جس کے ماتحت تمام اسماء و صفات، شیونات، اعتبارات اور اصول ہوں اور تمام گزشتہ و آئندہ مخلوقات کے عالم موجودات، جن و انس، پرندے، نباتات، ہر ذی روح، پتھر، درخت، بحر و بر کی ہر شے، عرش، کرسی، لوح، قلم، ستارہ، ثوابت، سورج، چاند، آسمان، بروج، سب اس کے سائے میں ہوں۔ افلاک و بروج کی حرکت و سکون، سمندروں کی لہروں کی حرکت، درختوں کے پتوں کا ہلنا، بارش کے قطروں کا گرنا، پھلوں کا پکنا، پرندوں کا چونچ پھیلانا، دن رات کا پیدا ہونا اور گردش کنندہ آسمان کی موافق یا ناموافق رفتار، سب کچھ اسی کے حکم سے ہوتا ہے۔ بارش کا ایک قطرہ ایسا نہیں جو اس کی اطلاع کے بغیر گرتا ہے، زمین پر حرکت و سکون اس کی مرضی کے بغیر نہیں ہوتا۔ جو آرام و خوشی اور بے چینی اور رنج اہل زمین کو ہوتا ہے، اس کے حکم کے بغیر نہیں ہوتا۔ کوئی گھڑی، کوئی دن، کوئی ہفتہ، کوئی مہینہ، کوئی سال ایسا نہیں جو اس کے حکم کے بغیر اپنے آپ میں نیکی و بدی کا تصرف کر سکے۔ غلہ کی پیدائش، نباتات کا اگنا، غرض جو کچھ بھی خیال میں آ سکتا ہے، وہ اس کی مرضی اور حکم کے بغیر ظہور میں نہیں آتا۔
>
> روئے زمین پر جس قدر زاہد، عابد، ابرار اور مقرب تسبیح، ذکر، فکر، تقدیس اور تزویہ میں، عبادت گاہوں، جھونپڑیوں، کٹیوں، پہاڑ اور دریا کے کنارے، زبان، قلب، روح، سر، خفی، اخفی، اور نفسی سے مشاغل اور معتکف ہیں اور حق تعالی کی راہ میں مشغول ہیں، گو انہیں اس بات کا علم نہ ہو اور جب تک ان کی عبادت قیوم کے ہاں قبول نہ ہو، اللہ تعالی کے ہاں قبول نہیں ہوتی۔[1]

صوفیاء کے ہاں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ چلوں اور مجاہدوں کے ذریعے صوفی ایک درجے سے دوسرے درجے میں ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔ بڑے بڑے صوفیاء ابدال، قطب اور پھر غوث کے درجے پر فائز ہوتے چلے جاتے ہیں۔ شیخ عبد القادر جیلانی (470-561/1077-1166) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آپ "غوث اعظم" کے مقام پر فائز تھے جو کہ غوث سے بھی بلند درجہ ہے۔ موجودہ دور میں بھی بہت سے صوفیاء کے مریدین ان کے لیے "غوث زماں" یا "قطب العالم" قسم کے القاب استعمال کرتے ہیں اور انہی سے اپنی دینی و

دنیاوی حاجات طلب کرتے ہیں۔

اہل تصوف کے دلائل

اہل تصوف اپنے نقطہ نظر کے حق میں متعدد احادیث پیش کرتے ہیں۔ اس موضوع پر مشہور عالم جلال الدین سیوطی (849-911/1445-1505) نے ایک رسالہ "الخبر الدال علی وجود القطب و الاوتاد و النجباء و الابدال" لکھا ہے جس میں انہوں نے اس موضوع سے متعلق تمام روایات نقل کی ہیں۔ یہاں ہم صرف وہ روایات نقل کر رہے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے متعلق ہیں کیونکہ یہ موضوع ایسا ہے جس پر معلومات ہمیں صرف حضور ہی سے مل سکتی ہیں، بقیہ لوگوں کے اقوال نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

حدیث عمر رضی اللہ عنہ

قال أبو طاهر المخلص : أنا أحمد بن عبد الله بن سعيد ثنا السري بن يحيى ثنا شعيب بن إبراهيم حدثنا سيف بن عمر عن أبي عمر عن زيد بن أسلم عن أبيه قال : كان الشام قد أسكن فإذا أقبل جند من اليمن وممن بين المدينة واليمن فاختار أحد منهم الشام قال عمر – رضي الله تعالى عنه – : يا ليت شعري عن الأبدال هل مرت بهم الركاب ؟ أخرجه ابن عساكر في تاريخ دمشق ، وأخرج أيضا من طريق سيف بن عمر عن محمد ، وطلحة ، وسهل قال : كتب عمر إلى أبي عبيدة إذا أنت فرغت من دمشق إن شاء الله فاصرف أهل العراق إلى العراق فإنه قد ألقي في روعي أنكم ستفتحونها ثم تدركون إخوانكم فتنصرونهم على عدوهم ، وأقام عمر بالمدينة لمرور الناس به ، وذلك أنهم ضربوا إليه من بلدانهم فجعل إذا سرح قوما إلى الشام قال : ليت شعري عن الأبدال فهل مرت بهم الركاب أم لا ؟ وإذا سرح قوما إلى العراق قال : ليت شعري كم في هذا الحي من الأبدال ؟

زید بن اسلم کے والد کہتے ہیں: جب میں شام میں سکونت اختیار کر چکا تھا، تو یمن کی جانب سے ایک لشکر وہاں آیا اور اس میں وہ لوگ تھے جو مدینہ اور یمن کے درمیان رہتے تھے۔ ان میں سے ایک نے شام کو رہائش کے لیے منتخب کیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "کاش! تمہیں ابدال کے بارے میں شعور ہو کہ وہ تمہارے ساتھ سفر کرتے ہوں؟" ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں اسے روایت کیا۔

سہل کہتے ہیں کہ عمر نے ابوعبیدہ رضی اللہ عنہما کو لکھ کر بھیجا: "انشاء اللہ جب آپ دمشق میں [جنگ سے] فارغ ہو جائیں تو اہل عراق کی طرف عراق میں چلے جائیے۔ وہاں آپ کو غیر معمولی چیزیں ملیں گے۔ عنقریب آپ اسے فتح کریں گے تو وہاں اپنے بھائیوں کو پائیں گے جو آپ کی دشمن کے خلاف مدد کریں گے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے خود مدینہ میں قیام کیا تاکہ لشکر روانہ کرتے رہیں۔ یہ لوگ اپنے شہروں سے مدینہ آتے تھے اور [آپ لشکر تیار کر کے] انہیں روانہ کر دیتے تھے۔ جب آپ کسی گروہ کو شام کی طرف بھیجتے تو فرماتے: "کاش! تمہیں ابدال کے بارے میں شعور ہو کہ وہ تمہارے ساتھ سفر کرتے ہوں؟" جب وہ کسی گروہ کو عراق کی طرف بھیجتے تو فرماتے: "کاش! تمہیں ابدال کے بارے میں شعور ہو کہ اس علاقے میں کتنے ابدال ہیں۔"[2]

ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ اس حدیث میں زیادہ سے زیادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالی کے کچھ بندے ہیں جو لشکروں کے ساتھ سفر کرتے ہیں اور انہیں ابدال کہا جاتا ہے۔ یہ کہیں معلوم نہیں ہوتا کہ ان کی نوعیت کیا ہے؟ کیا یہ فرشتے ہیں، جنات ہیں یا انسان؟ صوفیاء کے ہاں جو باقاعدہ باطنی نظام اور رجال غیب کی ایک تنظیم کا ذکر ملتا ہے، اس کا کوئی ذکر اس روایت میں نہیں ملتا ہے۔

حدیث علی رضی اللہ عنہ

قال الإمام أحمد بن حنبل في مسنده : ثنا أبو المغيرة ثنا صفوان عن شريح بن عبيد قال : ذكر أهل الشام عند علي بن أبي طالب – وهو بالعراق – فقالوا : العنهم يا أمير المؤمنين ؟ قال : لا ، سمعت رسول الله – صلى الله عليه وسلم – يقول : (الأبدال بالشام وهم أربعون رجلا كلما مات رجل أبدل الله مكانه رجلا يسقي بهم الغيث وينتصر بهم على الأعداء ويصرف عن أهل الشام بهم العذاب) – رجاله رجال الصحيح – غير شريح بن عبيد وهو ثقة.

سیدنا علی رضی اللہ عنہ جب عراق میں تھے تو ان کے سامنے اہل شام کا ذکر ہوا [جو کہ آپ سے برسر پیکار تھے۔] لوگ بولے: "اے امیر المومنین! ان پر لعنت فرمائیے۔" فرمایا: "نہیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے: "شام میں چالیس لوگ ابدال ہوتے ہیں۔ جب ان میں سے کوئی شخص مر جاتا ہے تو اللہ اس کی جگہ دوسرے شخص کو دے دیتا ہے۔ وہ انہی کے ذریعے بارش برساتا ہے، انہی کے ذریعے دشمنوں کے خلاف مدد کرتا ہے اور اہل شام سے عذاب کو انہی کے ذریعے ہٹا دیتا ہے۔" اس روایت کے راوی صحیح ہیں سوائے شریح بن عبید کے اور وہ بھی ثقہ ہیں۔ (مسند احمد)

اس کے علاوہ سیوطی نے ابن عساکر کی تاریخ دمشق، ابن ابی الدنیا کی کتاب الاولیاء اور طبرانی سے یہی روایت ملتے جلتے الفاظ میں نقل کی ہے۔ ابن ابی الدنیا کی روایت میں ساٹھ ابدال کا ذکر ہے۔ یہ روایات منقطع ہیں۔ آپ سے یہ روایت بھی منسوب ہے:

قال ابن عساكر أنا نصر بن أحمد بن مقاتل عن أبي الفرج سهل بن بشر الأسفراييني أنا أبو الحسن علي بن منير بن أحمد الخلال أنا الحسن بن رشيق ثنا أبو علي الحسين بن حميد العك ثنا زهير بن عباد ثنا الوليد بن مسلم عن الليث بن سعد عن عياش بن عباس القتياني أن علي بن أبي طالب قال الأبدال من الشام والنجباء من أهل مصر والأخيار من أهل العراق.

سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ابدال شام میں ہوتے ہیں، نجباء [نجیب کی جمع] اہل مصر میں اور اخیار اہل عراق میں۔ (ابن عساکر)

وبه إلى محمد بن عمار ثنا جعفر بن علي بن نجيح ثنا حسن بن حسين عن علي بن القاسم عن صباح بن يحيى المزني عن سعيد بن الوليد الهجري عن أبيه قال: قال علي ألا أن الأوتاد من أبناء الكوفة ومن أهل الشام أبدال..

سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اوتاد اہل کوفہ میں ہوتے ہیں اور ابدال اہل شام میں۔ (ابن عساکر)

حدیث انس رضی اللہ عنہ

قال الحكيم الترمذي في نوادر الأصول : ثنا عمر بن يحيى بن نافع الأيلي (ح) وقال ابن عدي ، وابن شاهين ، والحافظ أبو محمد الخلال في كتاب كرامات الأولياء معا ثنا محمد بن زهير بن الفضل الأيلي ثنا عمر بن يحيى بن نافع

ثنا العلاء بن زيدل عن أنس بن مالك عن النبي – صلى الله عليه وسلم – قال : (البدلاء أربعون رجلا : اثنان وعشرون بالشام وثمانية عشر بالعراق ، كلما مات منهم واحد أبدل الله مكانه آخر ، فإذا جاء الأمر قبضوا كلهم فعند ذلك تقوم الساعة) .

انس بن مالک رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: "ابدال چالیس لوگ ہیں۔ ان میں سے 22 تو شام میں ہوتے ہیں اور 18 عراق میں۔ جب بھی ان میں سے کوئی ایک مرتا ہے تو اللہ تعالی اس کی جگہ دوسرا پیدا فرما دیتا ہے۔ جب فیصلہ ہو جائے گا تو ان سب کی روح قبض کر لی جائے گی اور یہ قیامت کے قریب ہو گا۔" (نوادر الاصول، حکیم ترمذی)

قال الحافظ أبو محمد الخلال في كتاب كرامات الأولياء أنا أبو بكر بن شاذان ثنا عمر بن محمد الصابوني ثنا إبراهيم بن الوليد الجشاش ثنا أبو عمر الغداني ثنا أبو سلمة الخراساني عن عطاء عن أنس قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الأبدال أربعون رجل وأربعون امرأة كلما مات رجل أبدل الله مكان رجل ولكما ماتت امرأة أبدل الله مكانها امرأة– أخرجه الديلمي في مسند الفردوس من طريق أخرى عن إبراهيم بن الوليد.

انس بن مالک رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: "ابدال چالیس مرد اور چالیس عورتیں ہوتی ہیں۔ جب ان میں سے کوئی مرد مرتا ہے تو اللہ تعالی اس کی جگہ اور مرد کو مقرر فرما دیتا ہے اور جب کوئی عورت مرتی ہے تو اس کی جگہ اور عورت کو مقرر فرما دیتا ہے۔ (ابن عساکر، دیلمی)

سیوطی نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے پانچ ملتی جلتی روایتیں نقل کی ہیں جو کہ ابن عساکر، طبرانی اور حکیم ترمذی کی کتابوں سے منقول ہیں۔ اس حدیث کو مشہور محدث ابن جوزی نے اپنی "موضوعات" میں درج کیا ہے اور اسے جعلی حدیث قرار دیا ہے۔

حدیث عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ

قال الإمام أحمد في مسنده ثنا عبد الوهاب بن عطاء أنا الحسن بن ذكوان عن عبد الواحد بن قيس عن عبادة بن الصامت عن النبي صلى الله عليه وسلم قال الأبدال في هذه الأمة ثلاثون مثل إبراهيم خليل الرحمن كلما مات رجل أبدل الله مكانه رجلا. وأخرجه الحكيم الترمذي في نوادر الأصول والخلال في كرامات الأولياء ورجاله رجال الصحيح غير عبد الواحد وقد وثقة العجلي وأبو زرعة.

عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس امت کے ابدال تیس افراد ہیں اور ابراہیم علیہ السلام کی طرح اللہ کے دوست ہیں۔ جب ان میں سے کوئی شخص مرتا ہے تو اس کی جگہ اللہ دوسرا شخص پیدا فرما دیتا ہے۔" (مسند احمد)

سیوطی نے اس حدیث کو طبرانی سے بھی روایت کیا ہے۔ اس حدیث کو محدثین نے منکر قرار دیا ہے کیونکہ اس میں عبدالواحد بن قیس نامی صاحب قابل اعتماد راوی نہیں ہیں۔

حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما

قال الإمام أحمد في الزهد ثنا عبد الرحمن ثنا سفيان عن الأعمش عن المنهال بن عمرو عن سعيد بن جبير عن ابن

عباس قال ما خلت الأرض من بعد نوح من سبعة يدفع الله بهم عن أهل الأرض– أخرجه الخلال.

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد زمین سات افراد سے خالی نہیں رہتی جن کے ذریعے اللہ اہل زمین سے [سیلاب] ٹالتا رہتا ہے۔ (مسند احمد)

حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما

قال الطبراني ثنا محمد بن الخزر الطبراني ثنا سعيد بن أبي زيدون ثنا عبد الله ابن هارون الصوري ثنا الأوزاعي عن الزهري عن نافع عن ابن عمر قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم خيار أمتي في كل قرن خمسمائة والأبدال أربعون فلا الخمسمائة ينقصون ولا الأربعون كلما مات رجل أبدل الله من الخمسمائة مكانه وأدخل من الأربعين مكانه قالوا يا رسول الله دلنا على أعمالهم قال يعفون عمن ظلمهم ويحسنون إلى من أساء إليهم ويتواسون فيما آتاهم الله، أخرجه أبو نعيم وتمام وابن عساكر من هذا الطريق وأخرجه ابن عساكر أيضا من طريق آخر عن محمد بن الخزر ولفظه كلما مات بديل، وأخرجه من طريق آخر عن سعيد بن عبدوس عن عبد الله بن هارون بلفظ كلما مات أحد بدل الله من الخمسمائة مكانه وأدخل في الخمسمائة مكانه.

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میری امت کے بہترین لوگ ہر زمانے میں پانچ سو ہوں گے جن میں چالیس ابدال ہوں گے۔ نہ تو یہ پانچ سو کم ہوں گے اور نہ چالیس۔ جب ان میں سے کوئی شخص مرے گا تو اللہ ان پانچ سو میں سے کسی ایک کو اس کی جگہ دے کر چالیس میں شامل کر دے گا۔" لوگ بولے: "یا رسول اللہ! ہمیں ان کے اعمال کے متعلق بتائیے۔" فرمایا: "جو ان پر ظلم کرے گا، وہ اسے معاف کر دیں گے۔ جو ان سے برائی کرے گا، وہ اسے نیکی کریں گے۔ جو اللہ انہیں دے گا، وہ اس سے صلہ رحمی کریں گے۔" (طبرانی)

اس روایت کو ابن عساکر نے ایک دوسرے طریق سے روایت کیا ہے اور اس میں لفظ ہے کہ جب ان میں سے کوئی مرتا ہے تو اسے تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ جب ان میں سے کوئی مرتا ہے تو اللہ پانچ سو میں سے اس کی جگہ ایک داخل کر دیتا ہے اور ان پانچ سو میں [باقی مومنین] میں سے داخل کر دیتا ہے۔

اس حدیث کو مشہور محدث ابن جوزی نے اپنی "موضوعات" میں درج کیا ہے اور اسے جعلی حدیث قرار دیا ہے۔

حدیث عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

قال أبو نعيم ثنا محمد بن أحمد بن الحسن ثنا محمد بن السري القنطري ثنا قيس بن إبراهيم بن قيس السامري ثنا عبد الرحيم بن يحيى الأرمني ثنا عثمان بن عمارة ثنا المعافى بن عمران عن سفيان الثوري عن منصور عن إبراهيم عن الأسود عن عبد الله قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم إن لله عز وجل في الخلق ثلاثمائة قلوبهم على قلب آدم عليه السلام ولله في الخلق أربعون قلوبهم على قلب موسى عليه السلام ولله في الخلق سبعة قلوبهم على قلب إبراهيم عليه السلام ولله في الخلق خمسة قلوبهم على قلب جبريل عليه السلام ولله في الخلق ثلاثة قلوبهم على قلب ميكائيل عليه السلام ولله في الخلق واحد قلبه على قلب إسرافيل عليه السلام فإذا مات الواحد أبدل الله مكانه من الثلاثة وإذا مات من الثلاثة أبدل الله مكانه من الخمسة وإذا مات من الخمسة بدل الله مكانه من السبعة وإذا مات من السبعة أبدل الله

مكانه من الأربعين وإذا مات من الأربعين أبدل مكانه من الثلاثمائة وإذا مات من الثلاثمائة أبدل الله مكانه من العامة فبهم يحيي ويميت ويمطر وينبت ويدفع البلاء قيل لعبد الله بن مسعود وكيف بهم يحيي ويميت قال لأنهم يسألون الله إكثار الأمم فيكثرون ويدعون على الجبابرة فيقصمون ويستسقون فيسقون ويسألون فتنبت لهم الأرض ويدعون فيدفع بهم أنواع البلاء، أخرجه ابن عساكر.

عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ نے مخلوق میں تین سو دل ایسے رکھے ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام کے دل کے مطابق ہیں۔ اللہ کی مخلوق میں چالیس دل ایسے ہیں جو حضرت موسی علیہ السلام کے دل کے مطابق ہیں۔ اللہ کی مخلوق میں سات دل ایسے ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل کے مطابق ہیں۔ اللہ کی مخلوق میں تین دل ایسے ہیں جو حضرت میکائیل علیہ السلام کے دل کے مطابق ہیں۔ اللہ کی مخلوق میں ایک دل ایسا ہے جو حضرت اسرافیل علیہ السلام کے دل کے مطابق ہے۔

جب وہ ایک دل والا مرتا ہے تو اللہ اس کی جگہ تین میں سے ایک کو مقرر کر دیتا ہے۔ جب تین میں سے کوئی مرتا ہے، تو اللہ اس کی جگہ پانچ میں سے ایک کو مقرر کرتا ہے۔ جب پانچ میں سے کوئی مرتا ہے تو اس کی جگہ سات میں سے اور سات میں کوئی مرے تو اس کی جگہ چالیس میں سے اور چالیس میں سے جب کوئی مرے تو اس کی جگہ تین سو میں سے اور تین سو میں سے جب کوئی مرے تو عام لوگوں میں سے کسی کو مقرر فرما دیتا ہے۔ انہی کے ذریعے وہ مارتا اور زندگی دیتا ہے، بارش برساتا ہے، پودے اگاتا ہے اور بلائیں دور کرتا ہے۔

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: "ان کے ذریعے وہ کس طرح زندگی اور موت دیتا ہے؟" فرمایا: "اس طرح کہ وہ اللہ سے آبادی کی کثرت کی دعا کرتے ہیں، تو اس میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ وہ ظالموں کے خلاف بددعا کرتے ہیں تو انہیں توڑ کر رکھ دیا جاتا ہے۔ وہ بارش کی دعا کرتے ہیں تو بارش فرما دی جاتی ہے، وہ سبزے کی دعا کرتے ہیں تو ان کی دعا پر زمین پر سبزہ اگا دیا جاتا ہے، وہ بلائیں دور کرنے کی دعا کرتے ہیں تو ان سے بلائیں دور کر دی جاتی ہیں۔" اس روایت کو ابن عساکر نے روایت کیا۔ (ابن عساکر، طبرانی)

یہ حدیث **ابو نعیم** (336-430/947-1038) نے روایت کی ہے جو کہ مشہور صوفی اور **طبقات الصوفیاء** کے مصنف ہیں۔ **ابو نعیم**، ناقدین تصوف کے نزدیک لائق اعتماد نہیں ہیں، جس کی وجہ سے ان تمام روایات کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اسی طرح بعض روایات حکیم ترمذی کی ہیں، جو ایک صوفی تھے اور ناقدین تصوف کے نزدیک لائق اعتماد نہیں ہیں۔

حدیث معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ

قال أبو عبد الرحمن السلمي في كتاب سنن الصوفية ثنا أحمد بن علي بن الحسن ثنا جعفر بن عبد الوهاب السرخسي ثنا عبيد بن آدم عن أبيه عن أبي حمزة عن ميسرة بن عبد ربه عن المغيرة بن قيس عن شهر بن حوشب عن عبد الرحمن بن غنم عن معاذ بن جبل قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ثلاث من كن فيه فهو من الأبدال الذين بهم قوام الدنيا وأهلها الرضا بالقضاء والصبر عن محارم الله والغضب في ذات الله، أخرجه الديلمي في مسند الفردوس.

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ابدال میں تین ایسے ہیں جن کے ذریعے دنیا قائم ہے۔ یہ قضا پر راضی رہنے والے لوگ ہیں اور اللہ کے حرام کردہ امور پر صبر کرنے والے اور اس کے معاملے میں اپنے غضب کو استعمال کرنے والے ہیں۔ (دیلمی، مسند الفردوس)

حدیث واثلہ رضی اللہ عنہ

قال ابن عساكر قرئ علي أبي محمد بن الأكفاني وأنا أسمع عن عبد العزيز بن أحمد أنا عبد الوهاب بن جعفر الميداني أنا أبو الحارث أحمد بن محمد بن عمارة بن أبي الخطاب الليثي الدمشقي ثنا أبو سهل سعيد به ابن الحسن الأصبهاني ثنا محمد بن أحمد بن إبراهيم ثنا هشام بن خالد الأزرق ثنا الوليد بن مسلم ثنا ابن جابر عن عبد الله بن عامر عن واثلة بن الأسقع قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ستكون دمشق في آخر الزمان أكثر المدن أهن وأكثره أبدالا وأكثره مساجد وأكثره زهادا وأكثره مالا ورجالا واقله كفارا وهي معقل لأهلها.

واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "عنقریب آخری زمانے میں دمشق سب شہروں سے زیادہ آباد ہو گا، اس میں سب سے زیادہ ابدال ہوں گے، سب سے زیادہ مساجد ہوں گی، سب سے زیادہ عبادت گزار ہوں گے، سب سے زیادہ مال اور لوگ ہوں گے، اور سب سے کم کفار ہوں ہوں گے اور یہ اپنے باشندوں کے لیے قلعہ ہو گا۔ (ابن عساکر)

حدیث ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ

قال البيهقي في شعب الإيمان أنا علي بن أحمد بن عبدان أنا أحمد بن عبيد ثنا ابن أبي شيبة ثنا محمد بن عمران بن أبي ليل أنا سلمة بن رجاء كوفي عن صالح المزي عن الحسن عن أبي سعيد الخدري أو غيره قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم أن أبدال أمتي لم يدخلوا الجنة بالأعمال إنما دخولها برحمة الله وسخاوة الأنفس وسلامة الصدور ورحمة لجميع المسلمين، قال البيهقي رواه عثمان الدارمي عن محمد بن عمران فقال عن أبي سعيد لم يقل أو غيره وقيل عن صالح المزي عن ثابت عن أنس.

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ یا کسی اور سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میری امت کے ابدال جنت میں اعمال کے سبب داخل نہ ہوں گے۔ یہ محض اللہ کی رحمت، اپنی سخاوت، دل کی سلامتی اور تمام مسلمانوں کے لیے رحمت کے سبب داخل ہوں گے۔" (بیہقی، شعب الایمان)

حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ

قال ابن حبان في التاريخ ثنا محمد بن المسيب ثنا عبد الرحمن بن مرزوق ثنا عبد الوهاب بن عطاء الخفاف عن محمد بن عمرو عن أبي سلمة عن أبي هريرة عن النبي صلى الله عليه وسلم قال لن تخلو الأرض من ثلاثين مثل إبراهيم خليل الرحمن بهم تغاثون وبهم ترزقون وبهم تمطرون.

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "زمین ایسے تیس افراد سے خالی نہیں ہوتی جو ابراہیم علیہ السلام کی مانند اللہ کے دوست ہوتے ہیں، انہی کے ذریعے دعا قبول کی جاتی ہے، انہی کے ذریعے رزق دیا جاتا ہے اور انہی کے ذریعے بارش برسائی جاتی ہے۔" (ابن حبان، تاریخ)

حدیث ابو درداء رضی اللہ عنہ

قال الحكيم الترمذي في نوادر الأصول ثنا عبد الرحيم ابن حبيب ثنا داود بن محبر عن ميسرة عن أبي عبد الله الشامي

عن مكحول عن أبي الدرداء رضي الله عنه قال أن الأنبياء كانوا أوتاد الأرض فلما انقطعت النبوة أبدل الله مكانهم قوما من أمة محمد صلى الله عليه وسلم يقال لهم الأبدال لم يفضلوا الناس بكثرة صوم ولا صلاة ولا تسبيح ولكن بحسن الخلق وبصدق الورع وحسن النية وسلامة قلوبهم لجميع المسلمين والنصيحة لله.

ابو درداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "انبیاء زمین پر اوتاد [کیلوں] کی مانند تھے۔ جب نبوت ختم ہوئی تو اللہ نے ان کی جگہ امت محمد میں سے ایک گروہ کو مقرر فرمایا جنہیں ابدال کہا جاتا ہے۔ وہ لوگوں پر صوم و صلوۃ اور تسبیح کی کثرت کے سبب فوقیت نہیں رکھتے بلکہ حسن اخلاق، سچائی، تقوی، اچھی نیت، تمام مسلمانوں کے لیے دلوں کی سلامتی اور اللہ کے واسطے خیر خواہی کی بنیاد پر فضیلت رکھتے ہیں۔" (حکیم ترمذی، نوادر الاصول)

حدیث ام سلمہ رضی اللہ عنہا

قال أبو داود في سننه ثنا محمد بن المثنى ثنا معاذ بن هشام حدثني أبي عن قتادة عن صالح أبي الخليل عن صاحب له عن أم سلمة زوج النبي صلى الله عليه وسلم عن النبي صلى الله عليه وسلم قال يكون اختلاف عند موت خليفة فيخرج رجل من المدينة هاربا إلى مكة فيأتيه ناس من أهل مكة فيخرجونه وهو كاره فيبايعونه بين الركن والمقام ويبعث إليه بعث من الشام فيخسف بهم بالبيداء بين مكة والمدينة فإذا رأى الناس ذلك أتوا أبدال أهل الشام وعصائب أهل العراق فيبايعونه – الحديث أخرجه الإمام أحمد في مسنده وابن أبي شيبة في المصنف وأبو يعلى والحاكم والبيهقي وله طرق سمي في بعضها المبهم مجاهدا وفي بعضها عبد الله بن الحارث.

سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں کہ آپ نے فرمایا: "ایک خلیفہ کے مرنے کے بعد اختلاف ہو گا تو ایک شخص مدینہ سے مکہ کی طرف فرار ہو گا۔ لوگ اہل مکہ کے پاس آ کر اطلاع دیں گے تو وہ بھی نکل کھڑے ہوں گے۔ وہ رکن اور مقام کے درمیان اس کی بیعت کریں گے اور اس کی جانب شام سے ایک لشکر آئے گا۔ انہیں مکہ اور مدینہ کے مابین بیداء کے مقام کے پاس دھنسا دیا جائے گا۔ جب لوگ یہ دیکھیں گے تو اہل شام کے ابدال اور اہل عراق کے لشکر اس کے پاس آئیں گے اور وہ اس کی بیعت کر لیں گے۔" اس حدیث کو احمد، ابن ابی شیبہ، ابو یعلی، حاکم، بیہقی نے روایت کیا اور ان کی روایت میں مبہم لفظ "مجاہد" لکھا ہے۔

اس حدیث کو بعض محدثین نے حسن قرار دیا ہے۔ علامہ البانی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے کیونکہ اس کی سند میں ایک صاحب ابو خلیل ہیں جن کا نہ تو نام معلوم ہے اور ان کے بارے میں یہ معلوم نہیں کہ وہ کس درجے میں قابل اعتماد ہیں۔ اس حدیث کی دیگر روایتوں میں بھی ابو العوام اور ابن رفاعہ نامی راوی ہیں جو کہ ضعیف ہیں۔[3] البانی مزید بیان کرتے ہیں کہ یہی حدیث دیگر مسند احمد اور ابو یعلی میں صحیح سند سے بھی روایت ہوئی ہے اور اس میں ابدال اور اہل عراق کا کوئی ذکر نہیں ہے۔[4]

ناقدین تصوف کے دلائل

ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ قطب و ابدال کے اس تصور کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لوگ اللہ تعالی کی بجائے انسانوں سے مدد طلب کرنے لگ جاتے ہیں اور ان کے بندے بن کر رہ جاتے ہیں۔ اس طرح وہ شرک کی دلدل میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ قیوم یا غوث کا جو تصور اہل تصوف کے ہاں پایا جاتا ہے، اسے "قادر مطلق" ہی کہا جا سکتا ہے جو کہ اللہ تعالی کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ غیر اللہ سے مافوق الاسباب

طریقے سے مدد طلب کرنے کے موضوع پر آپ تفصیلی بحث کا جائزہ ماڈیول CS02 میں لے سکتے ہیں۔ اس ضمن میں بعض اقتباسات پیش خدمت ہیں:

اس کے بعد آپ نے حکایت بیان فرمائی کہ ایک مرتبہ یہی عبد اللہ پاک پٹن سے ملتان جانا چاہتے تھے۔ ان دنوں راستہ میں ڈاکوؤں کا زور تھا۔ انہوں نے حضرت شیخ الاسلام [فرید الدین گنج شکر] رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی عزیمت ملتان کی اور سلامتی سے ملتان پہنچنے کے واسطے استمداد دعا چاہی۔ شیخ الاسلام نے فرمایا کہ یہاں سے فلاں موضوع تک میرا تعلق ہے۔ اور اس کے آگے تعلق شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ میری حد تک تم ان شاء اللہ تعالی بخیر و عافیت پہنچ جاؤ گے۔ عبد اللہ یہ سن کر روانہ ہوئے اور جہاں تک تعلق حضرت شیخ الاسلام کا تھا، مطلق خطرہ ان کو نہ ہوا۔ حوض پر پہنچ کر ان کو کلام حضرت شیخ الاسلام کا یاد آیا۔ وضو کر کے دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی اور جانب ملتان منہ کر کے کہا کہ یہاں تک عملداری شیخ الاسلام فرید الدین کی تھی۔ میں نے آپ کا نفس ہمراہ ہونے سے بہ خیریت تمام آ پہنچا۔ اے شیخ بہاؤ الدین! آگے تمہارا علاقہ ہے، تم بھی مجھے بخیر و عافیت ملتان پہنچاؤ۔ [5]

ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ صوفیاء کے ہاں دنیا کو انسانوں کے ذریعے کنٹرول کرنے کا جو تصور پایا جاتا ہے، یہ بے اصل ہے اور اس کی کوئی سند کتاب و سنت میں نہیں ملتی ہے۔ نہ تو قرآن میں اس کا کہیں ذکر ہے اور نہ ہی کسی حدیث میں۔ حدیث کے پورے ذخیرے میں ایسی کوئی حدیث موجود نہیں ہے جس میں غوث، قطب وغیرہ کا تصور ملتا ہو۔ حلیۃ الاولیاء میں صوفی ابو نعیم صاحب (336-430/947-1038) نے چند احادیث اس موضوع پر نقل کی ہیں مگر وہ سب کی سب جعلی اور موضوع روایات ہیں جن کی سند اور متن دونوں میں بہت گڑبڑ ہے۔

ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ حدیث کی پہلے اور دوسرے درجے کی کتب ابدال کے ذکر سے خالی ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ابدال اور غوث و قطب کا یہ معاملہ اگر اتنا ہی اہم تھا جتنا کہ صوفیاء بیان کرتے ہیں، تو اول درجے کے محدثین امام مالک، بخاری اور مسلم کو بھی یہ روایات اپنی کتب میں بیان کرنا چاہیے تھیں۔ حدیث کے دوسرے درجے کی کتب ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور ابو داؤد میں ان میں سے کوئی روایت موجود نہیں ہے۔ استثنائی طور پر صرف ابو داؤد میں ایک ضعیف روایت بیان ہوئی ہے۔

تیسرے درجے کی کتب میں صرف مسند احمد میں چند روایات آئی ہیں۔ بقیہ روایتیں زیادہ تر ان محدثین کی کتب میں پائی جاتی ہیں، جو تصوف سے متاثر تھے اور ہر قسم کی رطب و یابس روایتیں اپنی کتب میں بغیر تحقیق کے درج کر لیا کرتے تھے۔ ان میں ابن عساکر (d. 571/1176)، ابن ابی الدنیا (d. 281/894)، طبرانی (208-360/821-918)، بیہقی (d. 458/1065) اور حکیم ترمذی (d. 320/932) شامل ہیں۔ یہ حکیم ترمذی، صحاح ستہ والے امام ابو عیسی ترمذی (d. 279/892) نہیں ہیں بلکہ ایک الگ شخصیت ہیں اور مشہور صوفی ہیں۔

ناقدین کہتے ہیں کہ ان روایتوں میں بھی زیادہ سے زیادہ یہ ملتا ہے کہ اللہ تعالی کے کچھ بندے ہیں جو نیک اور اچھے اخلاق کے مالک ہیں اور اللہ تعالی ان کی دعاؤں کو قبول فرماتا ہے۔ ان میں کہیں بھی یہ درج نہیں ہے کہ یہ لوگ کائنات کا نظام چلا رہے ہیں اور لوگوں کی مافوق

الاسباب طریقے سے مدد کرتے ہیں۔ پھر ان ضعیف احادیث میں بھی صرف ابدال کا ذکر ہے۔ ابدال کے علاوہ اہل تصوف غوث، قطب وغیرہ کے جو اعلیٰ ترین درجات بیان کرتے ہیں، ان کا کسی ضعیف روایت میں بھی ذکر نہیں ہے۔

اسائن منٹس

- اہل تصوف کے ہاں باطنی نظام حکومت کا جو تصور پایا جاتا ہے، اس کی بنیاد کیا ہے؟
- ابدال و اوتاد سے متعلق جو روایات، سیوطی نے بیان کی ہیں، ان کا اصول حدیث کی روشنی میں تنقیدی جائزہ لیجیے۔ ناقدین تصوف، ان روایات کو ماننے سے کیوں انکار کرتے ہیں؟

تعمیر شخصیت
آپ کے جذبات جو قابو سے باہر ہو جائیں، آپ کے دشمن ہیں۔ انہیں کنٹرول کرنا سیکھیے۔

---

[1] خواجہ ابو الفیض۔ روضۃ القیومیہ بحوالہ آسمانی جنت و درباری جہنم۔ ص154۔
[2] ابن عساکر، تاریخ دمشق بحوالہ جلال الدین سیوطی۔ الخبر الدال علی وجود القطب و الاوتاد و النجباء و الابدال۔
[3] ناصر الدین البانی۔ دیکھیے سلسلہ ضعیفہ، حدیث 1965
[4] البانی۔ سلسلہ صحیحہ، حدیث 1924
[5] فوائد الفوائد

باب 17: صوفیاء اور ناقدین تصوف کے متفرق اختلافات

اس باب میں ہم چند متفرق اختلافات کا جائزہ لیں گے جو ناقدین تصوف اور صوفیاء کے مابین موجود ہیں اور فریقین کے دلائل کا مختصر جائزہ لیں گے: مشاہدہ حق؛ غیر مسلموں سے لبرل تعلق؛موسیقی؛جہاد؛عملیات اور کرامتیں؛پیروکاروں کی کثرت؛صوفیاء اور اسلام کی تبلیغ؛صوفیاء اور نبوی کردار؛دنیادارانہ صوفیت۔

مشاہدہ حق

اہل تصوف کے ہاں ساری ریاضتوں کا مقصد "مشاہدہ حق" ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی کو براہ راست دیکھنا۔ یہ بعض صوفیاء کا نقطہ نظر ہے کہ اللہ تعالی کا دیدار اس دنیا میں ممکن ہے۔ یہ حضرات اسی خواہش میں زندگی بسر کرتے ہیں اور طویل عرصے تک چلے اور ریاضتیں کرتے ہیں تاکہ اللہ تعالی کا دیدار انہیں حاصل ہو جائے۔ اس کے برعکس صوفیاء کا دوسرا گروہ اس نقطہ نظر کا قائل ہے کہ اللہ تعالی کا دیدار دنیا میں ممکن نہیں ہے۔ یہ لوگ مشاہدہ حق سے مراد ایک ایسی کیفیت لیتے ہیں جہاں اللہ تعالی کے قائم کردہ انوار و تجلیات حالت کشف میں نظر آئیں اور انسان خود کو ہر دم اللہ تعالی کے حضور محسوس کرے۔

صوفیاء کے دوسرے گروہ پر ناقدین تصوف اعتراض نہیں کرتے مگر پہلے گروہ پر وہ تنقید کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ان کا نقطہ نظر غلط ہے کیونکہ اس دنیا میں اللہ تعالی کا دیدار ممکن نہیں ہے۔ اب ہم فریقین کے دلائل کا جائزہ لیتے ہیں:

ناقدین تصوف کے دلائل

ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ دین اسلام کی پوری دعوت ہی "ایمان بالغیب" کی دعوت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی کو براہ راست دیکھنے کی خواہش کے بغیر انسان کائنات میں غور و فکر اور تدبر کر کے ایمان لے آئے۔ دین میں کسی ایسے شخص کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی ہے جو مشاہدہ حق چاہتا ہو۔ مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

> انبیاء کی دعوت کی بنیادی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ ایمان بالغیب کی دعوت دیتے ہیں، وہ بلاتے ہی انہی لوگوں کو ہیں جو عقل و استدلال سے کام لینے، آفاق و انفس میں خدا کی جو نشانیاں ہیں، ان پر غور کرنے اور ان کے نتائج کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہوں، وہ ان لوگوں کو اپنی دعوت کے لیے بالکل بیکار سمجھتے ہیں جو تفکر و تدبر کی بجائے ہر حقیقت کے مشاہدہ و معائنہ کے طالب ہوں۔ جو لوگ غیب کا مشاہدہ کر لینے کے بعد اللہ کو ماننے اور اس سے ڈرنے کے لیے تیار ہیں، قرآن میں ایک جگہ بھی ایسے لوگوں کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی، نہ صرف یہ کہ ایسے لوگوں کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی ہے بلکہ اس دنیا میں مشاہدہ غیب کو حکمت الہی کے بالکل خلاف اور اس قسم کے ایمان کو بالکل غیر معتبر قرار دیا گیا ہے۔ اس دنیا میں اصلی آزمائش ہی یہی ہے کہ آدمی مشاہدہ غیب کے بغیر محض عقل و فطرت کی شہادت اور انبیاء کی گواہی کی بنا پر حق کو مانے اور اس کے

تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے جان و مال کی قربانیاں دے۔ اگر فی الواقع کوئی ایسا علم ہے جو غیب کے پردوں کو اٹھا دیتا ہے اور اس دنیا میں وہ انسانوں کو حاصل بھی ہو سکتا ہے، تو اس کے پانے کے سب سے زیادہ مستحق حضرات انبیائے کرام ہی ہو سکتے ہیں لیکن اللہ تعالی نے ان کو بھی اس علم سے آگاہ نہیں کیا، حالانکہ ان کی قوموں کی طرف سے برابر یہ مطالبہ رہا کہ وہ ایمان لانے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ ان کو غیب کا مشاہدہ کرا دیا جائے، لیکن اللہ تعالی کی طرف سے ان کو یہ جواب ملا کہ اس دنیا میں غیب کا مشاہدہ اللہ تعالی کی حکمت کے خلاف ہے۔ پھر کس طرح ممکن ہے کہ جو چیز انبیاء کو نہیں عطا کی گئی اور جس کا دیا جانا حکمت الہی کے خلاف قرار دیا گیا، وہ صوفیوں کو حاصل ہو گئی؟[1]

ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل نے مشاہدہ حق کی کوشش کی تھی جس پر اللہ تعالی نے ان پر شدید عتاب فرمایا۔ قرآن مجید میں ہے:

وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَى لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّى نَرَى اللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمْ الصَّاعِقَةُ وَأَنْتُمْ تَنظُرُونَ (55) ثُمَّ بَعَثْنَاكُمْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (56)

یاد کرو [اے بنی اسرائیل!] جب تم نے کہا: اے موسی! ہم تو ہرگز اس وقت تک آپ پر ایمان نہ لائیں گے جب تک کہ اللہ کو کھلے عام نہ دیکھ لیں۔ تو تمہارے دیکھتے ہی دیکھتے تمہیں آسمانی بجلی نے آ پکڑا۔ پھر ہم نے تمہیں تمہاری موت کے بعد دوبارہ اٹھا کھڑا کیا تاکہ تم شکر گزار ہو۔ (البقرۃ)

اس کے جواب میں اہل تصوف کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل نے محض ضد میں اللہ تعالی کے دیدار کی خواہش کی تھی جس کی وجہ سے اللہ تعالی کا عتاب ہوا جبکہ ہم تو اللہ تعالی کی محبت میں ایسا کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ اللہ تعالی کی محبت میں بھی ایسا نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ ممکن نہیں ہے۔ کوئی صوفی، اللہ تعالی کے جلیل القدر پیغمبر، سیدنا موسی علیہ الصلوۃ والسلام سے بڑھ کر اللہ تعالی سے محبت تو نہیں کر سکتا۔ انہوں نے جب مشاہدہ حق کی خواہش کا اظہار کیا تو اللہ تعالی کا جواب یہ تھا:

وَلَمَّا جَاءَ مُوسَى لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهُ رَبُّهُ قَالَ رَبِّ أَرِنِي أَنظُرْ إِلَيْكَ قَالَ لَنْ تَرَانِي وَلَكِنْ انظُرْ إِلَى الْجَبَلِ فَإِنْ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَرَانِي فَلَمَّا تَجَلَّى رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكّاً وَخَرَّ مُوسَى صَعِقاً فَلَمَّا أَفَاقَ قَالَ سُبْحَانَكَ تُبْتُ إِلَيْكَ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُؤْمِنِينَ.

جب موسی ہمارے طے کردہ مقام پر آئے اور اپنے رب سے انہوں نے بات کی تو بولے: "یارب! مجھے اپنا دیدار کروا دے، میں تجھے دیکھنا چاہتا ہوں۔" فرمایا: "تم مجھے ہرگز نہ دیکھ سکو گے۔ ہاں اس پہاڑ کی طرف دیکھو، اگر یہ اپنے مقام پر کھڑا رہ گیا تو شاید تم مجھے دیکھ سکو۔" جب ان کے رب نے اس پہاڑ پر تجلی فرمائی تو وہ ریزہ ریزہ ہو گیا اور موسی دہشت کے مارے گر پڑے۔ جب انہیں افاقہ ہوا تو عرض کیا: "[اے اللہ!] تو پاک ہے، میں نے تیری جانب توبہ کی اور میں سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں سے ہوں۔" (الاعراف 7:143)

ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالی کا حجاب نور ہے۔

حدثنا أبو بكر بن أبي شيبة وأبو كريب. قالا: حدثنا أبو معاوية. حدثنا الأعمش عن عمرو بن مرة، عن أبي عبيدة، عن أبي موسى، قال: قام فينا رسول الله صلى الله عليه وسلم بخمس كلمات. فقال: "إن الله عز وجل لا ينام ولا ينبغي له أن

ينام. يخفض القسط ويرفعه. يرفع إليه عمل الليل قبل عمل النهار. وعمل النهار قبل عمل الليل. حجابه النور. (وفي رواية أبي بكر: النار) لو كشفه لأحرقت سبحات وجهه ما انتهى إليه بصره من خلقه".

سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہمارے مابین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے کو پانچ باتیں ارشاد فرمائیں: "یقیناً اللہ عزوجل نہ تو سوتا ہے اور نہ ہی یہ اس کی شان کے لائق ہے کہ وہ سوئے۔ وہی میزان اعمال کو جھکاتا اور بلند کرتا ہے۔ رات کا عمل دن سے پہلے اور دن کا عمل رات سے پہلے اس کی جانب بلند کیا جاتا ہے۔ اس کا حجاب نور ہے (ابو بکر کی روایت میں آگ کا لفظ ہے)۔ اگر وہ اس کا پردہ ہٹا دے، تو اس کے وجہ مبارک کی شعاعیں اس کی مخلوق کو حد نگاہ تک جلا دیں۔" (مسلم، کتاب الایمان، حدیث 293)

اہل تصوف کے دلائل

وہ صوفیاء جو کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کے دیدار کے قائل ہیں، اس ضمن میں قرآن و سنت سے کوئی دلیل پیش نہیں کرتے بلکہ اپنے کشف کو بطور دلیل بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے کشف میں خود اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا، اور اس سے گفتگو کی، پھر انہیں کسی اور دلیل کی کیا ضرورت ہے؟

اس کے جواب میں ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ کشف کوئی لائق اعتماد ذریعہ نہیں ہے۔ دین اسلام میں صرف اور صرف انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کی وحی ہی قابل اعتماد ذریعہ ہے جس کو جاننے کا واحد ذریعہ قرآن و سنت ہیں۔ اگر کسی کو کشف میں کچھ انوار و تجلیات نظر آئے ہیں، تو ضروری نہیں ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوں یا معاذ اللہ یہ بذات خود اللہ تعالیٰ کے انوار و تجلیات ہوں۔ کشف خواب کی طرح محض ایک نفسیاتی تجربہ ہے جو بذات خود دلیل نہیں بن سکتا ہے۔

غیر مسلموں سے لبرل تعلق

بعض شدت پسند ناقدین تصوف یہ کہتے ہیں کہ صوفیاء غیر مسلموں سے گہرے تعلقات رکھتے ہیں، انہیں اپنی مجلسوں میں بلاتے ہیں، خود ان کے ہاں جاتے ہیں اور ان سے اچھا سلوک کرتے ہیں۔ یہ مداہنت ہے، جو کہ غلط ہے۔ اس کے جواب میں صوفیاء کا موقف یہ ہے کہ یہ مداہنت نہیں بلکہ مدارات ہے۔ اگر ہم غیر مسلموں سے اچھا سلوک نہیں کریں گے تو ان کے سامنے اسلام کی دعوت کیسے پیش کریں گے؟ اس موضوع پر تفصیلی بحث ہم ماڈیول CS06 میں "غیر مسلموں سے تعلق" کے باب میں کریں گے۔ جو حضرات اس موضوع پر فریقین کے دلائل کا مطالعہ کرنا چاہیں، وہ وہاں پر کر سکتے ہیں۔

موسیقی

صوفیاء کے ہاں سماع کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ سماع کا مطلب یہ ہے کہ اشعار کو گا کر لوگوں کو اس طریقے سے سنایا جائے کہ وہ اس نغمے میں مدہوش ہو جائیں۔ برصغیر میں اس سماع نے قوالی کی حیثیت اختیار کر لی ہے جبکہ وسط ایشیا اور ترکی میں یہ سماع "گردشی

رقص" کی صورت میں ہوتا ہے۔ بعض صوفیاء جیسے امیر خسرو (650-725/1253-1325) کو کئی سازوں کا موجد بتایا جاتا ہے۔

ناقدین تصوف کے سماع پر اعتراضات دو ہیں: ایک تو یہ کہ قوالی وغیرہ میں شرکیہ اشعار ہوتے ہیں اور غیر اللہ سے مافوق الاسباب طریقے سے مدد مانگی جا رہی ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ سماع میں سازوں والی موسیقی ہوتی ہے۔ غیر اللہ سے مدد مانگنے کے موضوع پر ہم تفصیل سے ماڈیول CS02 میں گفتگو کر چکے ہیں جبکہ موسیقی سے متعلق ماڈیول CS07 میں تفصیلی بحث ہو گی۔ اس بحث کا مطالعہ متعلقہ ابواب میں کیا جا سکتا ہے۔

جہاد

ناقدین تصوف کا ایک اور اعتراض یہ بھی ہے کہ صوفیاء نے جہاد اسلامی کی روح کو ختم کر کے مسلمانوں کو چلوں، مراقبوں اور ریاضتوں میں لگا دیا اور انہیں جہاد سے دور کر دیا۔ اس الزام کی پابند شریعت صوفیاء سختی سے نفی کرتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ صوفیاء نے کبھی جہاد کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کی اور نہ ہی کبھی اپنے مریدین کو جہاد کرنے سے روکا ہے۔ اس کے برعکس بہت سے صوفی ایسے ہیں جنہوں نے مسلمانوں کی تاریخ میں مسلح تحریکیں برپا کی ہیں۔ اس ضمن میں وہ یہ مثالیں پیش کرتے ہیں:

- محمود غزنوی (reign 387-421/997-1030) کو برصغیر پر حملوں میں افغانستان کے صوفیاء کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔ بعض صوفیاء یہ دعوی کرتے ہیں کہ محمود خود ایک صوفی شیخ کا مرید تھا جنہوں نے اس کی کامیابی کے لیے دعائیں کی تھیں۔
- شہاب الدین غوری (reign 598-602/1202-1206) نے جب ہندوستان پر حملہ کیا تو اس کے لشکر میں خواجہ معین الدین چشتی (535-627/1141-1230) بھی شامل تھے اور شریک جنگ تھے۔
- وسط ایشیا (موجودہ ترکمانستان) میں شیخ نجم الدین کبری (d. 616/1220) ایک بڑے صوفی بزرگ تھے جنہوں نے جنگ میں اپنی زندگی گزاری تھی۔ موصوف "کبرویہ سلسلہ" کے بانی تھے۔
- چیچنیا میں مشہور صوفی امام شامل (1797-1871) نے روسی اقتدار کے خلاف جنگ جاری رکھی اور بالآخر گرفتار ہوئے۔ روسی حکمرانوں نے انہیں موت کی سزا سنائی۔
- انیسویں صدی کے اوائل میں لیبیا میں سید محمد بن علی السنوسی (1787-1859) کی قیادت میں صوفیاء نے سنوسی تحریک برپا کی جس نے طویل عرصے تک اٹلی کے خلاف جنگ شروع کی۔
- سوڈان میں مہدی سوڈانی (1843-1885)، جن کا تعلق سنوسی سلسلہ سے تھا، کی صوفی تحریک نے انیسویں صدی کے نصف آخر میں ترکوں کے خلاف جنگ کی۔

- برصغیر میں اکبر بادشاہ (reign 963-1013/1556-1605) کے دین الٰہی کے خلاف ایک صوفی بزرگ شیخ احمد سرہندی (971-1034/1564-1624) نے پر امن طریقے سے جہاد کیا۔
- برصغیر میں مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی قوت کو ختم کرنے کے لیے شاہ ولی اللہ (1703-1762) نے افغانستان کے بادشاہ احمد شاہ ابدالی (1186/1773) کو ہندوستان پر حملہ کی دعوت دی اور اسے بھرپور مالی، جانی اور اخلاقی حمایت فراہم کی۔ ان کی مدد سے احمد شاہ ابدالی نے 1761 میں پانی پت کی تیسری جنگ میں مرہٹوں کو شکست دے کر ان کی قوت کو توڑ دیا۔ ابدالی کو شاہ صاحب اور ان کے مریدین کی مکمل حمایت حاصل تھی۔
- شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ اسماعیل (1779-1831) اور ان کے مرشد سید احمد بریلوی (1786-1831) نے سکھوں کے خلاف جہاد کیا اور بالاکوٹ میں جاں بحق ہوئے۔ ان دونوں کو دیوبندی صوفیاء اپنا اکابر مانتے ہیں۔
- دیوبندی صوفی، مولانا محمود الحسن (1851-1920) اور ان کے مریدین نے انگریزوں کے خلاف ایک خفیہ بغاوت منظم کی جو کہ "تحریک ریشمی رومال" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ تحریک ناکام رہی اور مولانا کو کالے پانی کی سزا سنائی گئی۔
- موجودہ دور میں تحریک طالبان بھی دیوبندی صوفیاء کے گروہ سے تعلق رکھتی ہے۔

صوفیاء کا کہنا یہ ہے کہ ان پر جہاد نہ کرنے کا الزام غلط ہے۔ اوپر دی گئی مثالیں ظاہر کرتی ہیں کہ صوفیاء رات کے راہب اور دن کے سپاہی ہوا کرتے تھے۔

اسی موضوع سے متعلق ایک بحث یہ بھی ہے کہ جہاد کیا ہے؟ اس کے حدود و شرائط کیا ہیں اور مذکورہ بالا تحریکوں نے کس حد تک ان حدود اور شرائط کی پابندی کی ہے۔ اس پر تفصیلی بحث ہم ماڈیول CS06 میں کریں گے جہاں ہم اس ضمن میں مختلف فریقوں کے دلائل پیش کریں گے۔

عملیات اور کرامتیں

موجودہ دور کے اکثر صوفیاء کے ہاں عملیات کا بہت زور ہے۔ تعویذ دینا، دم کرنا، جن نکالنا اور اس قسم کے بہت سے افعال ہیں جو اہل تصوف کے ہاں سر انجام دیے جاتے ہیں۔ اس معاملے میں پابند شریعت صوفیاء کا نقطہ نظر یہ ہے کہ عملیات کا تصوف سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ ایک عام دنیاوی فن ہے اور بعض صوفی اسے اس لیے سیکھ لیتے ہیں کہ اس کی مدد سے جادو کا توڑ کیا جا سکے اور لوگوں کے مسائل حل کر کے خدمت خلق کی جا سکے۔ اس طریقے سے وہ لوگوں کی تکلیفیں دور کرتے ہیں جو کہ ثواب کا کام ہے۔

ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ انہیں جادو کے توڑ کے لیے عملیات پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اس کے لیے ان صوفیاء کو چاہیے کہ وہ

واضح طور پر بتائیں کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں، اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ محض ایک دنیاوی فن ہے جسے مسلم و غیر مسلم کوئی بھی سیکھ سکتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اہل تصوف ان عملیات کی مدد سے کرشمے اور کرامتیں دکھاتے ہیں اور انہیں اپنی بزرگی ثابت کرنے کے بطور ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اس طرح وہ لوگوں پر دھاک بٹھا کر ان پر اپنا سکہ جما لیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لوگ ان کے معتقد ہو کر ان کے نفسیاتی غلام بن جاتے ہیں۔ ناقدین کا یہ اعتراض بھی تمام صوفیاء پر نہیں بلکہ صرف انہی مخصوص صوفیاء پر ہے جو کہ یہ کام کرتے ہیں۔

بعض صوفیاء کا کہنا یہ ہے کہ علم الاعداد اور تعویذ دھاگوں کے کاروبار کو صوفیاء میں باطنیوں نے داخل کیا تھا۔ یہاں ہم صوفی بزرگ پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب کی کتاب سے کچھ تفصیل بیان کر رہے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معاملے کی نوعیت کیا تھی:

> چونکہ باطنیہ کے تمام بنیادی عقائد [Basic doctrines] قرآنی تعلیمات کے خلاف ہیں، اس لیے انہوں نے سب سے زیادہ توجہ اس بات پر مبذول کی کہ جس طرح ہو سکے، اہل سنت کو قرآن سے بیگانہ بنا دیا جائے، تاکہ وہ غیر قرآنی عقائد کو قبول کر سکیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ تصوف کا لباس زیب تن کیا اور صوفی بن کر اپنے عقائد عوام اہل سنت میں شائع کر دیے۔ دوسرا کام یہ کیا کہ علم الاعداد ایجاد کر کے اسے حضرت علی [رضی اللہ عنہ] سے منسوب کر دیا۔ ہر عدد کو خاص تاثیر کا حامل قرار دیا اور تعویذ و طلسم لکھ کر عوام میں تقسیم کرنا شروع کیے۔ اس طرح عوم ان کے معتقد ہو گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ قرآنی آیات کے نقوش مرتب کیے اور ان سے غیر معمولی فوائد منسوب کر دیے۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد تصوف اور تعویذ لازم و ملزوم ہو گئے۔ صحابہ کرام قرآنی آیات پر عمل کرتے تھے اور ان باطنی صوفیوں کے زیر اثر کر مسلمانوں نے قرآنی آیات کو لکھ کر گلے میں ڈالنا شروع کر دیا۔
>
> جو قرآن مجید تہران سے 1337ھ خورشیدی میں شائع ہوا ہے، اس میں بہت سے نقوش بھی درج کیے گئے ہیں۔ چنانچہ صفحہ 108 پر یہ عبارت مرقوم ہے: [ترجمہ:" خاتم المجتہدین شیخ بہاؤالدین عاملی سے منقول ہے کہ اگر عمر میں ایک بار بھی اس نقش کی جانب نظر کی جائے تو ایسے شخص پر دوزخ کی آگ حرام ہو جائے گی۔"]
>
>
>
> میں نے افادہ عام کے لیے یہ شکل بجنسہ نقل کر دی ہے۔ اس نوعیت کے نقوش اس قرآن کے صفحہ 102 سے صفحہ 110 تک کثیر تعداد میں درج کیے گئے ہیں۔ میں اس قدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جب نقش مرقومہ بالا کے صرف ایک مرتبہ دیکھ لینے سے دوزخ حرام ہو جائے گی تو قرآن مجید کی تلاوت یا اس کے سمجھنے کی کیا ضرورت باقی رہ گئی۔
>
> رفتہ رفتہ مسلمان اس طلسم میں گرفتار ہو گئے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک کتاب نظر سے گزری جس کا نام دار النظیم ہے۔ یہ کتاب امام الفن عبداللہ بن یافعی الیمنی کی تصنیف ہے اور مطبع نول کشور لکھنؤ سے 1885 میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں صفحہ 61 پر "اسم اعظم" بایں صورت
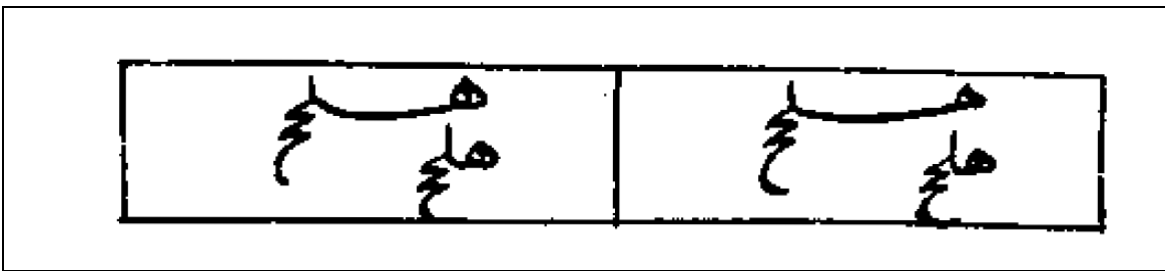
مرقوم ہے:
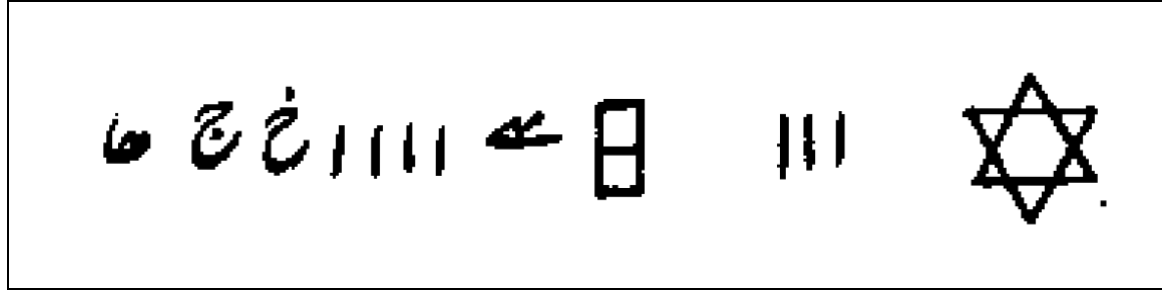
اس کے ساتھ ایک نظم بھی لکھی ہے جسے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منسوب کر دیا ہے۔ صفحہ 126 پر بضمن خواص سورہ نور یہ عبارت مرقوم ہے جسے میں بجنسہ نقل کیے دیتا ہوں۔۔۔

من كتبها و جعلها في فراشه الذي ينام فيه لم يحتلم أبدا وإن كتبف بماء زمزم وشربها انقطع عنه شهوة الجماع وإن جامع لم يجد لذته.

[ترجمہ: جس نے اسے لکھ کر اپنے اس بستر میں رکھ لیا، جس پر وہ سونے لگا ہے، تو اسے کبھی احتلام نہ ہو گا اور اگر وہ اسے آب زمزم سے لکھ کر پی لے گا، تو اس سے جنسی خواہش مکمل طور پر ختم ہو جائے گی۔ اگر وہ جنسی عمل کرے گا بھی تو لطف اندوز نہ ہو گا۔]

غالباً یہ مصرعہ انیس کا ہے۔ "دل صاحب اولاد سے انصاف طلب ہے۔" میں اس میں قدرے تغیر کر کے کہتا ہوں۔

دل صاحب ایمان سے انصاف طلب ہے۔۔۔۔ قرآن سے یہ دل لگی! اف کیسا غضب ہے

قرآن حکیم پر یہ ظلم تو شاید کافروں نے بھی نہیں کیا ہو گا جو اس امام الفن نے کیا۔ بہر حال باطنی اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ آج مسلمانوں میں قرآن کی جو حیثیت رہ گئی ہے، اسے اقبال کے لفظوں میں بیان کرتا ہوں۔

بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست۔۔۔۔ کہ از یاسین او آسان بمیری[2]

[ترجمہ: قرآن کی آیات کا اس کے سوا اور اب کوئی کام نہیں رہ گیا ہے کہ موت کے وقت کی سختیاں سورۃ یاسین پڑھ کر دور کی جاتی ہیں۔]

علامہ اقبال کی نظم میں یہ اشعار ہیں:

بہ بند صوفی و ملا اسیری۔۔۔۔ حیات از حکمت قرآن نگیری

بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست۔۔۔۔ کہ از یاسین او آسان بمیری (پیام مشرق)

ترجمہ: تم صوفی اور ملا کی قید میں بند ہو۔ حکمت قرآنی سے تم زندگی نہیں لیتے۔ قرآن کی آیات کا اس کے سوا اور اب کوئی کام نہیں رہ گیا ہے کہ موت کے وقت کی سختیاں سورۃ یاسین پڑھ کر دور کی جاتی ہیں۔

چشتی صاحب نے اسم اعظم کو جو نقش دیا ہے، اس میں ڈیوڈ اسٹار بھی موجود ہے جو کہ یہودیوں کا قومی نشان ہے۔ 1885 میں جب یہ کتاب شائع ہوئی ہو گی تو ہندوستان میں شاید ہی کسی کو اس بات کا علم ہو گا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح غیر محسوس طریقے سے

یہودی کبالہ، مسلم تصوف کے اندر شامل ہو گیا۔ اسی طرح عیسائیوں کے بعض عملیات جیسے اصحاب کہف کے ناموں پر مشتمل تعویذ مسلم صوفیاء نے اپنا لیے۔ ہندوؤں کے جنتر منتر تو ویسے ہی تعویذوں کا حصہ رہے ہیں۔

اس میں سب سے دلچسپ چیز علم الاعداد ہے جو کہ یہودی کبالہ سے مسلم تصوف میں داخل ہوا۔ عبرانی کی طرح عربی کے ہر حرف کو ریاضیاتی قدر (Arithmatic Value) دی گئی ہے۔ مثلاً الف کا عدد 1 ہے، 'ب' کا 2، 'ج' کا 3، 'ک' کا 20، اور 'ذ' کا 1000۔ کسی آیت کریمہ یا کسی لفظ میں موجود تمام حروف کے اعداد کو جمع کر کے ان کے اعداد نکالے جاتے ہیں۔ مشہور ہے کہ "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے اعداد کا مجموعہ 786 ہے۔ ہندوستانی تصوف کے زیر اثر یہ تصور اس درجے میں پھیلا کہ ایک زمانے میں تعویذات تو ایک طرف، کتابوں اور دیواروں پر بھی بسم اللہ کی جگہ اس عدد کو دے دی گئی۔ جب بچوں یا کتابوں کے نام رکھے جاتے تو اس میں بھی علم الاعداد کا خاص اہتمام ہوا کرتا تھا۔

کرامات

صوفیاء کے تذکروں میں متعدد بزرگوں کی ایسی کرامات ملتی ہیں جن میں کبھی وہ مردوں کو زندہ کرتے نظر آتے ہیں، کبھی سورج کو زمین کے قریب کر کے گوشت بھون لیتے ہیں، کبھی ہوا میں پرواز کرتے ہیں تو کبھی پانی پر چلتے ہیں، پلک جھپکنے میں زمین کے ایک کونے سے دوسرے پر پہنچ جاتے ہیں اور کبھی پانچ وقت کی نماز ادا کرنے کے لیے ہر نماز کے وقت ہزاروں کلومیٹر کا سفر کر کے حرم شریف پہنچ جاتے ہیں۔

ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ بعض صوفیاء نے تعویذ دھاگوں کے فن کے ساتھ ساتھ ہپناٹزم، ٹیلی پیتھی اور اس طرز کے دیگر نفسی علوم سیکھ لیے اور اس کی مدد سے کرشمے اور کرامات دکھانے لگے۔ صوفیاء کے تذکروں پر مشتمل کسی بھی کتاب کو دیکھا جائے تو ہر ہر صوفی سے منسوب درجنوں کرامات ملتی ہیں۔ اگر کوئی شخص موجودہ دور میں کسی بھی صوفی حلقے میں اٹھنا بیٹھنا اختیار کرے تو مریدین اپنے مرشد کی ڈھیروں کرامات سنا کر اسے پہلے متاثر کرتے ہیں اور پھر اسے ان بزرگ کی بیعت ہونے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اکثر صوفی حلقوں میں اپنے مرشد کی کرامات کا بھرپور پروپیگنڈا کیا جاتا ہے۔

پابند شریعت صوفیا کا کہنا ہے کہ کرامت، ولایت کا معیار نہیں ہے۔ وہ اکثر حضرت جنید بغدادی (214-297/830-910) کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ اگر تم کسی کو پانی پر چلتا یا ہوا میں اڑتا دیکھ لو تو اسے ولی مت سمجھو حتی کہ یہ نہ دیکھ لو کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر کس حد تک عمل کرتا ہے۔ عام صوفیاء کا موقف یہ ہے کہ اولیاء اللہ کی کرامات برحق ہیں۔ جیسے اللہ تعالی انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کو معجزے عطا کرتا ہے، ویسے ہی اپنے نیک بندوں کے ہاتھوں کرامات دکھا دیتا ہے۔ وہ اس ضمن میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بعض کرامات کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس طرح غیر صحابی ولی بھی کرامت دکھا سکتا ہے۔

اس کے جواب میں ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ وہ کرامت کے منکر نہیں ہیں۔ ایسا عین ممکن ہے کہ اللہ تعالی اپنے کسی نیک بندے کے

ساتھ کوئی خلاف عادت واقعہ کر دے۔ مسئلہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ ایسے واقعات شاذ و نادر ہی پیش آئے تھے۔ علامہ عبدالرحمن کیلانی (d. 1995) لکھتے ہیں:

> تو ایسے واقعات کبھی کبھار پیش آتے ہیں۔ روزانہ معمول کی بات نہیں ہوتی۔ چنانچہ پورے دور صحابہ کرام میں ایسی کرامات کی دس بارہ سے زیادہ مثالیں نہیں ملتیں۔ اب دیکھیے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد حجۃ الوداع کے موقع پر ایک لاکھ چوبیس ہزار کے لگ بھگ تھی، جو وہاں موجود تھے اور وفات نبوی کے وقت صحابہ کی کل تعداد چار لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ پھر یہ دور صحابہ بھی پوری ایک صدی یعنی 110 ہجری تک پھیلا ہوا ہے مگر ایسے واقعات صرف دس بارہ ہیں۔ پھر ان میں سے بھی بعض کی صحت محل نظر ہے۔ صحاح ستہ میں صحابہ کی کرامات علیحدہ عنوان کے تحت مذکور نہیں۔ خطیب بغدادی [مصنف کا نام غلط ہے، اصل مصنف خطیب تبریزی ہیں] نے آٹھویں صدی میں مشکوۃ المصابیح کو مرتب کیا تو اس میں علیحدہ باب الکرامات کا اندراج کیا۔ یہ کل بارہ واقعات ہیں جو حدیث کی درجہ اول، دوم، سوم اور چہارم سب قسم کی کتابوں سے اکٹھے کیے گئے ہیں۔ واضح رہے کہ اول درجہ کی کتب بخاری اور مسلم ہیں۔ دوم درجہ کی باقی صحاح ستہ کی چار کتابیں۔ باقی کتب احادیث کی روایات علی قدر مراتب سوم اور چہارم درجہ کی شمار ہوتی ہیں۔ درجہ سوم اور چہارم کی بیشتر احادیث ناقابل اعتماد و احتجاج ہیں۔[3]

اس کے بعد کیلانی صاحب نے انہی بارہ روایات کو بیان کیا ہے جن میں سے صرف چھ روایات صحاح ستہ میں ہیں اور بقیہ چھ تیسرے اور چوتھے درجے کی کتب میں اور سب کی سب ضعیف ہیں۔ کیلانی صاحب کا کہنا یہ ہے کہ سو سال تک کے عہد صحابہ میں گنتی کے چند واقعات ملتے ہیں جن پر کرامت کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف صوفیاء کے ملفوظات اور تذکروں کی ایک کتاب میں ایک ہی بزرگ کی کرامات پر مشتمل پورے پورے باب ہوتے ہیں جن میں ان صاحب کی بیسیوں کرامات بیان کی گئی ہوتی ہیں۔ یہ فرق کیوں ہے؟ کیا صوفیاء اللہ تعالیٰ کو صحابہ کرام سے بھی زیادہ پیارے تھے جو ان پر کرامات کی بھرمار کر دی گئی جبکہ صحابہ کرام کے ساتھ یہ معاملہ شاذ و نادر ہی پیش آیا؟

اس کے جواب میں بعض صوفیاء یہ کہتے ہیں کہ ایسا اس وجہ سے ہوا کہ عہد صحابہ میں لوگوں کی ایمانی حالت مضبوط تھی جس کی وجہ سے کرامات کی ضرورت ہی نہ تھی۔ بعد میں جب ایمان میں ضعف پیدا ہوا تو کرامات عطا ہوئیں تاکہ وہ ان کی مدد سے لوگوں کو دین کی طرف مائل کر سکیں۔

ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ اگر کرامت ہی بزرگی کا معیار ہے تو صحابہ کو بھی اس کی ضرورت تھی کیونکہ انہیں اپنے زمانے کی غیر مسلم قوموں کے سامنے دین کی دعوت کی پیش کرنا تھی۔ اگر انہیں کرامتیں مل جاتیں تو وہ بہت جلد ہی ان لوگوں کو دین کی طرف مائل کر لیتے لیکن ایسا نہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی بنیادی دعوت ہی علم و عقل کے مسلمات پر مبنی ہے۔ انہوں نے جن اقوام کے سامنے دین کی دعوت پیش کی، ان کی صرف عقل ہی کو اپیل کیا، کوئی کرشمے یا کرامات دکھا کر انہیں اسلام کی طرف کبھی مائل نہ کیا۔

صوفیاء اور اسلام کی تبلیغ

اہل تصوف یہ کہتے ہیں کہ دنیا بھر میں اسلام کی تبلیغ کا سہرا صوفیاء کے سر ہے۔ یہی وہ نفوس قدسیہ ہیں جن کی مدد سے بے شمار غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا۔ انہوں نے عوامی خدمت، محبت اور خلوص کے ساتھ غیر مسلموں کو اکٹھا کیا اور ان تک اسلام کا پیغام پہنچایا۔ برصغیر جنوبی ایشیا میں تو اسلام کی تبلیغ صوفیاء ہی نے کی۔

اس کے جواب میں ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ یہ تصور درست نہیں کہ اسلام کی تبلیغ کا پورا کریڈٹ صوفیاء کو دے دیا جائے۔ صوفیاء کی برصغیر میں آمد محمود غزنوی (reign 387-421/997-1030) کے دور میں شروع ہوئی جبکہ اسلام اس سے کہیں پہلے ہندوستان میں آ چکا تھا۔ ایک جانب جنوبی ہند میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے سے ہی عرب تاجروں کی آمد و رفت جاری تھی جنہوں نے خاص کر کیرالہ اور سری لنکا میں اسلام پہنچایا۔ دوسری جانب محمد بن قاسم (715-96/695-75) کی افواج کے ساتھ بہت سے تابعین سندھ میں داخل ہوئے جنہوں نے اسلام کی تبلیغ کی۔ محمد بن قاسم نے 93/712 میں محمود غزنوی کے حملوں سے تین سو برس پہلے سندھ فتح کر لیا تھا اور غیر صوفی علماء بکثرت ہندوستان میں آنے جانے لگے تھے۔

ناقدین یہ تسلیم کرتے ہیں کہ پنجاب اور وسطی ہندوستان میں صوفیاء نے اسلام کی تبلیغ کی تاہم ان کا کہنا یہ ہے کہ صوفیاء نے اسلام کی خالص تصویر پیش کرنے کی بجائے اس میں تصوف کی بدعات شامل کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان علاقوں کے مسلمانوں میں قبر پرستی، شخصیت پرستی، غیر اللہ سے مدد مانگنا اور اس کے علاوہ بے شمار ہندوانہ رسوم پائی جاتی ہیں۔ اہل تصوف کے نزدیک تمام روحانی سرگرمیوں کا مرکز کسی بزرگ کا مزار ہوتا ہے جس کا ڈیزائن بڑی حد تک ہندوؤں کے مندروں سے ملتا ہے۔ فرق بس یہ ہوتا ہے کہ اندر مورتی کی بجائے قبر ہوتی ہے۔ اسی طرح پنجاب و سندھ میں بیٹیوں کو وراثت میں حصہ نہ دینا، قرآن سے شادی، غیرت کے نام پر قتل وغیرہ جیسی غیر اسلامی رسوم بڑے پیمانے پر مسلمانوں میں موجود ہیں اور یہ سب وہی مسلمان ہیں جو مزار پرستی میں سب سے آگے ہیں۔

ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ شرک و بدعات میں ملوث ہونے میں جنوبی اور شمالی ہند کے مسلمانوں میں یہ فرق واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ جنوبی ہند کے لوگ جو عرب تاجروں کے ہاتھوں مسلمان ہوئے، شرک و بدعت سے بڑی حد تک اب بھی اجتناب کرتے ہیں جبکہ شمالی اور وسطی ہند کے مسلمان ان میں مبتلا ہیں۔

قبر پرستی، شخصیت پرستی، غیر اللہ سے مدد اور اس سے متعلق دیگر رسوم کے بارے میں تفصیلی بحث ہم ماڈیول CS02 میں کر چکے ہیں۔ جو قارئین اس موضوع پر فریقین کے دلائل کا مطالعہ کرنا چاہیں، وہ وہاں یہ دلائل دیکھ سکتے ہیں۔

صوفیاء اور نبوی کردار

بعض صوفیاء کے ہاں یہ دعوی کیا جاتا ہے کہ کوئی ان کے بزرگوں پر تنقید نہ کرے اور ان کی نافرمانی کا خیال بھی دل میں نہ لائے، ورنہ سخت نقصان اٹھائے گا۔ اس کی بعض مثالیں یہ ہیں:

- لاہور کے گوالوں میں یہ تصور عام موجود ہے کہ اگر وہ ہر مہینے کی گیارہویں کو دودھ حضرت علی ہجویری (c. 379-465/990-1072) کے مزار پر نذر نہ کریں گے تو ان کی بھینسوں کے تھنوں میں خون آنے لگے گا۔
- ایک صوفی بزرگ خواجہ علاؤ الدین صابر کلیری (592-690/1196-1291) کے بارے میں "حدیقۃ الاولیاء" میں درج ہے کہ ایک مسجد کے بعض لوگوں نے ان سے گستاخی کی تو انہوں نے مسجد کو گر جانے کا حکم دیا جس سے عین نماز کی حالت میں مسجد کی چھت آ گری اور وہ سب لوگ ہلاک ہو گئے۔
- شیخ عبد القادر جیلانی (470-561/1077-1166) کی خانقاہ کے اوپر سے ایک شخص جو ابدال کے درجے پر فائز تھا، پرواز کرتا گزر گیا تو اس بے ادبی کی پاداش میں اسے بری طرح زخمی کر دیا گیا۔

اس قسم کی ہزاروں مثالیں ہیں جو صوفیاء کے تذکروں میں ملتی ہیں۔ ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ یہ واقعات ان بزرگوں کی طرف غلط منسوب ہیں کیونکہ اس معاملے میں ان کا کردار نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کردار سے بالکل متضاد ہے۔ آپ کے ساتھ اہل مکہ گستاخی سے پیش آئے تو آپ نے ان کے دعا فرمائی۔ اہل طائف نے جب سنگباری کی اور اللہ تعالی نے جبرائیل علیہ السلام کو تباہی نازل کرنے کے لیے بھیجا تو آپ نے ان کے لیے بھی دعائیں فرمائیں۔ جنگ بدر میں قیدی بننے والے اہل مکہ کو آپ نے معاف فرما دیا۔ جب مکہ فتح ہوا تو آپ نے ان سب کو معاف کر دیا۔

پیروکاروں کی کثرت

اس معاملے میں اعتراض کا رخ الٹ ہے یعنی اعتراض ناقدین، صوفیاء پر نہیں کرتے بلکہ صوفیاء ناقدین پر کرتے ہیں۔ بعض صوفیاء اپنے ناقدین کو کہتے ہیں کہ وہ حق پر ہیں کیونکہ ان کے پیروکار کثیر تعداد میں ہیں جبکہ ان کے ناقدین کہیں کم ہیں۔ اس کے جواب میں ناقدین کہتے ہیں کہ تعداد کا حقانیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اب بھی دنیا میں غیر مسلم مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کے پیروکار ہمیشہ کم رہے ہیں۔ تعداد کی یہ زیادتی صرف انہی علاقوں ہی میں ہے جہاں تصوف کو فروغ حاصل ہوا ہے، عرب دنیا میں ایسا کچھ نہیں ہے۔

ناقدین کہتے ہیں کہ اہل تصوف کے پیروکاروں کی کثیر تعداد کی وجوہات یہ ہیں:

- دنیادار قسم کے لوگ اپنی دنیاوی حاجتیں پوری کرنے کے لیے ان کے پاس دعاوغیرہ کے لیے جاتے ہیں۔ مزارات پر لوگوں کی کثرت کی وجہ بھی یہی ہے۔
- بہت سے لوگ مستقبل کی باتیں پوچھنے ان کے پاس جاتے ہیں۔
- بعض لوگ کرامتوں سے متاثر ہو کر صوفیاء کے پاس چلے جاتے ہیں۔
- بعض لوگ سستی نجات کے حصول کے لیے صوفیاء سے تعلق رکھتے ہیں تاکہ انہیں اچھے برے سبھی قسم کے اعمال کی آزادی مل سکے۔
- بہت سے پیروں کے ہاں بھرپور قسم کا پروپیگنڈا کام کرتا ہے جس میں ان کی قریبی مریدوں کا ایک پوراحلقہ ان کی صوفیت کی مارکیٹنگ کر رہا ہوتا ہے۔

ناقدین کہتے ہیں کہ ایسے لوگ جو خالصتاً تزکیہ نفس کے لیے صوفیاء کے پاس جاتے ہوں، بہت ہی کم ہیں۔

دنیادارانہ صوفیت

ناقدین تصوف کہتے ہیں کہ دور قدیم کے صوفیاء دنیا سے دوری اختیار کیا کرتے تھے اور اس کے لیے مجاہدات کرتے تھے۔ دور جدید کے صوفیاء کا معاملہ ان سے بالکل مختلف ہے۔ اس دور میں شاید ہی کوئی ایسا صوفی ہو جو ترک دنیا پر عمل پیرا ہو۔ اکثر صوفیاء بڑی بڑی کوٹھیوں میں رہتے ہیں، لمبی لمبی کاروں اور جیپوں میں گھومتے ہیں، شکاری کتے رکھتے ہیں، ان کے گھروں میں دنیا جہان کا ساز و سامان ہوتا ہے اور وہ اور ان کی اولادیں اپنے مریدین کی دولت پر عیش کرتے ہیں۔ پاکستان کے متعدد صوفی بڑے جاگیر دار بھی ہیں اور بعض صوفیاء بڑی انڈسٹری کے مالک ہیں۔ ترکی میں تقریباً سبھی بڑے اخبارات اور ٹی وی چینل صوفیاء یا ان کے مریدین ہی کی ملکیت ہیں۔

اس کے جواب میں صوفیاء کا کہنا یہ ہے کہ دنیا سے استفادہ کرنا برا نہیں ہے بلکہ بری بات یہ ہے کہ دنیا انسان کے دل میں آجائے۔ اس کے لیے وہ کشتی کی مثال دیتے ہیں جس کے اندر پانی آجائے تو وہ ڈوب جاتی ہے لیکن اس کے باہر پانی رہے تو وہ اس پر تیرتی رہتی ہے۔

ناقدین تصوف کا کہنا یہ ہے کہ صوفیاء کی یہ بات تو درست ہے کہ دنیا سے استفادہ کرنا برا نہیں ہے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترک دنیا اور رہبانیت سے منع فرمایا تھا۔ مسئلہ یہ ہے کہ صوفیاء اپنی محنت کی کمائی سے ایسا نہیں کرتے بلکہ مریدین کی دولت پر عیش کرتے ہیں۔ امیر مریدین تو کجا، غریب مریدین بھی حسب توفیق کچھ نہ کچھ ان کی نذر کرتے رہتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ لگژری کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ چیز اسلام تو کیا، دور قدیم کے تصوف کے بھی مخالف ہے۔

اسائن منٹس

- اس باب میں جن مسائل سے متعلق اہل تصوف اور ان کے ناقدین کا نقطہ نظر بیان کیا گیا ہے، ان کا ایک تقابلی چارٹ تیار کیجیے۔
- چند بڑے آستانوں پر جا کر ان کے پیر صاحبان کے ہاں دیکھیے کہ دنیادارانہ صوفیت سے متعلق ناقدین کی تنقید درست ہے یا نہیں۔
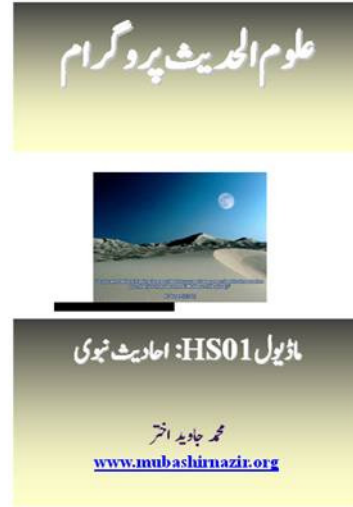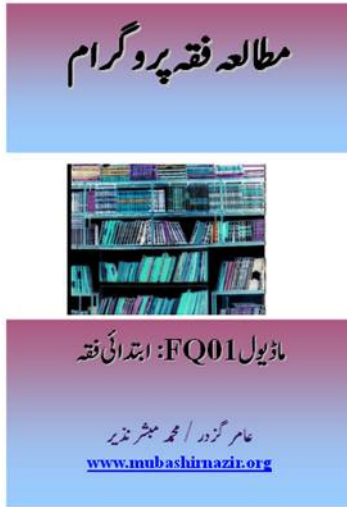
تعمیر شخصیت

نماز دین کا ستون ہے۔ کبھی نماز ترک نہ کیجیے۔

---

[1] امین احسن اصلاحی۔ تزکیہ نفس۔ جلد 1۔ ص 73۔

[2] یوسف سلیم چشتی۔ اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش۔ ص 116۔ لاہور: مرکزی انجمن خدام القرآن۔ http://www.tanzeem.org/books/indexbo.asp (ac. 13 Oct 2011)

[3] عبدالرحمن کیلانی۔ شریعت و طریقت۔ ص 398۔

باب 18: تصوف کی تاریخ: حصہ اول

تصوف کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ دنیا کے سبھی قدیم مذاہب کے ماننے والوں میں ایسے لوگ رہے ہیں جو دنیا کو ترک کر کے جنگلوں میں عبادت کرتے، چلوں اور مراقبوں میں اپنا وقت صرف کرتے، روحانیت کی تلاش میں سرگرداں رہتے اور پیری مریدی کا سلسلہ جاری رکھتے۔ ہندو اور بدھ مذاہب میں راہبوں، جوگیوں اور سنیاسیوں کو ایک خاص مقام حاصل ہے اور لوگ مذہبی جوش و جذبے کے ساتھ ان سے عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہود کے ہاں "کبالہ" کی صورت میں ایک پوری صوفیانہ روایت موجود ہے۔ عیسائیوں کے ہاں بھی رہبانیت کو ایک بہت بڑے سماجی ادارے کی حیثیت حاصل رہی ہے۔

مسلمانوں کے ساتھ بھی کم و بیش یہی معاملہ پیش آیا اور ان کے ہاں قرون وسطی سے لے کر اب تک تصوف کی ایک مضبوط روایت موجود رہی ہے۔ مسلمانوں کے تصوف کی اس تاریخ کو ہم چند ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ یہاں ہم ادوار کی جو تاریخیں دے رہے ہیں، یہ بالکل درست اور متعین نہیں ہیں کیونکہ تصوف کا ارتقاء ایک مسلسل عمل رہا ہے اور اسے متعین تاریخ کے ساتھ ادوار میں تقسیم کرنا ایک مشکل کام ہے۔ ان تواریخ میں دس بیس سال اوپر نیچے ہو سکتے ہیں۔

- پہلا دور: ابتدائی دور 1-200/622-815
- دوسرا دور: تصوف کا ارتقائی دور 200-350/815-961
- تیسرا دور: دور عروج 350-650/961-1252
- چوتھا دور: وجودی دور 650-1000/1252-1591
- پانچواں دور: شہودی دور یا دور اصلاح 1000-1266/1591-1850
- چھٹا دور: دور زوال 1270/1854 تا حال

ان میں سے پہلے تین ادوار کا مطالعہ ہم اس باب میں کریں گے اور بقیہ ادوار کا اگلے باب میں۔

پہلا دور: ابتدائی دور 1-200/622-815

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ سب سے بہترین دور خود حضور ہی کا زمانہ ہے، اس کے بعد آپ کے صحابہ کا، اس کے بعد ان لوگوں کو جو ان صحابہ کے ساتھ وابستہ رہے اور پھر ان لوگوں کا جو صحابہ کے تابعین کے شاگرد ہوئے۔

متعدد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہ میں ترک دنیا کے رجحانات پائے جاتے تھے۔ ان میں خاص کر سیدنا عثمان بن مظعون، عبداللہ بن عمرو بن عاص، ابوذر غفاری اور ابو درداء رضی اللہ عنہم نمایاں تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ترک دنیا کے ان رجحانات کی سختی سے مذمت فرمائی اور ان صحابہ کو اس سے روکا۔ سیدنا عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ تو جلد ہی وفات پا گئے۔ بقیہ صحابہ نے طویل عمر پائی۔ اہل تصوف، اصحاب صفہ کے بارے میں بھی یہی کہتے ہیں کہ وہ بھی صوفی تھے اور خود کو ان سے منسوب کرتے ہیں تاہم یہ واضح ہے کہ یہ حضرات کسب معاش میں حصہ لیا کرتے تھے اور جنگل سے لکڑیاں وغیرہ چن کر فروخت کر کے گزارا کرتے تھے۔ جیسے جیسے ان حضرات کی مالی حالت بہتر ہوتی چلی گئی، یہ صفہ سے نکل کر شادیاں کر کے اپنے گھر بساتے چلے گئے۔

جہاں تک دنیا کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کا تعلق ہے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس معاملے میں دین کے احکام کے عین مطابق دنیا میں اپنے حصے کو فراموش نہ کرتے تھے البتہ ان حضرات نے دنیا پرستی کبھی اختیار نہ فرمائی۔ سیدنا ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے دور خلافت میں جو معیار زندگی قائم کیا، اسے راہبانہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سرکاری خزانے سے کچھ رقم بطور خرچ لیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ میٹھا کھانے کا دل چاہا تو ان کی اہلیہ نے اسی رقم سے کچھ دن تک بچت کر کے حلوہ پکایا۔ انہیں جب اس کا علم ہوا تو انہوں نے اپنی تنخواہ کم کروا دی کہ اس میں بچت ممکن ہے۔ دور فاروقی میں قیصر روم کا سفیر مدینہ میں آیا تو وہ خلیفہ کا محل تلاش کرتا پھرا، مگر اسے محل کہاں ملتا، بمشکل اسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک درخت کے نیچے مٹی پر سوئے ہوئے ملے۔ یہی وجہ ہے کہ قیصر کے دربار میں اس کے ایک جاسوس نے مسلمانوں کا نقشہ یہ کھینچا کہ یہ لوگ دن میں مجاہد اور رات میں راہب ہوتے ہیں۔

سیدنا عمر اور عثمان رضی اللہ عنہما کے زمانے میں عراق، ایران، شام اور مصر کی زرخیز زمینیں فتح ہوئیں۔ یہ زمینیں بادشاہوں کی ملکیت تھیں جنہیں وہ مزارعت پر کاشت کرواتے تھے اور ان سے اپنے خزانے بھرتے تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے مشہور اجتہاد کے ذریعے ان زمینوں کو سرکاری ملکیت میں رکھا اور ان کی آمدنی کو تمام مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر کے ایک فلاحی ریاست کی بنیاد رکھی۔ اس کے علاوہ غیر آباد زمینیں مسلمانوں کو آباد کرنے کے لیے دی گئیں۔ اس سے بحیثیت مجموعی مسلمانوں کی مالی حالت بہتر ہو گئی مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی اگلی نسلوں میں دنیا پرستی کے کچھ رجحانات پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ عہد عثمانی ہی میں ہمیں سیدنا ابوذر غفاری اور ابو درداء رضی اللہ عنہما کی شخصیات ملتی ہیں جنہوں نے ان رجحانات پر کڑی تنقید کی۔

سیدنا علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما کے دور میں بھی کچھ ایسی ہی کیفیت رہی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں مسلمان دوبارہ متحد ہوئے اور اسلامی سلطنت مزید پھیلنے لگی جس سے مسلمانوں کی مالی حالت اور بہتر ہوئی۔ آپ نے بھی خلفائے راشدین کی "تقسیم دولت" کی پالیسی جاری رکھی جس سے ہر شخص کی مالی حالت بہتر ہوتی چلی گئی۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد خانہ جنگی کی سی کیفیت پیدا ہوئی اور اس کے بعد جو حکمران برسر اقتدار آئے، ان میں اقربا پروری

اور کرپشن پھیلتی چلی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دولت کا ارتکاز چند ہاتھوں میں ہونے لگا تاہم پھر بھی معاشرے میں اتنی دولت موجود تھی جس سے سبھی لوگ اچھی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ حکمران خاندان کے ہاتھ جب دولت کے بے پناہ ذخائر لگے تو ان میں وہی برائیاں پیدا ہوئیں جو کہ قیصر و کسریٰ کے درباروں میں ہوا کرتی تھیں۔ بڑے بڑے محلات بنائے جانے لگے، سینکڑوں بلکہ ہزاروں لونڈیوں پر مشتمل حرم وجود میں آنے لگے اور عوامی دولت کو عیاشیوں پر لٹایا جانے لگا۔ اس سے مسلم معاشرے کی بالخصوص اشرافیہ میں عیش پرستی پیدا ہونے لگی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ (reign 98-101/717-719) کے دور کو ایک استثنائی دور قرار دیا جا سکتا ہے مگر ان کی شہادت کے بعد صورتحال اپنے معمول پر پلٹ آئی۔

بنو امیہ کا آخری دور خانہ جنگیوں میں گزرا جس کے بعد بنو عباس بر سر اقتدار آئے۔ عباسیوں کے دور عروج میں سلطنت مزید مستحکم ہوئی اور مال و دولت اتنا بڑھ گیا کہ ہارون رشید (reign 169-193/786-809) نے ایک مرتبہ بادل کے ٹکڑے کو دیکھ کر کہا کہ جہاں چاہے جا کر برسو، تمہاری فصل کا خراج تو میرے پاس ہی آئے گا۔ اسی ہارون کے بیٹے مامون (reign 197-217/813-833) کی شادی کی جو تفصیلات تاریخ میں بیان ہوئی ہیں، وہ یہ ہیں:

> [مامون کے سسر] حسن بن سہل نے اپنے یہاں مشک و عنبر کے لوگوں میں ایسے پیکٹ تقسیم کئے جن میں چھوٹے، چھوٹے کاغذ کے پُرزے رکھے گئے تھے اور ہر پُرزے پر مختلف قیمتی اشیاء کا نام لکھا گیا تھا، مثلاً زمین، جائیداد، کنیز، غلام، چوپائے وغیرہ لوگوں نے اپنے اپنے پیکٹ کھولنے شروع کئے۔ جس پرچی پر جو بھی لکھا ہوتا وہ بیت المال سے جا کر لے آتا اس کے علاوہ حسن بن سہل نے بہت زیادہ درہم و دینار، مشک و عنبر لوگوں میں تقسیم کئے۔۔۔ حسن بن سہل نے بہت ہی قیمتی ہیرے جواہرات اپنے داماد مامون اور دیگر سرداروں کے درمیان تقسیم کئے، اس شادی میں خدمت کرنے والے خادموں کی تعداد چھتیس ہزار تھی۔
>
> شبِ زفاف کے لئے جو مسند بچھائی گئی وہ سونے کی تھی، سونے کے ہی جواہرات سے مرصع ظروف میں سچے موتی بھر کر لائے گئے اور اس مسند پر نچھاور کئے گئے، اس کے بعد مامون کے ہاتھ میں پوران دخت کا ہاتھ دے دیا گیا۔۔۔ یہ سچے موتی سونے کی مسند پر ستاروں کی مانند چمک رہے تھے ۔۔۔ جیسے ہی مامون صبح کو اٹھا تو ایک کروڑ درہم اپنے خسر حسن بن سہل کو مامون نے بطور انعام دیے اور "فم الصلح" بھی حسن بن سہل کے حوالے کر دیا۔
>
> حسن بن سہل نے بھی بہت زیادہ مال و دولت لوگوں میں تقسیم کیا، مامون نے صوبۂ فارس اور خوزستان کا ایک سال کا ٹیکس اور خالص آمدنی بھی حسن بن سہل کے حوالے کر دی۔ شادی کی دوسری رات میں دلہن کی دادی، جواہرات سے مرصع سونے کی سینی میں سچے موتی رکھ کر لائی اور مامون کے قدموں پر نچھاور کئے۔۔۔ شادی کے بعد جب مامون نے اپنی سوتیلی ماں زبیدہ سے معلوم کیا کہ میری اس شادی میں کتنا خرچ ہوا؟ تو زبیدہ نے جواب دیا کہ تین کروڑ ساٹھ لاکھ 36,000,000 درہم۔ اس شادی میں طرفین کا سات کروڑ دس لاکھ درہم خرچ ہوا۔ مامون اپنی دلہن کے ساتھ رمضان 210ھ کو اپنے محل میں داخل ہوا، مامون کی بیوی نے اپنا مہر ایک لاکھ دینار اور پچاس لاکھ درہم رکھا تھا۔[1]

ممکن ہے کہ مورخین کے اس بیان میں مبالغہ ہو تاہم عباسیوں کی عیاشی کی بے شمار داستانیں تواتر سے موجود ہیں۔ اس دور کی موسیقی اور موسیقاروں کے حالات پر مشتمل کتاب "الاغانی" میں ان عیاشیوں کی تفصیل ملتی ہے۔ ان عیاشیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف گروہ

حکومت پر قبضے کی سازشیں کرنے لگے جس سے خانہ جنگی کی سی کیفیت پیدا ہوئی۔ خانہ جنگیوں اور عیاشیوں نے مسلمانوں کے حساس طبقے میں بے چینی پیدا کر دی جو آگے چل کر ترک دنیا کی تحریک میں تبدیل ہو گئی۔ اس صورتحال کا تجزیہ کرتے ہوئے ریحان احمد یوسفی لکھتے ہیں:

دوسری صدی ہجری کے نصف اول تک کے یہ وہ حالات ہیں جن میں ایک طرف مسلم معاشرے میں مال و دولت کی بے پناہ کثرت تھی اور دوسری طرف مستقل جنگ و جدال اور بدامنی کا ماحول تھا۔ ان حالات میں ایک مسلمان کی ضرورت تھی کہ مادیت کے ماحول میں اس کے روحانی ارتقا اور بدامنی کی فضا میں ذہنی و قلبی سکون کے لیے مذہبی قیادت آگے آتی اور قرآن پاک کی روشنی میں اس کی رہنمائی کرتی۔ بد قسمتی سے یہ نہیں ہو سکا۔

صالحین کی ایک بڑی تعداد مستقل جنگوں میں مصروف رہی، چاہے وہ خارجی قوتوں کے خلاف تھیں یا بنو امیہ کے خلاف ہونے والی بغاوتوں کی شکل میں۔ باقی اہل علم کی توجہ ایک عظیم مسلم ریاست کے قانونی نظام کی تشکیل کے لیے فقہی سرگرمیوں میں صرف ہونے لگی۔ فقہا کی آرا کے رد عمل میں لوگوں نے دینی احکام کو احادیث سے جمع کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ ائمہ اربعہ کا کام دوسری اور تیسری صدی میں سامنے آیا۔ اسی عرصے میں صحاح ستہ کی تدوین ہوئی۔ مسلمان اہل علم فقہ اور حدیث کی تدوین سے فارغ ہوئے تو یونانی فکر و فلسفہ سے مسلم معاشرے میں در آنے والے کلامی مباحث کی طرف متوجہ ہو گئے۔۔۔۔

اس جائزے سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ابتدائی صدیوں میں جب مستقل خانہ جنگی کی وجہ سے ذہنی پریشانی اور مال و دولت کی فراوانی کی بنا پر پیدا ہونے والے روحانی خلا اور اخلاقی بگاڑ جیسے مسائل کو حل کرنے کی ضرورت تھی، مسلمان اہل علم کی ترجیحات جنگ و سیاست، فقہ و حدیث اور فلسفہ و کلام بنی رہیں۔

ابتدائی صدی میں اس صورتحال میں ایک نمایاں استثنا حسن بصری [728-110/641-21] کا تھا۔ آپ ایک جلیل القدر تابعی، مفسر اور محدث تھے۔ ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر پرورش پانے والے حسن بصری (پیدائش 21/641) نے صحابۂ کرام کا کافی زمانہ پایا۔ اپنے دور کے انتشار اور صحابۂ کرام کے دور کے بعد آنے والے اخلاقی انحطاط کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس کے خلاف بھرپور جدوجہد کی۔ وہ صاحب علم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ نظر، صاحبِ درد اور قادر الکلام خطیب بھی تھے۔ ان کے مواعظ کی اثر آفرینی اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ امام غزالی نے اپنی کتاب احیاء العلوم میں ان کے کلام کو نبیوں کے کلام کی طرح قرار دیا۔

ان کی کوششوں کے نتیجے میں ایک فضا پیدا ہوئی مگر بد قسمتی سے ان کے بعد [دعوت و اصلاح کا] یہ میدان اہل علم کی دلچسپی کا موضوع نہ بن سکا۔ جبکہ معاشرے کی اخلاقی تربیت کرنا اور ربانی تعلق کی درست جہت کی طرف لوگوں کی رہنمائی کرنا بہر حال معاشرے کی ضرورت تھی جو اُس دور کے معروضی حالات میں زیادہ شدت اختیار کر گئی تھی۔ اس کے نتیجے میں ایک زبردست خلا پیدا ہوا۔ انسانی ضروریات کی طلب سے پیدا ہونے والا کوئی خلا کبھی باقی نہیں رہتا۔ یہ خلا تصوف کی تحریک نے بھر دیا۔ مسلم معاشرے کے زہد اور غیر مسلم فلسفوں اور روایات سے متاثر تصوف کی تحریک اس فضا میں غیر محسوس طریقے سے اپنی جگہ بناتی چلی گئی اور دوسری اور تیسری صدی میں عوام و خواص دونوں میں مقبول ہو گئی۔[2]

بہر حال یہ تصویر کا ایک رخ تھا۔ دوسری جانب مسلم معاشرے میں ان لوگوں کی کمی نہ تھی جو دنیا کو محض ایک دھوکہ اور سراب ہی

سمجھتے تھے اور ان کی زندگیوں کا مقصد آخرت کی تعمیر تھا۔ یہی وہ لوگ تھے جو اپنے ساتھ معاشرے کی اخلاقی تربیت اور اللہ تعالی سے تعلق پیدا کرنے کے عمل میں مشغول ہوئے۔ ان میں بعض نمایاں شخصیات ابن عباس(d. 68/687)، حسن بصری (23-110/645-728)، عروہ بن زبیر (23-80/645-699)، عکرمہ مولی ابن عباس (d. 105/723)، عطاء بن یسار (d. 103/721)، طاؤس بن کیسان(d. 106/725)، عمر بن عبدالعزیز (62-101/682-719)، ابو حنیفہ (80-150/699-767)، مالک بن انس (93-179/711-795)، شافعی(150-204/767-819)، احمد بن حنبل(164-241/780-855)اور سفیان ثوری(97-161/716-777)شامل ہیں۔ یہ سب حضرات حسب توفیق معاشرے کی تربیت میں مشغول رہے تاہم ان میں سے اکثر کی دلچسپی کا میدان دوسرا تھا۔ بعض لوگ علم فقہ اور حدیث کی تدوین میں مشغول ہوئے تاہم انہوں نے اسی کو تزکیہ نفس کا ذریعہ بنایا۔

ان حضرات کی کاوشوں کے نتیجے میں جہاں مسلمان دین کی طرف مائل ہوئے، وہاں ان کے اندر ایک ایسا طبقہ بھی پیدا ہو گیا جو دنیا کو زیادہ اہمیت نہ دیتا تھا اور اپنی پوری توجہ آخرت بنانے میں صرف کرتا تھا۔ یہی لوگ تھے جنہیں اس معاشرے کے لوگوں نے عابدین، زہاد (واحد زاہد) اور صالحین وغیرہ کے لقب سے یاد کیا۔

دوسرا دور: تصوف کا ارتقائی دور 200-350/815-961

تیسری صدی ہجری میں تصوف کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب مسلم دنیا بڑی حد تک سیاسی اعتبار سے مستحکم (Stable) ہو چکی تھی، دولت کی فراوانی تھی۔ اگرچہ حکمران طبقہ اور اشرافیہ دولت کے بڑے بڑے ذخیرے پر قابض تھے، پھر بھی عام لوگوں تک دولت پہنچتی تھی اور کم از کم مالی مشکلات کی وجہ سے کوئی بھوکا نہ سوتا تھا۔ مذہبی علماء اور ان کے اداروں کے لیے بڑی بڑی جاگیریں وقف ہوا کرتی تھیں اور علم کی سرپرستی کے لیے حکمران اور ان کے امراء ایک دوسرے سے مقابلہ کیا کرتے تھے۔

پہلے دور کی نسبت اس دوسرے دور میں چند اہم تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں جن کی تفصیل یہ ہے:

علم دین سے زہاد کی دوری

پہلے دور میں دینی علماء ہی عوام الناس کے تزکیہ نفس کا فریضہ انجام دیا کرتے تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جو قرآن وحدیث کی تعلیم اور ان کی روشنی میں زندگی کے مسائل کا حل نکالنے (فقہ) میں مشغول ہوا کرتے تھے۔ چونکہ مذہبی لوگوں کو معاشرے میں ایک خاص مقام حاصل تھا اور بادشاہ تک ان کی جوتیاں سیدھی کرنے میں فخر محسوس کیا کرتے تھے، اس وجہ سے بہت سے دنیادار قسم کے لوگ علم دین حاصل کرنے لگے۔ جیسا کہ ہم عام زندگی میں دیکھتے ہیں کہ دنیادار لوگ دولت کے حصول اور اس کی نمائش کے لیے ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہیں اور اس معاملے میں بہت مرتبہ دین کی اخلاقی تعلیمات کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں، ویسا ہی معاملہ ان لوگوں کے ساتھ ہوا۔ اس کی تفصیل کو مشہور صوفی عالم شاہ ولی اللہ (1703-1762) نے کچھ یوں بیان کیا ہے:

ان ادوار کے بعد کے لوگ ادھر ادھر جانے لگے۔ ان میں نئے نئے امور پیدا ہوئے۔ ان میں علم فقہ کے معاملے میں اختلاف پیدا ہوا۔ اس کی تفصیل غزالی کے بیان کے مطابق یہ ہے کہ جب ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کا دور ختم ہوا تو حکومت ان لوگوں کو مل گئی جو احکام اور فتاوی کے معاملے میں نااہل اور کمزور تھے۔ یہ اس بات پر مجبور ہوئے کہ وہ [حکومت چلانے کے لئے] فقہاء سے مدد طلب کریں اور ہر طرح کی صورتحال میں انہیں اپنا ساتھی بنائیں۔

[اس دور میں] ایسے علماء موجود تھے جو پرانے طریق کار پر قائم تھے اور دین کی عزت برقرار رکھنے کو لازم سمجھتے تھے۔ جب انہیں [حکومتی معاملات میں] طلب کیا جاتا تو وہ ادھر ادھر ہو کر اس سے بچنے کی کوشش کرتے۔ [دنیاداری سے] اس اعراض کی وجہ سے اس دور کے علماء اور ائمہ کی عزت اور مرتبہ برقرار رہا۔ بعد میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جو جاہ و منصب اور عزت حاصل کرنے کے لئے علم حاصل کرنے لگے۔ اس کے بعد فقہاء مطلوب کی بجائے طالب بنتے چلے گئے اور وہ لوگ جو بادشاہوں سے دور رہنے کی وجہ سے معزز تھے، اب ان کے گرد اکٹھا ہونے کی وجہ سے ذلت کا شکار ہو گئے سوائے اس کے کہ جسے اللہ نے [بچنے کی] توفیق دی۔

ان سے پہلے ایسے لوگ تھے جنہوں نے علم الکلام [عقائد کے فلسفے کا علم] میں تصانیف مرتب کیں۔ یہ لوگ اس علم سے متعلق مختلف آرا اکٹھا کرنے، ان کا حوالہ دینے، سوال جواب کرنے، اور بحث و مباحثے کا طریق کار طے کرنے میں ضرورت سے زیادہ مشغول ہو گئے۔ اس کے نتیجے میں جو کام سینہ بہ سینہ ہو رہا تھا وہ منظر عام پر آنے لگا۔

بادشاہوں نے اپنی تفریح کی خاطر فقہ خاص طور پر امام ابو حنیفہ اور شافعی رحمۃ اللہ علیہما کے مذہب سے متعلق بحث مباحثوں کو فنانس کر کے ان کی [حوصلہ افزائی کرنا شروع کر دی۔] لوگوں نے علم کلام اور دیگر علمی فنون کو چھوڑ دیا اور شافعی و حنفی مکاتب فکر کے اختلافی مسائل میں اسپیشلائز کرنے لگے۔ انہوں نے امام مالک، سفیان ثوری اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ وغیرہ کے معاملے کو پس پشت ڈال دیا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ وہ یہ سب اس لئے کر رہے ہیں کہ شریعت میں گہرے نکات کو تلاش کیا جائے، مختلف مکاتب فکر کی خامیوں کو بیان کیا جائے اور فتوی دینے کے علم کے اصولوں کو مرتب کیا جائے۔

وہ لوگ اس معاملے میں نتائج اخذ کرنے اور تصنیف و تالیف میں ضرورت سے زیادہ مشغول ہو گئے۔ اس میں انہوں نے بہت سی اقسام کے بحث و مباحثے اور تصنیفات مرتب کیں اور آج تک یہ اسی کام میں مشغول ہیں۔ ہم نہیں سمجھتے کہ اللہ تعالی [کے دین کو نازل کرنے] کا مقصد یہی تھا جو کچھ بعد کے ادوار میں ہوتا رہا۔ بہر حال یہی ہوتا رہا۔

ان میں سے بعض وہ لوگ تھے جو [اندھی] تقلید پر مطمئن ہو گئے۔ لاشعوری طور پر تقلید چیونٹی کی رفتار سے ان کے سینوں میں سرایت کرتی چلی گئی۔ اس کا سبب فقہاء کا ایک دوسرے سے مقابلہ اور آپس میں [غیر ضروری] بحث مباحثہ کرنا تھا۔ جب بھی کوئی ایک شخص اپنا نقطہ نظر بیان کرتا تو دوسرا اس کے بالکل الٹ فتوی جاری کر کے اس کی تردید کرنے لگ جاتا۔ اس پر ان کا مناظرہ اس وقت تک جاری رہتا جب تک کہ کوئی شخص قدیم علماء میں سے کسی کی واضح رائے سامنے نہ رکھ دیتا۔

[تقلیدی روش میں اضافے کی] ایک وجہ عدالتی ججوں کا ظلم و ستم بھی تھا۔ جب قاضیوں نے غیر منصفانہ فیصلے کرنا شروع کر دیے اور وہ [پیشہ ورانہ] دیانت داری چھوڑتے چلے گئے تو ان کے ان فیصلوں کو قبول نہ کیا جانے لگا جو اس سے پہلے کئے گئے عدالتی فیصلوں کے مطابق نہ تھے۔

[تقلیدی روش میں اضافے کی] ایک اور وجہ لوگوں کے مذہبی راہنماؤں کی جہالت بھی تھی۔ لوگ ان لوگوں سے فتوی طلب کرنے لگے جنہیں نہ تو حدیث کا علم تھا اور نہ ہی تخریج کے طریق کار [پہلے سے موجود قوانین کو نئی صورتحال پر منطبق کرنے کا طریق کار] کا علم تھا۔ یہ چیز آپ بعد کے دور کے لوگوں میں عام دیکھ سکتے ہیں۔ ابن ہمام وغیرہ نے اسی پر متنبہ کیا ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب غیر مجتہد لوگ، فقیہ کہلائے جانے لگے۔

ان میں سے وہ لوگ بھی تھے جنہوں نے ہر فن میں [ضرورت سے زیادہ] گہرائی میں جانے کی کوشش کی۔ ان میں وہ بھی تھے جو اپنے تئیں یہ سمجھ بیٹھے کہ وہ اسماء الرجال اور جرح و تعدیل کے فنون کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ اس کے لئے وہ قدیم اور جدید تاریخ [سے متعلق روایات] جمع کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جنہوں نے عجیب و غریب روایات [ہی کو اپنا مقصد بنا کر ان] کی چھان بین شروع کر دی اگرچہ وہ محض جعلی روایت ہی کیوں نہ ہو۔

ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو اصول الفقہ میں [غیر ضروری] بحث و مباحثہ کرنے لگے۔ ہر ایک نے [اپنے اپنے مکتب فکر کے بڑے لوگوں کے نتائج فکر سے ان کے] طریق کار سے متعلق قواعد و ضوابط اخذ کرنا شروع کر دیے۔ یہ لوگ انہی معاملات کو اکٹھا کرنے، ان کی چھان بین کرنے، ان سے متعلق سوال و جواب تیار کرنے اور بے جا تقسیم بندی (Classification) کرنے میں مشغول ہو گئے۔ کبھی اس پر طویل بحثیں کرتے اور کبھی مختصر۔

ان میں سے وہ بھی تھے جنہوں نے ایسی خیالی صورت حال فرض کرنا شروع کیں جنہیں اگر کوئی عقل مند سوچے تو اسے ان کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہ محسوس ہو گا۔ وہ تخریج کے ماہرین کے طرز بیان سے ایسے ایسے نکات اور عمومی نتائج (Generalized Conclusions) اخذ کرنے لگ گئے جنہیں سن کر نہ تو کسی عالم اور نہ ہی جاہل کا ذہن مطمئن ہو سکتا ہے۔۔۔۔

اس کے بعد خالص تقلید کا دور شروع ہوا۔ اب لوگ نہ تو حق اور باطل میں فرق نہ کرنے لگے اور نہ ہی احکام اخذ کرنے اور ان پر بحث و مباحثہ کرنے میں کوئی تفریق کرنے لگے۔ اب فقیہ اس شخص کا نام ہو گیا جو زیادہ بولتا اور غیر محتاط طریقے سے بحث کرتا ہو، قدیم علماء کی مضبوط اور کمزور آراء میں کسی فرق کے بغیر یاد کر لے اور اسے پورے جوش و خروش کے ساتھ بیان کر دے۔ محدث اس شخص کو کہا جانے لگا جو صحیح و کمزور ہر طرح کی احادیث کو یاد کر لے اور انہیں بغیر سوچے سمجھے زور و شور سے اپنے جبڑوں کی طاقت سے بیان کرنے لگ جائے۔

میں یہ تو نہیں کہتا کہ ہر شخص ایسا ہی ہو گیا تھا۔ اللہ کے بندوں کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جسے ایسے لوگوں کی جہالت سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ یہ لوگ اگرچہ تعداد میں کم ہوں لیکن زمین میں اللہ کی حجت ہوا کرتے ہیں۔[3]

علماء کے اس اخلاقی انحطاط کا نتیجہ یہ نکلا کہ عام لوگ، خاص کر وہ لوگ جو کہ فکر آخرت رکھتے تھے اور دنیا پرستی کو برا سمجھتے تھے، ان سے دور ہوتے چلے گئے۔ اس کے دو نتائج نکلے:

ایک تو یہ کہ دینی عقائد اور احکام سے متعلق علوم (علم الکلام اور علم الفقہ) پر سوائے چند افراد کے، ان لوگوں کا قبضہ ہو گیا جو کہ اپنی ذہنیت کے اعتبار سے دین دار نہیں بلکہ دنیا دار تھے۔ کلام اور فقہ کے مطالعے سے ان کا مقصد آخرت کی تیاری نہیں بلکہ دنیا کی دولت کمانا تھا۔ اس کے نتیجے میں فقہ کے اندر دین کی اصل روح "فکر آخرت" کی جگہ "فکر دنیا" نے لے لی۔

دوسرے یہ کہ زہاد اور دینی طرز فکر رکھنے والے لوگ علوم القرآن، حدیث اور فقہ سے دور ہو گئے۔

یہ دونوں نتائج نہایت بھی بھیانک ثابت ہوئے۔ ایک جانب دینی علوم کو دنیا کمانے کے لیے استعمال کیا جانے لگا اور دوسری جانب فکر آخرت رکھنے والوں کی بہت بڑی تعداد اصل دینی علم سے دور ہوتی چلی گئی۔

باطنیت کے اثرات

پہلے دور کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مسلمانوں کا مین اسٹریم طبقہ اہل تشیع کے نقطہ نظر سے زیادہ متاثر نہ ہوا تھا۔ دوسرے دور میں باطنی فرقوں کے اثرات مسلمانوں کے تصوف پر نمایاں ہونا شروع ہوئے۔ جیسا کہ ہم اوپر صوفی بزرگ یوسف سلیم چشتی صاحب کے حوالے سے بیان کر چکے ہیں کہ بہت سے باطنی داعیوں نے صوفیاء کا لبادہ اوڑھ کر اپنے نظریات اہل تصوف کے اندر پھیلانا شروع کیے۔ یہ وہ دور ہے جب اہل تشیع کے اسماعیلی فرقہ کی حکومت شمالی ایران اور بحرین کے علاقوں میں قائم ہو چکی تھی۔ یہ حضرات اپنی دعوت پھیلانے کے لیے بہت منظم اور ایکٹو انداز میں کام کر رہے تھے۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اہل تصوف کے اندر بہت سے باطنی تصورات آنے لگے۔ شریعت و طریقت میں فرق کیے جانے کا آغاز ہوا، سنی اہل تصوف کے ہاں بھی دیگر صحابہ کے مقابلے میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو ایک خاص فضیلت دی جانے لگی اور خیالات کو چھپا کر سینہ بہ سینہ منتقل کرنے کا رجحان پیدا ہوا۔ غالباً یہیں سے وہ رجحان پیدا ہوا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ تصوف کے کم و بیش تمام سلسلوں کے منبع قرار پائے اور تزکیہ نفس کے ضمن میں دیگر صحابہ کی خدمات اور اہمیت کو عملاً مسترد کر دیا گیا۔

جعلی روایات اور اسرائیلیات

پہلے دور کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ احادیث کو قبول کرنے میں حد درجے احتیاط برتی جاتی تھی۔ علماء اچھی طرح چھان پھٹک کر کسی حدیث کو قبول کیا کرتے تھے اور اس کے لیے حدیث کے راویوں کی شخصیت کو بھی کھنگال لیا کرتے تھے۔ دوسرے دور میں زہد و تقویٰ کے شائقین کے ہاں اس چیز کو اچھا نہیں سمجھا گیا اور یہ تصور پیدا ہوا کہ ان راویوں کے حالات اور خامیوں کی تحقیق غیبت کے زمرے میں آتی ہے، اس وجہ سے اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ زہاد اور صالحین، محدثین سے دور ہوتے چلے گئے۔

جب یہ زہاد و صالحین علم حدیث سے دور ہوئے تو ان کے ہاں یہ رجحان پیدا ہوا کہ احادیث کو زیادہ پرکھنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ جو حدیث بھی انہیں تزکیہ نفس اور اپنے مجاہدات کے لیے موزوں محسوس ہوئی، انہوں نے اسے اختیار کر لیا۔ اس کے نتیجے میں جھوٹی اور موضوع روایات کا بہت بڑا ذخیرہ اہل تصوف کے ہاں جمع ہو گیا جو کہ ان کی کتب کے ذریعے اگلی نسلوں کو منتقل ہونا شروع ہوا۔ نہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب جھوٹی روایات بلکہ کثیر تعداد میں اسرائیلی روایات کو قبول کیے جانے کا سلسلہ ان کے ہاں شروع ہوا۔ یہود و نصاریٰ کی وہ روایات جن کا تعلق ترک دنیا اور مجاہدات وغیرہ سے تھا، بکثرت قبول کی گئیں اور انہیں صوفی کتب کا حصہ بنایا جانے لگا۔

مشہور محدث اور صحیح مسلم کے مصنف، امام مسلم بن حجاج(204-261/819-875) نے اپنے زمانے کے صوفیاء اور عبادت گزار لوگوں سے متعلق، صحیح مسلم کے مقدمہ میں مشہور محدثین کا یہ تبصرہ نقل کیا ہے:

وحدثني محمد بن أبي عتاب. قال: حدثني عفان، عن محمد بن يحيى بن سعيد القطان، عن أبيه، قال: لم نر الصالحين في شئ أكذب منهم في الحديث. قال ابن أبي عتاب: فلقيت أنا محمد بن يحيى بن سعيد القطان، فسألته عنه. فقال عن أبيه: لم تر أهل الخير في شئ، أكذب منهم في الحديث. قال مسلم: يقول: يجري الكذب على لسانهم ولا يتعمدون الكذب.

'یحییٰ بن سعید القطان کہتے ہیں: "ہم نے ان صالحین سے زیادہ کسی کو حدیث کے معاملہ میں جھوٹ بولنے والا نہیں دیکھا۔" ابن ابی عتاب کہتے ہیں کہ پھر مجھ سے محمد بن یحییٰ بن سعید القطان کی ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے یہی بات پوچھی۔ وہ کہنے لگے: "ہاں، میرے والد فرماتے تھے کہ تم ان اہل خیر سے زیادہ کسی کو بھی حدیث کے معاملے میں جھوٹ بولنے والا نہ پاؤ گے۔" امام مسلم خود کہتے ہیں: "جھوٹ ان کی زبانوں سے بے ساختہ جاری ہو جاتا ہے، چاہے جھوٹ بولنے کا ارادہ نہ بھی رکھتے ہوں۔"[4]

اسی دور میں صوفی بزرگ حکیم ترمذی(d. 320/932) پیدا ہوئے جنہوں نے "نوادر الاصول" میں بکثرت ایسی روایتیں نقل کیں جو بعد کی کتب میں نقل ہوتی چلی گئیں۔ حکیم ترمذی، صحاح ستہ کی کتاب سنن ترمذی کے مصنف نہیں ہیں بلکہ ایک الگ شخصیت ہیں۔ جھوٹی روایتوں کو بیان کرنے کا یہ رجحان تیسرے دور میں اپنے عروج کو پہنچا۔ دوسری جانب محتاط محدثین جیسے احمد بن حنبل(164-241/780-855 ، ابن ماجہ(209-273/824-887)، طبرانی(208-360/821-918)، بیہقی(d. 458/1065) وغیرہم نے اپنی کتب میں صحیح، ضعیف اور موضوع روایتیں اکٹھا کرنا شروع کر دیں جس سے اہل تصوف کو بعد میں بہت تقویت ملی۔

رہبانیت کا آغاز

جب فکر آخرت رکھنے والے مخلص لوگ صحیح دینی علم سے دور ہوئے جس کی بنیاد قرآن و سنت پر تھی، تو ان حضرات نے وظائف، چلے اور مراقبے اختیار کرنا شروع کر دیے۔ اس کے علاوہ ایسے بہت سے لوگ پیدا ہوئے جو ترک دنیا کر کے جنگلوں میں نکلنے لگے۔ غالب گمان یہ ہے کہ شام اور مصر کے علاقوں میں ان حضرات کا تعامل عیسائی راہبوں سے ہوا اور انہوں نے بہت سی ریاضتیں ان راہبوں سے سیکھ کر انہیں اپنانا شروع کر دیا۔

مشہور صوفی

یہی وہ دور ہے جب "صوفی" کے لفظ کا باقاعدہ اطلاق ایک زاہد حارث محاسبی(170-243/786-857) پر کیا گیا۔ ان کے علاوہ اس دور کے مشہور صوفی بزرگوں میں شیخ جنید بغدادی (214-297/830-910)، بایزید بسطامی(188-260/804-874) سری سقطی (d. 253/867، ذوالنون مصری (d. 245/859)، حکیم ترمذی(d. 320/932) اور ابو بکر شبلی(247-334/861-945) شامل ہیں۔ اسی دور میں مشہور صوفی منصور حلاج(244-309/858-922) پیدا ہوئے جنہوں نے وحدت الوجود کے عقیدے کو اپنا کر "انا الحق" یعنی

"میں خدا ہوں" کا نعرہ لگایا اور اس کی بھرپور دعوت دی۔ حلاج کو اس دعوی کی پاداش میں حکومت وقت نے موت کی سزا سنا دی۔

تیسرا دور: دور عروج 350-650/961-1252

تیسرا دور تصوف کے عروج کا دور ہے۔ دوسرے دور میں شروع ہونے والے رجحانات اس تیسرے دور میں اپنے عروج پر پہنچے جس کی تفصیل یہ ہے:

شریعت و طریقت میں ہم آہنگی

دوسرے دور میں صوفیاء کے ہاں قرآن و حدیث اور فقہ کے صحیح علم سے دوری کا جو رجحان پیدا ہوا تھا، اس میں چوتھی اور پانچویں صدی میں مزید ترقی ہوئی۔ تاہم اسی دور میں غزالی (450-505/1058-1111) جیسے بڑے صوفی عالم پیدا ہوئے جنہوں نے اہل تصوف کو دوبارہ قرآن و حدیث کی طرف لانے میں اہم کردار ادا کیا۔ غزالی غالباً پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے شریعت و طریقت کو کامیابی کے ساتھ ہم آہنگ (Reconciliation) کرنے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی رہے۔ غزالی کے بعد علماء اور صوفیاء میں دوری بڑی حد تک کم ہوئی۔ صوفیاء، علماء کے پاس جا کر علم دین حاصل کرنے لگے اور علماء صوفیاء کے مرید بننے لگے۔

مزارات اور خانقاہوں کی تعمیر

پہلے دور میں قبور اور مزارات کو کوئی خاص اہمیت نہ دی جاتی تھی بلکہ ان کی تعمیر کو بہت برا سمجھا جاتا تھا۔ دوسرے دور میں اکا دکا مزارات بننا شروع ہوئے مگر تیسرے دور میں یہ سلسلہ صحیح معنوں میں شروع ہوا۔ مزارات بنوانے کا آغاز اہل تشیع کی جانب سے ہوا۔ ان کی اپنی تواریخ کے مطابق مختار ثقفی نے 65/684 میں کربلا میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی قبر پر مقبرہ تعمیر کروایا جو کہ کچھ عرصے بعد ختم ہو گیا۔ بعد میں ایک دو مرتبہ یہ مقبرہ بنانے کی کوشش ہوئی مگر اسے جلد ہی مسمار کر دیا گیا۔ عباسیوں کے دور زوال میں جب شیعہ خاندان آل بویہ کو اقتدار حاصل ہوا تو عزد بن بویہ نے 307/977 میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا عالیشان مزار تعمیر کروایا۔ اس کے بعد دیگر ائمہ اہل بیت رحمہم اللہ کے شاندار مزارات تعمیر ہونا شروع ہوئے۔

کچھ ہی عرصے میں یہ رجحان اہل سنت کے ہاں بھی منتقل ہوا اور بزرگان دین کے مزارات بنوائے جانے لگے۔[5] آہستہ آہستہ یہ مزارات روحانیت کے مراکز بننے لگے اور ان کے گرد خانقاہیں تعمیر ہونے لگیں۔ اس طرح سے کہا جا سکتا ہے کہ اس دور میں تصوف کی تنظیم و ترتیب (Institutionalization) اپنے عروج کو پہنچی۔

رہبانیت

مزارات اور خانقاہوں کی تعمیر کے ساتھ ہی رہبانیت نے باقاعدہ ادارے کی شکل اختیار کر لی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ خانقاہیں ہندوستان سے

لے کر مراکش اور اسپین تک پھیلتی چلی گئیں۔ کہیں انہیں خانقاہ کہا گیا، کہیں زاویہ اور کہیں رباط۔ لوگ ان خانقاہوں میں آ کر اپنی روحانی تربیت کروانے لگے۔ صوفی شیوخ کو اپنے مریدین پر غیر معمولی کنٹرول حاصل ہونے لگا۔ چلوں، مراقبوں اور روحانی ریاضتوں کی ایک نئی دنیا آباد ہوئی۔ جہاں مخلص صوفی راہب بننے لگے وہاں بعض دنیادار بھی ان کے ساتھ آن شریک ہوئے تاکہ لوگوں پر اپنی بزرگی کا رعب جمایا جائے اور اس کی مدد سے اپنی دنیا سنواری جائے۔

صوفیاء نے بالعموم حکومت وقت کے ساتھ مصالحت کا رویہ اختیار کیے رکھا جس کی وجہ سے سیاسی حکمرانوں نے ان کی راہ میں روڑے نہیں اٹکائے بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کی۔ نیک دل صوفیاء البتہ بادشاہوں سے دور رہے اور اگر بادشاہ نے زبردستی انہیں کچھ رقم وغیرہ دی تو انہوں نے اسے فوراً غرباء میں تقسیم کر دیا۔

جعلی روایات اور اسرائیلیات

اسی دور میں اہل تصوف کے ہاں موضوع اور ضعیف احادیث اور اسرائیلی روایتوں کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ صوفی ابو نعیم (336-430/947-1038) نے "حلیۃ الاولیاء" کے نام سے دس جلدوں پر مشتمل ایک ضخیم کتاب لکھی جس میں ایسی روایات اکٹھی کر دیں۔ انہی روایات کا بہت بڑا ذخیرہ امام غزالی نے اپنی کتاب "احیاء العلوم" میں اکٹھا کر دیا۔

دوسری جانب محدثین میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے صحیح، ضعیف اور موضوع ہر قسم کی روایات کو اکٹھا کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ ان میں حاکم (321-405/933-1014)، دار قطنی (d. 385/995)، بیہقی (d. 458/1065)، ابن عساکر (d. 571/1176) اور دیگر کئی محدثین اور مورخ شامل تھے۔ ان حضرات نے اتنا اہتمام البتہ ضرور کیا کہ ہر حدیث کی جیسی بھی بری بھلی سند انہیں ملی، انہوں نے درج کر دی تاکہ بعد کے محققین ان پر تحقیق کر کے صحیح، ضعیف اور موضوع روایتوں کو الگ کر سکیں۔ موجودہ دور میں بھی اہل تصوف اپنے نقطہ نظر کے حق میں جو روایات پیش کرتے ہیں، وہ زیادہ تر انہی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔

صوفی سلسلوں کا قیام

پانچویں سے ساتویں صدی ہجری کا زمانہ تصوف کا دور عروج ہے۔ اسی زمانے میں اہل تصوف نے خود کو باقاعدہ سلسلوں کی شکل میں منظم کیا۔ برصغیر جنوبی ایشیا کے تمام صوفی سلسلے اسی زمانے میں وجود پذیر ہوئے۔ شیخ عبدالقادر جیلانی (470-561/1077-1166)، خواجہ معین الدین چشتی (535-627/1141-1230)، شیخ شہاب الدین سہروردی (543-632/1148-1234) اور خواجہ بہاء الدین نقشبند (717-791/1318-1389) نے علی الترتیب قادری، چشتی، سہروردی اور نقشبندی سلسلوں کو منظم کیا۔ ترکی میں مولانا جلال الدین رومی (603-671/1207-1273) سے مولوی سلسلہ چلا۔ ان کے علاوہ رفاعی، سنوسی اور دیگر سلسلے بھی اسی زمانے میں چلے۔

ان سلسلوں نے صوفیانہ مشاغل کو منظم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ہر خانقاہ کا تعلق کسی خاص سلسلے سے ہوتا جہاں پر ایک شیخ اپنے

مریدین کی سلسلہ کے مشاغل کے مطابق تربیت کر رہے ہوتے تھے۔ یہ شیخ اپنے جس مرید کو سب سے لائق پاتے، اسے وہ خلافت عطا کر کے کسی علاقے میں جا کر اپنے سلسلے کی دعوت کو پھیلانے کا حکم دے دیتے۔ اس طرح وہ خلیفہ دوسرے علاقے میں جا کر خانقاہ قائم کرتے اور وہاں اپنے سلسلے کو چلاتے۔ ہندوستان کے زیادہ تر صوفی شیوخ وسطی ایشیا اور افغانستان سے آئے تھے۔ اس طریقے سے تصوف کے یہ سلسلے تیزی سے پھیلتے چلے گئے اور دو سو برس کے عرصے میں صوفی خانقاہیں ہندوستان سے لے کر اسپین تک پھیل گئیں۔ ابن بطوطہ (703-779/1304-1377) نے اپنے سفر نامے میں تقریباً ہر شہر میں موجود خانقاہوں کا ذکر کیا ہے۔

امہات کتب کی تصنیف

یہی وہ دور ہے جس میں وہ کتب لکھی گئیں جنہیں تصوف کی امہات کتب (اصلی یا بنیادی کتب) کہا جاتا ہے۔ اسی دور میں تصوف کی بنیادی اصطلاحات جیسے کشف، مراقبہ، وصول، فنا فی اللہ وغیرہ ایجاد کی گئیں۔ شیخ ابو طالب مکی (d. 386/996) کی قوت القلوب، ابو القاسم القشیری (376-465/986-1072) کا رسالہ قشیریہ، علی ہجویری (c. 379-465/990-1072) کی کشف **المحجوب**، عبداللہ الہروی (d. 481/1088) کی منازل السائرین، غزالی (450-505/1058-1111) کی احیاء العلوم، شہاب الدین سہروردی (543-632/1148-1234) کی عوارف المعارف اور محی الدین ابن عربی (558-638/1164-1240) کی فصوص الحکم اسی دور کی تصانیف ہیں۔ یہی حضرات اس دور کے چوٹی کے صوفی ہیں۔

تصوف پر تنقید

تصوف کے دور عروج میں جہاں اسے غیر معمولی فروغ حاصل ہوا، وہاں اسی دور میں ناقدین تصوف کا گروہ بھی پیدا ہوا جس نے تصوف میں در آنے والی بدعات پر کڑی تنقید کی۔ اس دور کے ناقدین میں سب سے اہم نام ابن حزم (384-456/994-1064) کا ہے جو اسپین کے بڑے عالم تھے۔ ان کے بعد بہت بڑے صوفی عالم امام غزالی نے جہاں مسلمانوں کے دیگر طبقات پر تنقید کی، وہاں صوفیاء کو بھی معاف نہ کیا اور ان کی خامیوں پر بھی انہیں توجہ دلائی۔ ان کے رسالہ "اصناف المغرورین" میں وہ معاشرے کے ایک ایک طبقے کو لے اس کے مسائل کو بیان کرتے ہیں۔ کتاب کا وہ حصہ قابل مطالعہ ہے جو صوفیاء سے متعلق ہے۔ انہیں وہ متصوف یا جعلی صوفی قرار دے کر ان پر تنقید کرتے ہیں۔

> اہل تصوف کے جو لوگ دھوکے میں مبتلا ہیں، ان کا دھوکہ شدید ترین ہے۔ یہ لوگ سچے صوفیاء سے شکل و شباہت، الفاظ، آداب، رسوم اور اصطلاحات میں مشابہت رکھتے ہیں مگر اپنے باطن کے تزکیے کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ یہ حرام اور شبہات سے پرہیز نہیں کرتے، حکمرانوں کے عطیوں کو قبول کرتے ہیں، شاندار شاہی خلعتوں کو پہننے میں مضائقہ نہیں سمجھتے۔۔۔۔ بعض صوفیاء علم مکاشفہ، مشاہدہ حق، وصول اور عین الشہود کے پیچھے پڑے رہتے ہیں لیکن ان کا معنی نہیں جانتے۔ ان میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو تصوف کو اسی لئے اختیار کرتا ہے کہ لوگ ان کی خدمت کریں اور ان کے پاس مال و دولت کے نذرانے پیش کریں۔۔۔۔ بعض صوفیاء تزکیہ نفس اور باطن کی صفائی کی طرف توجہ دیتے ہیں لیکن وہ شریعت کے اہم فرائض جیسے حج کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔[6]

چھٹی صدی ہجری ہی میں ابن جوزی (510-597/1116-1200) پیدا ہوئے جن کے وعظوں نے بغداد میں ہلچل مچا دی۔ انہوں کی تصنیف "تلبیس ابلیس" بہت مقبول ہوئی جس میں انہوں نے شیطان کے مکر و فریب کو بیان کیا ہے۔ اسی کتاب میں انہوں نے اپنے زمانے کے صوفیاء پر بھی کڑی تنقید کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> اکثر ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ جاہل آدمی قرآن یا حدیث میں دنیا کی مذمت سنتا تو سمجھ بیٹھتا ہے کہ نجات اس میں ہے کہ دنیا ترک کرے اور یہ نہیں جانتا کہ دنیا کیا چیز ہے۔ ابلیس اس پر اپنا یہ جال پھینکتا ہے کہ تم دنیا ترک کر دو تو آخرت میں نجات پا جاؤ گے۔ اب یہ منہ اٹھا کر پہاڑوں کی طرف نکل جاتا ہے اور جمعہ، باجماعت نماز اور علم سے دور ہو کر وحشی و جنگلی بن کر رہ جاتا ہے۔ شیطان اس کے ذہن میں جماتا ہے کہ حقیقی زہد یہی ہے۔ وہ بھی کیوں ایسا نہ سمجھے جب کہ اسے یہ سنایا جا چکا ہے کہ فلاں شیخ منہ اٹھائے جنگل کو چلا گیا اور فلاں شیخ پہاڑ پر عبادت کرتا رہا۔ اکثر اس جاہل کی اگر اولاد ہو تو وہ برباد ہو کر رہ جاتی ہے۔ ماں ہو تو وہ فراق میں روتی ہے۔ کبھی یہ جاہل نماز کے ارکان بھی ٹھیک نہیں جانتا اور کبھی اس کے ذمہ لوگوں کے قرض وغیرہ اور دیگر حقوق ہوتے ہیں جنہیں یہ ادا نہیں کرتا۔ شیطان کو اس جاہل شخص پر جال پھینکنے کا موقع اس طرح ملا کہ اس کا علم کمتر ہے۔ یہ بھی اس کی جہالت تھی کہ جو کچھ اس نفس نے اسے سمجھایا، اسی پر راضی ہو گیا۔ اگر یہ کسی ایسے عالم کی صحبت میں بیٹھا ہوتا جو حقیقت سے آگاہ ہوتا تو اس کو بتا دیتا کہ دنیا بذات خود بری نہیں ہے۔۔۔۔
>
> زاہدوں پر ابلیس کی تلبیس میں سے یہ ہے کہ زہد و عبادت کے پیچھے علم چھوڑ دیتے ہیں، گویا بہتر و افضل کو حقیر و کمتر کے بدلے اختیار کر لیتے ہیں۔ زاہد کا نفع اس کے دروازے سے آگے نہیں جاتا جبکہ عالم کا نفع دوسروں کو پہنچتا ہے۔[7]

اس کے بعد ابن جوزی صوفیاء کے اندر موجود مختلف امور جیسے بیوی بچوں کے حقوق تلف کرنا، عبادات کے نت نئے طریقے نکالنا، ریاکارانہ انداز میں عبادات کی نمائش، دولت مند مریدوں سے تعلق، دوسروں کو گناہ گار قرار دے کر حقیر جاننا، گندا رہنا، کرامتوں کی تلاش میں رہنا، علماء سے دور رہنا اور ان سے نفرت کرنا، موضوع حدیثیں بیان کرنا وغیرہ پر کڑی تنقید کہتے ہیں۔ ان کی یہ کتاب پچھلی آٹھ صدیوں میں بڑے پیمانے پر پڑھی گئی ہے۔

اسائن منٹس

- تصوف کے پہلے تین ادوار کا ایک تقابلی چارٹ تیار کیجیے جس میں ہر دور کی خصوصیات کا ایک دوسرے موازنہ کیجیے۔
- اس باب میں جن مشہور شخصیات کا ذکر ہے، انٹرنیٹ پر ان کے حالات زندگی تلاش کر کے ان کا مطالعہ کیجیے۔
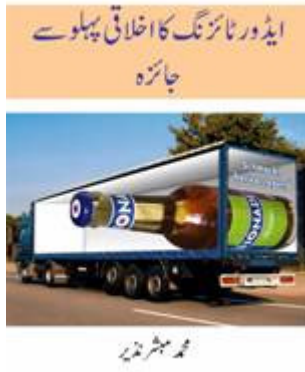
تعمیر شخصیت

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کو اپنی شخصیت کا حصہ بنائیے۔

---

[1] تاریخ تمدن اسلام۔ http://www.islamshia-w.com/Portal/Cultcure/Urdu/CaseID/83662/71243.aspx (ac. 15 Nov 2011)

[2] ریحان احمد یوسفی۔انسان کا مسئلہ۔ www.ishraqdawah.org (ac. 22 May 2011)

[3] شاہ ولی اللہ(1703-1762)۔حجۃ اللہ البالغہ۔باب حکایۃ حال الناس قبل المائۃ الرابعۃ وبعدھا۔بیروت: دار الجیل (2005)۔ www.waqfeya.com (ac. 11 Jan 2007)

[4] مسلم بن حجاج۔مقدمہ صحیح مسلم۔

[5] محمد عزیر شمس۔مقدمہ زیارت قبر نبوی۔ص13-14۔گوجرانوالہ: ام القری پبلی کیشنز (2010)

[6] ابوحامد غزالی۔أصناف المغرورين. الصنف الرابع من المغرورين المتصوفة.

[7] ابن جوزی۔تلبیس ابلیس۔ص260۔لاہور: مکتبہ اسلامیہ۔(ac. 3 June 2011) www.kitabosunnat.com

باب 19: تصوف کی تاریخ: حصہ دوم

جیسا کہ پچھلے باب میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ مسلمانوں کے تصوف کی تاریخ چھ ادوار پر مشتمل ہے جو کہ یہ ہیں:

- پہلا دور: ابتدائی دور1-200/622-815
- دوسرا دور: تصوف کا ارتقائی دور200-350/815-961
- تیسرا دور: دور عروج 350-650/961-1252
- چوتھا دور: وجودی دور 650-1000/1252-1591
- پانچواں دور: شہودی دور یا دور اصلاح 1000-1266/1591-1850
- چھٹا دور: دور زوال1270/1854 تا حال

پچھلے باب میں ہم نے تصوف کی تاریخ کے پہلے تین ادوار کا مطالعہ کیا تھا۔ اس باب میں ہم بقیہ تین ادوار کا مطالعہ کریں گے۔

چوتھا دور: وجودی دور650-1000/1252-1591

ساتویں صدی ہجری تک تصوف مسلمانوں کا بنیادی طرز فکر بن چکا تھا۔ یہاں سے اس کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا جسے ہم نے "وجودی دور" سے تعبیر کیا ہے۔ اس دور کی اہم خصوصیات یہ ہیں:

سیاسی حالات کے تصوف پر اثرات

وجودی دور میں تصوف کی تحریک میں ایک نئی روح پھونکی گئی جس کی وجہ امت مسلمہ کے سیاسی حالات تھے۔ اس زمانے میں سیاسی اعتبار سے امت مسلمہ کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور عباسی سلطنت چھوٹی چھوٹی علاقائی بادشاہتوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ عباسی بادشاہ کو اگرچہ "خلیفہ" کا ٹائٹل حاصل تھا مگر اس کی حیثیت محض ایک کٹھ پتلی کی سی تھی۔ مشرق سے تاتاری اور مغرب سے صلیبی عالم اسلام پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ منگولیا سے اٹھ کر آنے والے تاتاری ایک ایک شہر کو فتح کر کے وہاں کھوپڑیوں کے مینار بناتے چلے آ رہے تھے۔ مسلمانوں کے ہاں عجیب بے چینی کی سی کیفیت تھی اور انہیں کہیں جائے پناہ نہ ملتی تھی۔ ان کے ہاں یہ مقولہ مشہور ہو گیا کہ اگر کوئی تمہیں بتائے کہ تاتاریوں کو شکست ہو گئی تو کبھی یقین نہ کرنا۔ دوسری جانب یورپی اقوام نے دو سو برس میں ترکی، شام اور فلسطین کے علاقوں میں تباہی مچا کر رکھ دی تھی۔ جب مسلمان سیاسی اعتبار سے مغلوب ہوئے تو انہوں نے روحانیت میں پناہ حاصل کرنے کی

کوشش کی جس سے تصوف کو زبردست فروغ ملا۔ ریحان احمد یوسفی لکھتے ہیں:

اس عرصے میں مسلم دنیا کو ایک زبردست سانحے سامنا کرنا پڑا جس نے نہ صرف مسلمانوں کی علمی روایت کو شکست وریخت سے دوچار کر دیا بلکہ وہ حالات پیدا کر دیے جن میں لوگوں کے لیے سکون وعافیت کی واحد جائے پناہ گوشۂ تصوف تھا۔

یہ سانحہ تاتاریوں کا مسلم دنیا پر حملہ تھا جس نے ساتویں صدی ہجری میں وسطی ایشیا سے لے کر مشرق وسطی تک تمام عالم اسلام کو تباہ وبرباد کر کے رکھ دیا۔ مسلم دنیا کے تمام تہذیبی اور علمی مراکز (بجز اسپین کے جو بعد میں مسیحیوں کے ہاتھوں برباد ہو گیا) اس آفت کی نذر ہو گئے۔ اس فتنہ کا نقطۂ عروج بغداد کی تباہی کا سانحہ تھا جو 1258ء (بمطابق 656ھ) میں پیش آیا۔ جس کے بعد مسلم دنیا پر تباہی وبربادی کی وہ المناک رات مسلط ہوئی جس کی مثال انسانی تاریخ میں کم ہی ملتی ہے۔

مسلم معاشرہ، ریاست، سیاست، علم، تہذیب غرض ہر شعبۂ زندگی پر اس کے ایسے منفی اثرات مرتب ہوئے جن سے مسلمان کئی صدیوں تک باہر نہ نکل سکے۔ مسلمانوں نے سیاسی اعتبار سے اپنا کھویا ہوا مقام سلطنتِ عثمانیہ اور مغلیہ سلطنت کی شکل میں کسی نہ کسی طرح واپس لے لیا، لیکن علمی طور پر وہ دوبارہ نہ اٹھ سکے۔ ایسے تباہ حال مسلم معاشرے میں اہل تصوف کا اثر ونفوذ مزید بڑھ گیا۔ خاص کر عالمِ عجم میں تصوف کی مختلف شاخوں اور خانوادوں کے سلسلے پھیلتے چلے گئے۔ اہلِ شریعت کے بالمقابل اہلِ طریقت ہی اصلاً معاشرے کی فکری قیادت کے منصب پر فائز ہو گئے۔

اس دور میں ہندوستان مسلمانوں کا فکری مرکز بن چکا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلم اقتدار کا یہ واحد خطہ تھا جو فتنہ تاتار سے محفوظ رہا تھا۔ چنانچہ پورے وسطی ایشیا، ایران اور مشرق وسطیٰ سے مسلم شرفا، علما اور صوفیا ہجرت کر کے یہاں آ گئے۔ سرزمینِ ہند اپنے سیاسی حالات، تاریخی پس منظر، مذہبی روایت اور فلسفیانہ افکار کی بنا پر تصوف کے پودے کی زرخیزی کے لیے ایک بہترین جگہ تھی۔ چنانچہ شجرِ تصوف یہاں خوب پھلا پھولا اور اس کے بطن سے خواجہ معین الدین چشتی (م627ھ)، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (م633ھ)، خواجہ فرید گنج شکر (م664ھ)، شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی (م665ھ) اور شیخ نظام الدین اولیا (م725ھ) جیسے اکابرینِ تصوف نے جنم لیا۔[1]

خلاصہ بحث یہ کہ ان سیاسی حالات کا نتیجہ یہ نکلا کہ تصوف کو مسلم دنیا میں مزید فروغ حاصل ہوا۔

وحدت الوجود کی دعوت

ساتویں صدی ہجری میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی (558-638/1164-1240) کی شخصیت پیدا ہوئی جس نے تصوف کی دنیا میں پائے جانے والے رجحانات پر غیر معمولی اثر پیدا کیا۔ ان سے پہلے صوفیاء کے ہاں وحدت الوجود کا تصور تو موجود تھا مگر اسے اہل تصوف کے ہاں مرکزی مقام حاصل نہ ہو سکا تھا۔ ابن عربی کی غیر معمولی شخصیت کے نتیجے میں وحدت الوجود کو مین اسٹریم صوفیاء کے ہاں فروغ حاصل ہوا اور یہیں سے یہ تصور صوفیاء میں پھیلتا چلا گیا۔ نہ صرف صوفیاء بلکہ بہت سے ظاہری علماء بھی اس سے متاثر ہوئے۔ نویں صدی ہجری تک پہنچتے پہنچتے وحدت الوجود کو صوفیاء میں متفق علیہ حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔

اس نظریے کے فروغ نے ان صوفیاء کو زبردست قوت عطا کی جو کہ شریعت کی پابندیوں کے قائل نہ تھے۔ بہت سے علاقوں میں صوفیاء

کھلم کھلا شریعت کی مخالفت کرنے لگے۔ قلندریہ اور ملامتی فرقہ کے صوفیاء کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ اگرچہ پابند شریعت صوفیاء اور ناقد تصوف علماء نے ان کی مذمت کی مگر ان کی یہ تنقید بہت زیادہ کامیاب نہ ہو سکی اور قلندری اور ملامتی صوفیاء کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ دوسری طرف یہ تصور بھی عام ہونے کہ ولایت، نبوت سے افضل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ "انبیاء کرام" کی بجائے "صوفیاء کرام" توجہ کا مرکز بننے لگے۔

صوفی سلسلوں کا فروغ اور خانقاہوں کا قیام

اس دور میں صوفی سلسلے مزید پھلے پھولے اور ان کی قائم کردہ خانقاہوں کا جال انڈونیشیا سے لے کر اسپین تک پھیلتا چلا گیا۔ مخلص صوفیاء نے اپنے سلسلوں کو پھیلانے کے لیے غیر معمولی قربانیوں کی ایک تاریخ رقم کی۔ اپنے علاقے چھوڑ چھوڑ کر وہ دور دراز پہاڑی اور صحرائی علاقوں میں پہنچے اور وہاں اپنی دعوت پہنچائی۔ خشکی کے علاوہ انہوں نے سمندری سفر بھی اختیار کیے اور سری لنکا، ملائیشیا، تھائی لینڈ، انڈونیشیا اور چین کے دور دراز علاقوں تک اپنے سلسلے کو پھیلایا۔ ان صوفیاء نے علمائے شریعت کے بالکل برعکس عوامی انداز اختیار کیا۔ انہوں نے مقامی زبانیں سیکھیں، مقامی لباس پہنا، خود کو مقامی رنگ میں ڈھالا اور لوک ورثہ کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے شاعری کو اپنا ذریعہ ابلاغ بنایا جس میں نہایت ہی سادہ انداز میں وہ اپنا پیغام پہنچا دیا کرتے تھے۔ اس شاعری کو قوال، گویے اور طوائفیں تک عوام میں پہنچانے میں اہم کردار ادا کرتے۔ پنجابی، سندھی، براہوی اور پشتو کے تمام بڑے شعراء صوفی ہی تھے۔

اس پورے عرصے میں بہت سے باطنی داعیوں نے بھی صوفیاء کا لبادہ اوڑھ کر ان کی مقبولیت سے فائدہ اٹھایا اور اپنی دعوت ان میں داخل کی۔ ان کی دعوت برصغیر میں خاص کر مغربی ساحلی علاقوں اور شمالی علاقہ جات میں پھیلی۔

تصوف پر تنقید

وجودی دور میں جہاں تصوف پھیلا، وہاں اس پر تنقید نے بھی فروغ پایا۔ علماء کے گروہ میں جہاں اور بہت سے ناقدین تصوف پیدا ہوئے، وہاں علامہ تقی الدین ابن تیمیہ (661-728/1263-1327) کی غیر معمولی شخصیت بھی پیدا ہوئی جس نے تصوف کی جڑوں پر تیشہ چلایا۔ صوفی سیاح ابن بطوطہ (703-779/1304-1377) نے بھی اپنے سفر نامے میں ان کا ذکر کیا ہے۔ ابن تیمیہ کا تعلق موجودہ ترکی کے شہر حران سے تھا مگر ان کی زندگی شام اور مصر میں گزری تھی، جو اس دور میں تصوف کے گڑھ تھے۔ انہوں نے اہل تصوف کے متعدد امور کو تنقید کا نشانہ بنایا جن میں خاص کر مزارات کی زیارت اور وہاں انجام دی جانے والی رسومات پر تنقید تھی۔ مزارات پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> کچھ لوگ بڑی دھوم دھام کے ساتھ مشائخ کی قبور کی زیارت کے لیے سفر کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ اس کو مناسک یا حج تو نہیں کہتے لیکن دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ ان میں سے بعض لوگ جب قسم کھاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ وحق النبی الذی تحج إليه المطايا [اس نبی کے صدقے جس کی جانب سواریاں حج کے لیے جاتی ہیں]۔۔۔ بعض لوگ مقابر کے حج کو حج بیت اللہ پر ترجیح دیتے ہیں۔ بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اگر فلاں بزرگ

کی قبر کی زیارت دو یا تین مرتبہ کر لی جائے تو ایک حج بن جائے گا۔ بعض کسی بزرگ کے مزار کو میدان عرفات قرار دیتے ہیں اور حج کے زمانہ میں سفر کر کے وہاں جاتے ہیں اور اسی طرح وقوف کرتے ہیں جیسے مسلمان میدان عرفات میں کرتے ہیں۔۔۔۔ ان میں سے بہت سے لوگ مساجد کو ویران رکھتے ہیں اور مشاہد [مزارات] کو بڑا آباد و پر رونق۔ ان کی مسجد جو نماز پنجگانہ کے لیے بنائی گئی ہے، بالکل ویران اور بے چراغ نظر آتی ہے، غریب اہل محلہ اگر دری وغیرہ کا انتظام کر دیں تو کر دیں ورنہ یہ بھی نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی سرائے ہے جس کا کوئی پرسان حال نہیں۔ اس کے مقابلہ میں مزار و مقبرہ کا حال یہ نظر آتا ہے کہ پردے اس پر پڑے ہوئے ہیں، سونے چاندی سے اس کو مرصع کیا گیا ہے، سنگ مرمر کا فرش ہے، صبح و شام نذر و نیاز آ رہی ہے۔ کیا یہ اللہ اور اس کی آیات اور اس کے رسول کی کھلی ہوئی تحقیر اور شرک کی علانیہ تعظیم نہیں ہے؟[2]

ابن تیمیہ نے بادشاہ کی اجازت سے ایک جماعت بھی تیار کی جس نے عملی اقدامات کرتے ہوئے متعدد مزارات اور خانقاہوں کو تباہ کیا۔ انہوں نے یہ واضح کیا کہ اصحاب صفہ کا صوفیاء سے کوئی تعلق نہیں تھا اور "ولی اللہ" کے تصور کی وضاحت کرتے ہوئے بیان کیا کہ ولی اللہ کا صوفی ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ ہر نیک اور صالح مسلمان اللہ کا ولی ہے۔[3]

ابن تیمیہ کثیر التصنیف بزرگ ہیں اور بلا مبالغہ ہزاروں صفحات پر مشتمل ان کا کام قدیم و جدید ہر طرز کے علماء کی توجہ کا مرکز بنا۔ ان کے کام کو ناقدین تصوف میں بالخصوص زبردست پذیرائی ملی۔ ان کے کام کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ آٹھویں صدی ہجری کے بعد امت مسلمہ کی پوری فکر صرف دو شخصیات کے کیے ہوئے کام کی بنیاد پر کھڑی ہے۔ تصوف سے متاثر افراد غزالی اور ناقدین تصوف ابن تیمیہ کی کتابوں پر اپنے کام کی بنیاد رکھتے ہیں۔ ابن تیمیہ نے ناقدین تصوف کی ایک پوری جماعت شام کے علاقے میں تیار کر دی۔ ان کے شاگرد ابن قیم (691-751/1292-1350) نے تصوف کی مشہور کتاب "منازل السائرین" کی شرح "مدارج السالکین" سے کی جس میں تفصیل سے تصوف کے ایک ایک تصور کو لے کر دلیل کی قوت سے اس پر تنقید کی۔ اس وقت بھی ناقدین تصوف کی تحریروں کا ماخذ بڑی حد تک یہی کتاب ہے۔

پانچواں دور: شہودی دور یا دور اصلاح 1000-1266/1591-1850

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ نویں صدی ہجری میں وحدت الوجود کو اہل تصوف میں متفق علیہ حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ تقریباً سبھی صوفیاء وجودی رنگ میں رنگے ہوتے اور خود کو ذات باری تعالی میں فنا کرنے کے لیے بے قرار رہتے۔ یہی کیفیت دسویں صدی ہجری تک جاری رہی۔

وحدت الشہود

دسویں صدی ہجری کے اختتام پر ہجری کیلنڈر کے ہزار برس پورے ہو رہے تھے اور مسلم دنیا بھر میں ملینئم سے متعلق نظریات (Millennium Theories) بڑے پیمانے پر گردش میں تھے۔ کسی کا خیال یہ تھا کہ ہزار سال پورے ہونے پر قیامت آ جائے گی اور

کوئی امام مہدی یا حضرت عیسی علیہ الصلوۃ والسلام کی آمد کا اعلان کر رہا تھا۔ ان تمام نظریات کی بنیاد یں احادیث کی بعید از کار تاویلات اور صوفیاء کے کشف پر تھیں۔ بر صغیر میں اپنا اقتدار مضبوط کرنے کے لیے اکبر بادشاہ نے دین الہی کا شوشہ چھوڑا جس میں ہندو مت اور اسلام کے نظریات کو صوفیانہ انداز میں ملا کر ایک نئے دین کو ایجاد کرنا مقصود تھا۔

اس دور میں صوفی شیخ احمد سرہندی (971-1034/1564-1624) پیدا ہوئے جنہوں نے اکبر (reign 1556-1605) کے دین الہی کے خلاف آواز اٹھائی اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ اس سے انہیں پورے بر صغیر کے علماء اور صوفیاء میں غیر معمولی مقام حاصل ہو گیا۔ اکبر کے بیٹے جہانگیر (reign 1605-1627) کے وہ خاصے قریب رہے اور جہانگیر نے ان کی ہدایات پر بڑی حد تک عمل کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جہانگیر کی اولاد میں دو دیندار بادشاہ شاہجہان (reign 1627-1658) اور اورنگ زیب (reign 1658-1707) پیدا ہوئے۔

ایک حدیث میں یہ بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالی ہر سو سال پر ایک مجدد پیدا کرتا ہے جو دین کی تجدید کا فریضہ سر انجام دیتا ہے۔ شیخ احمد سرہندی نے یہ دعوی کیا کہ بالکل اسی طرح یہی کام ایک بڑے پیمانے پر ہزار سال کے بعد بھی ہوتا ہے۔ اب چونکہ امت کا دوسرا ہزار یہ (Millennium) شروع ہو رہا ہے، اس وجہ سے اس کے لیے ایک مجدد کی ضرورت ہے اور وہ ہزار سالہ مجدد، وہ خود ہیں۔ ان کے اس دعوے کو علماء و صوفیاء نے بالعموم تسلیم کرتے ہوئے انہیں "مجدد الف ثانی" کا خطاب دیا جس کا معنی ہے Revitalizer of the Second Millennium۔ اس کی بدولت انہیں کم از کم جنوبی ایشیا کے صوفیاء میں غیر معمولی مرتبہ حاصل ہو گیا۔

شیخ احمد سرہندی نے ابن عربی کے نظریہ وحدت الوجود پر کڑی تنقید کرتے ہوئے یہ بتایا کہ ابن عربی دراصل ایک خاص مقام پر جا کر رک گئے تھے۔ سالکین کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالی کے سوا کوئی وجود نہیں مگر یہ راہ طریقت کا محض ایک مقام ہے۔ اس کے بعد شہود کا مقام ہے جس میں انسان کو اللہ تعالی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا اور اس سے بڑھ کر مقام عبدیت ہے جہاں انسان اللہ تعالی کا بندہ بن جاتا ہے۔ اس پر تفصیلی بحث وحدت الوجود سے متعلق باب میں گزر چکی ہے۔

شیخ احمد نے نہ صرف وحدت الوجود کا متبادل پیش کیا بلکہ انہوں نے یہ بھی بیان کیا کہ کشف و کرامت کی دین میں کوئی حیثیت نہیں اور یہ محض ایک بت ہے۔ ان کے دور کے صوفیاء کے ہاں یہ تصور عام ہو چلا تھا کہ ولایت، نبوت سے افضل ہے۔ انہوں نے اس پر کڑی تنقید کی اور بتایا کہ انبیاء کی ایک سانس تمام اولیاء کی پوری زندگی سے افضل ہے۔ انہوں نے شریعت کی بھرپور حمایت کی اور ان صوفیاء کا رد کیا جو شریعت کو چھوڑ بیٹھے تھے۔ انہوں نے صوفیاء کو یہ بتایا کہ اتباع محمدی کے بغیر نجات ممکن نہیں ہے۔

شیخ احمد کے جنوبی ایشیا کے تصوف پر غیر معمولی اثرات وقوع پذیر ہوئے۔ ان کے زمانے میں ہندوستان دنیا بھر میں تصوف کا عالمی مرکز بن چکا تھا۔ کم از کم جنوبی ایشیا کی حد تک نقشبندی سلسلہ عملاً مجددی سلسلہ بن گیا اور شیخ احمد ہی کے مریدین کے ذریعے آگے چلا۔ ان کی کاوشوں کے نتیجے میں وحدت الوجود کا نظریہ ختم تو نہ ہوا مگر ہندوستان کی حد تک اس کا ایک متبادل سامنے آ گیا۔ چونکہ ان مکتوبات کی

زبان فارسی تھی، اس وجہ سے ان کے اثرات ایران اور وسطی ایشیا تک پھیلے۔ دور جدید میں ان کے مکتوبات دنیا بھر کی زبانوں میں ترجمہ ہو کر پھیل رہے ہیں جس سے وجودی تصوف کا ایک متبادل بقیہ دنیا کے سامنے بھی آ رہا ہے۔

خانقاہی نظام کا انحطاط

پانچویں دور میں اہل تصوف کے نظام میں اندر سے ایک غیر معمولی تبدیلی پیدا ہوئی۔ پچھلے چھ سو برس میں جن صوفی سلسلوں اور جس خانقاہی نظام کا ارتقاء ہوا تھا، وہ پانچویں دور میں ایک خاص مقام پر آ کر رک گیا۔ اب صورتحال یہ پیش آئی کہ صوفی سلسلوں نے جمود اختیار کرنا شروع کیا۔ تیسرے اور چوتھے ادوار میں ایک صوفی شیخ اپنے سب سے لائق مرید کو خلیفہ مقرر کرتا مگر اب اس منصب نے موروثی حیثیت اختیار کر لی۔ میرٹ کی جگہ نسب نے لے لی۔ یہ اصول طے پا گیا کہ باپ کے بعد اس کا بیٹا ہی گدی نشین بن سکتا تھا خواہ اسے تصوف سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو۔ کم و بیش یہی صورتحال اب تک جاری ہے۔ خانقاہوں اور مزارات نے روحانی مراکز کی بجائے عملاً Cash-generating unit کی شکل اختیار کر لی اور پیر زادے دولت کے انبار میں کھیلنے لگے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں وہ اپنے مفادات میں کسی اور کو شریک کیوں کرتے؟

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اہل تصوف کو جس درجے کے مردان کار پہلے دستیاب تھے، اب ان کی جگہ نالائق اور دنیا پرست گدی نشینوں نے لے لی۔ مخلص اور لائق صوفی اپنے پیر زادوں کی وجہ سے تمام صوفیانہ سرگرمیوں سے دستبردار ہونے لگے۔ اس کا براہ راست اثر صوفیاء کی دعوت پر پڑا۔ پیرزادوں اور صاحبزادوں کی نفسیاتی غلامی کا شکار مریدین تو پھر بھی ان سے وابستہ رہے مگر تزکیہ نفس کا جو سلسلہ صوفیاء کے ہاں جاری تھا، وہ ختم ہو کر رہ گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تصوف، جو کہ ترک دنیا کی تعلیمات پر مبنی تھا، اب دنیا پرستی کے لیے استعمال ہونے لگا۔

ناقدین تصوف کی تحریکیں

اہل تصوف کی اندرونی تبدیلیوں کے علاوہ پانچویں دور میں ناقدین تصوف کے ہاں پے در پے ایسی تحریکیں پیدا ہوئیں جنہوں نے تصوف کے بنیادی نظریات پر کاری ضرب لگائی۔ یہ تحریکیں دنیا کے مختلف خطوں میں پیدا ہوئیں۔

شاہجہان (reign 1627-1658) کے آخری زمانے میں ہندوستان میں وحدت الوجود کے ماننے والے صوفیاء دارا شکوہ (1023-1069/1615-1659) کے گرد اکٹھے ہو چکے تھے جو کہ شاہجہان کا سب سے بڑا بیٹا اور ولی عہد تھا۔ دارا شکوہ وحدت الوجود کے عقیدے کی بنیاد پر وحدت ادیان کا قائل بھی تھا اور اسے متعدد غیر مسلم صوفیاء اور جوگیوں کی حمایت حاصل تھی۔ شاہجہان کے آخری زمانے میں اس کے بیٹوں میں اقتدار کی جنگ ہوئی جس میں اس کے بیٹے اورنگ زیب عالمگیر (reign 1658-1707) نے اپنے بھائیوں پر غلبہ پایا۔ بھائیوں کی اس جنگ میں دارا شکوہ مارا گیا اور اس کے ساتھ ہی وجودی صوفیاء کی کمر ٹوٹ کر رہ گئی۔

اورنگ زیب اگرچہ تصوف کا منکر نہ تھا مگر اس کی توجہ کا مرکز دراصل علمائے شریعت ہی تھے۔ اس نے ان کی بھرپور سرپرستی کی اور صوفیاء کے ساتھ بالعموم سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تصوف کو جو سرکاری سرپرستی حاصل رہی تھی، وہ بڑی حد تک کم ہو کر رہ گئی۔ اورنگ زیب کے بعد برصغیر کو ویسے ہی کوئی لائق حکمران نصیب نہ ہوا جس کے نتیجے میں تصوف کی روایت کمزور ہوتی چلی گئی اور مخلص صوفیاء کی جگہ موروثی گدی نشین لیتے چلے گئے۔

اٹھارہویں صدی عیسوی یا بارہویں صدی ہجری میں جزیرہ نما عرب میں شیخ محمد بن عبدالوہاب (1791-1703) کی تحریک پیدا ہوئی جس کا مقصد مزارات پر ہونے والے شرک اور بدعات کا خاتمہ کرنا تھا۔ ابن عبدالوہاب کی تحریک کامیاب رہی اور جزیرہ نما عرب سے آستانوں اور مزارات کا بڑی حد تک خاتمہ کر دیا گیا۔ اس تحریک کو بالعموم "سلفی تحریک" یا "وہابی تحریک" کا نام دیا گیا۔ سلفی ازم کی بنیادی دعوت یہ تھی کہ بعد کی صدیوں میں مسلمانوں نے قرآن و سنت کے احکام میں جو اضافے کر لیے ہیں، ان سے اسلام کو پاک کر کے اس اسلام کی طرف لوٹا جائے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے اور قرآن و سنت کی وہی تعبیر و تشریح اختیار کی جائے جو کہ صحابہ کرام اور ان کے شاگرد تابعین سے منقول ہے۔

سلفی تحریک صرف عرب تک ہی محدود نہ رہی بلکہ اس نے حج پر آنے والے دیگر ممالک کے مصلحین کو بھی متاثر کیا۔ اس زمانے میں لوگ جب حج کرنے جاتے تھے تو مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں کئی کئی سال مقیم رہا کرتے تھے۔ شیخ ابن عبدالوہاب کی سلفی تحریک کے اثرات یمن، شمالی افریقہ، انڈونیشیا اور ہندوستان میں پہنچے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ ان تحریکوں کو "تصوف کی اصلاح" کے نام پر چلایا گیا اور ان کے قائدین زیادہ تر صوفی ہی تھے اور پیری مریدی کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے۔ ان میں لیبیا کے سنوسی (1859-1787)، اور سوڈان کے مہدی سوڈانی (1885-1843) قابل ذکر ہیں۔

اکثر مورخین کا یہ گمان غالب ہے کہ شاہ ولی اللہ دہلوی (1762-1703) جب حج کے لیے مکہ گئے تو وہاں ان کی ملاقات محمد بن عبدالوہاب سے ہوئی اور شاہ صاحب ان کے نظریات سے متاثر ہوئے۔ شاہ صاحب ناقد تصوف نہیں تھے بلکہ ایک بہت بڑے صوفی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی کتابیں تفہیمات الٰہیہ وغیرہ تصوف کی بڑی کتب میں شمار ہوتی ہیں۔ جب وہ ہندوستان واپس آئے تو انہوں نے تصوف میں پائی جانی والی خامیوں پر کڑی تنقید کی۔ ان کا ارادہ پورے صوفیانہ نظام کو ختم کرنے کا نہیں تھا بلکہ اس کی اصلاح کا تھا۔ انہوں نے مزارات پر ہونے والی بدعات اور شرکیہ رسوم کی اصلاح کا عزم کیا اور اس کے لیے ایک جماعت تیار کی۔

جیسا کہ آپ ماڈیول CS02 میں برصغیر کے مذہبی مکاتب فکر کے ارتقاء کی تاریخ میں پڑھ چکے ہیں کہ شاہ صاحب کے زمانے تک شرک و بدعت کی مخالفت کے یہ رجحان بہت زیادہ واضح نہ ہوئے تھے مگر ان کے پوتے شاہ اسماعیل (1831-1779) کے زمانے میں یہ امور بالکل واضح ہوتے چلے گئے۔ شاہ اسماعیل اور ان کے مرشد سید احمد بریلوی (1831-1786) نے شرک و بدعت کے خلاف زبردست مہم چلائی مگر انہوں نے تصوف کے سانچے کو کلیتاً ختم نہیں کیا جس کی وجہ سے وہ تصوف کو ان اثرات سے پاک نہیں کر سکے جنہیں وہ مٹانے

کا عزم کیے ہوئے تھے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے سید ابو الاعلیٰ مودودی (1903-1979) لکھتے ہیں:

پہلی چیز جو مجھ کو حضرت مجدد الف ثانی کے وقت سے شاہ [ولی اللہ] صاحب اور ان کے خلفاء تک کے تجدیدی کام میں کھٹکی ہے، وہ یہ ہے کہ انہوں نے تصوف کے بارے میں مسلمانوں کی بیماری کا پورا اندازہ نہیں لگایا اور نادانستہ ان کو پھر وہی غذا دے دی جس سے مکمل پرہیز کرانے کی ضرورت تھی۔ حاشا کہ مجھے فی نفسہ اس تصوف پر اعتراض نہیں ہے جو ان حضرات نے پیش کیا۔ وہ بجائے خود اپنی روح کے اعتبار سے اسلام کا اصلی تصوف ہے، اور اس کی نوعیت "احسان" سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ لیکن جس چیز کو میں لائق پرہیز کہہ رہا ہوں، وہ متصوفانہ رموز و اشارات اور متصوفانہ زبان کا استعمال، اور متصوفانہ طریقہ سے مشابہت رکھنے والے طریقوں کو جاری رکھنا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ حقیقی اسلامی تصوف اس خاص قالب کا محتاج نہیں ہے۔ اس کے لیے دوسرا قالب بھی ممکن ہے۔ اس کے لیے زبان بھی دوسری اختیار کی جاسکتی ہے۔ رموز و اشارات سے بھی اجتناب کیا جاسکتا ہے۔ پیری مریدی اور اس سلسلے کی تمام عملی شکلوں کو بھی چھوڑ کر دوسری شکلیں اختیار کی جاسکتی ہیں، پھر کیا ضرورت ہے کہ اسی پرانے قالب کو اختیار کرنے پر اصرار کیا جائے جس میں مدت ہائے دراز سے جاہلی تصوف کی گرم بازاری ہو رہی ہے۔ اس کی کثرت اشاعت نے مسلمانوں کو جن سخت اعتقادی و اخلاقی بیماریوں میں مبتلا کیا ہے، وہ کسی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ اب حال یہ ہو چکا ہے کہ ایک شخص خواہ کتنی ہی صحیح تعلیم دے، بہر حال یہ قالب استعمال کرتے ہیں وہ تمام بیماریاں پھر عود کر آتی ہیں جو صدیوں کے رواج عام سے اس کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہیں۔

پس جس طرح پانی جیسی حلال چیز بھی اس وقت ممنوع ہو جاتی ہے جو وہ مریض کے لیے نقصان دہ ہو، اس طرح یہ قالب بھی مباح ہونے کے باوجود اس بنا پر قطعی چھوڑ دینے کے قابل ہو گیا ہے کہ اسی کے لباس میں مسلمانوں کو افیون کا چسکا لگایا گیا ہے اور اس کے قریب جاتے ہی ان مزمن مریضوں کو پھر وہی چنیا بیگم یاد آ جاتی ہیں جو صدیوں ان کو تھپک تھپک کر سلاتی رہی ہیں۔ بیعت کا معاملہ پیش آنے کے بعد کچھ دیر نہیں لگتی کہ مریدوں میں وہ ذہنیت پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے جو مریدی کے ساتھ مختص ہو چکی ہے یعنی "بے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید" [یعنی اگر پیر تمہیں جاء نماز کو شراب سے رنگین کرنے کا حکم دے تو کر گزرو] والی ذہنیت، جس کے بعد پیر صاحب میں اور ارباب من دون اللہ میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ فکر و نظر مفلوج، قوت تنقید ماؤف، علم و عقل کا استعمال موقوف، اور دل و دماغ پر بندگی شیخ کا ایسا مکمل تسلط کہ گویا شیخ ان کا رب ہے اور یہ اسی کے مربوب۔

پھر جہاں کشف و الہام کی بات چیت شروع ہوئی، معتقدین کی ذہنی غلامی کے بند اور زیادہ مضبوط ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد صوفیانہ رموز و اشارات کی باری آتی ہے، جس سے مریدوں کی قوت واہمہ کو گویا تازیانہ لگ جاتا ہے اور وہ انہیں لے کر ایسی اڑتی ہے کہ بے چارے ہر وقت عجائبات و طلسمات ہی کے عالم میں سیر کرتے رہتے ہیں، واقعات کی دنیا میں ٹھیرنے کا موقع غریبوں کو کم ہی ملتا ہے۔

مسلمانوں کے اس مرض سے نہ حضرت مجدد صاحب [شیخ احمد سرہندی] ناواقف تھے، نہ شاہ صاحب۔ دونوں کے کلام میں اس پر تنقید موجود ہے۔ مگر غالباً اس مرض کی شدت کا انہیں پورا اندازہ نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں بزرگوں نے ان بیماروں کو پھر وہی غذا دے دی جو اس مرض میں مہلک ثابت ہو چکی تھی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ دونوں کا حلقہ پھر اسی پرانے مرض سے متاثر ہوتا چلا گیا۔ (فٹ نوٹ: حضرت مجدد صاحب کی وفات پر کچھ زیادہ دن نہ گزرے تھے ان کے حلقہ کے لوگوں نے ان کو قیوم اول کا اور ان کے خلفاء کو قیوم ثانی کا خطاب عطا کر دیا، معاذ اللہ۔) اگرچہ مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ کر ٹھیک وہی روش اختیار کی جو ابن تیمیہ کی تھی، لیکن شاہ ولی اللہ صاحب کے لٹریچر میں تو یہ سامان موجود ہی تھا، جس کا کچھ اثر شاہ اسماعیل شہید کی تحریروں میں بھی باقی رہا، اور پیری مریدی کا سلسلہ بھی سید [احمد

بریلوی]صاحب کی تحریک میں چل رہا تھا۔ اس لیے مرض صوفیت کے جراثیم سے یہ تحریک پاک نہ رہ سکی، حتیٰ کہ سید صاحب کی شہادت کے بعد ہی ایک گروہ ان کے حلقہ میں ایسا پیدا ہو گیا جو شیعوں کی طرح ان کی غیبوبت[غائب ہونا] کا قائل ہوا اور اب تک ان کے ظہورِ ثانی کا منتظر ہے۔

اب جس کسی کو تجدید دین کے لیے کوئی کام کرنا ہو، اس کے لیے لازم ہے کہ متصوفین کی زبان و اصطلاحات سے، رموز و اشارات سے، لباس و اطوار سے، پیری مریدی سے، اور ہر اس چیز سے جو اس طریقہ کی یاد تازہ کرنے والی ہو، مسلمانوں کو اس طرح پرہیز کرائے جیسے ذیابیطس کے مریض کو شکر سے پرہیز کرایا جاتا ہے۔[4]

یہ تو تھا جنوبی ایشیا کے ناقدین تصوف کا احوال۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ عالم اسلام کے مرکز میں کیا صورتحال تھی؟ اس زمانے میں عالم اسلام کا مرکز ترکی ہوا کرتا تھا جو کہ تصوف کا گڑھ تھا۔ یہاں قونیہ میں مولانا جلال الدین رومی (603-671/1207-1273) کا مزار ہے جسے ترکی میں وہی حیثیت حاصل ہے جو پاکستان میں مثلاً حضرت علی ہجویری (c. 379-465/990-1072) یا ہندوستان میں خواجہ معین الدین چشتی (535-627/1141-1230) کے مزار کو حاصل ہے۔ مولانا روم سے منسوب مولوی سلسلے کے علاوہ یہاں بختاشی (یا بیک تاشی) سلسلہ بھی پھیلا ہوا ہے جو اپنے عقائد و نظریات میں اہل سنت کے عقائد سے کافی دور ہیں۔ ترکی میں علمائے شریعت کی جانب سے تو تصوف پر تنقید کی کوئی بڑی تحریک پیدا نہیں ہوئی تاہم ایک اور جانب سے ایسا معاملہ پیش آیا جس نے صوفیانہ نظریات پر کاری ضرب لگائی۔

سولہویں اور سترہویں صدی میں ترکی، یورپ کے مقابلے میں کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی میں بڑی حد تک یورپ ترکی سے مادی ترقی میں آگے نکل چکا تھا۔ ترکی اور یورپ کے مختلف ممالک کے مابین گہرے تجارتی تعلقات بھی قائم تھے جس کی وجہ سے یہاں کے لوگ اکثر یورپ آتے جاتے رہتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اہل ترکی میں "ماڈرنائزیشن" بلکہ "یورپینائزیشن" کی تحریک پیدا ہوئی۔ انیسویں صدی میں اس تحریک نے خود کو "ینگ ترکس" کی صورت میں بڑی حد تک منظم کر لیا۔ اس تحریک کے نظریات صرف تصوف ہی کے خلاف نہ تھے بلکہ یہ بحیثیت مجموعی مذہب کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے تھے۔ ترکی کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ اس تحریک کے قریب آتا چلا گیا جس سے اہل مذہب کا بالعموم اور اہل تصوف کا بالخصوص اثر ترکی کی جدید نسل پر کم ہوتا چلا گیا۔

انیسویں صدی کے نصف تک صورتحال یہ تھی کہ عالم اسلام دنیا میں اپنی سیاسی طاقت کھو چکا تھا۔ اس وقت سے ایک صدی پہلے تک مسلمان دنیا کی تین بڑی سپر پاورز، عثمانی، صفوی اور مغلیہ سلطنتوں کے مالک تھے مگر اب مغلیہ سلطنت انگریزوں کی عملداری میں جا چکی تھی، صفوی سلطنت کا اقتدار اگرچہ مضبوط تھا مگر کسی حد تک کمزور ہو چکا تھا اور سلطنت عثمانیہ کو یورپ کا مرد بیمار (Scourge of Europe) کہا جاتا تھا۔ پستی کے اس عالم میں جہاں مسلمانوں کی زندگی کے اور شعبے متاثر ہوئے، وہاں تصوف کی روایت بھی ان کے ہاں کسی حد تک کمزور ہوئی۔

چھٹا دور: دور زوال 1266/1850 تا حال

1850 سے لے کر 1950 تک کا زمانہ مسلمانوں کا دور غلامی سمجھا جاتا ہے۔ اس زمانے میں ایشیا اور افریقہ میں مسلم علاقے بڑی حد تک اہل یورپ کے قبضے میں جا چکے تھے۔ اب ہم دنیا کے مختلف خطوں میں تصوف کی روایت کا جائزہ لیتے ہیں۔

ترکی

پہلی جنگ عظیم (1914-1918) میں ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا اور اس جنگ کے خاتمے پر اسے شکست ہوئی۔ یورپی طاقتوں نے سلطنت عثمانیہ کو بہت سے چھوٹے چھوٹے ممالک میں تقسیم کر دیا۔ ترکی میں خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ہو گیا اور یہاں مصطفی کمال (reign 1923-1938) کی سیکولر حکومت قائم ہوئی۔

کمالسٹوں نے اہل مذہب کو بالعموم اور اہل تصوف کو بالخصوص سائیڈ لائن کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ صوفی بزرگ بدیع الزماں سعید نورسی (1873-1960) نے کمال ازم کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور قید و بند کی صعوبتیں بھی سہیں۔ صوفی سلسلوں نے کمالسٹوں کے جبر کا کئی عشروں تک ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ 1970 کے عشرے میں مشہور صوفی بزرگ فتح اللہ گولن (b. 1941) نے ایک زبردست تحریک شروع کی۔ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ ترکی کے صوفی میڈیا اور بیوروکریسی پر چھائے ہوئے ہیں اور ترکی کے وزیر اعظم اور صدر کا تعلق بھی فتح اللہ گولن کی صوفی تحریک سے ہے۔ گولن کو صحیح معنوں میں ترکی میں تصوف کا مجدد کہا جا سکتا ہے۔ ان کی تحریک کی مزید تفصیلات کا مطالعہ ہم ماڈیول CS06 میں کریں گے۔

مشرق وسطی اور شمالی افریقہ

بیسویں صدی کے نصف اول میں سلفی تحریک کے اینٹی تصوف اثرات عالم اسلام کے طول و عرض میں پہنچ رہے تھے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں عرب کے حرمین شریفین پر بھی سعودی حکومت قائم ہو گئی جس کے نتیجے میں مکہ اور مدینہ میں تمام مزارات گرا دیے گئے اور تمام آستانوں کا خاتمہ کر دیا گیا۔ ایسا نہیں ہوا کہ تصوف کی روایت عرب میں بالکل ختم ہو گئی ہو، مگر یہ زیر زمین چلی گئی۔

سعودی عرب کے علاوہ عرب امارات، کویت، قطر اور بحرین میں بھی صوفی روایت کمزور پڑ گئی۔ یمن میں قاضی شوکانی (1759-1834) کے زمانے سے ناقدین تصوف سرگرم عمل رہے ہیں۔ تاہم چونکہ یہاں زیدی فرقہ کی اکثریت ہے، اس وجہ سے اہل سنت کے صوفی اور ناقدین تصوف کے ہاں اس درجے کی سرگرم کشمکش نہیں ہے جو مثلاً برصغیر میں نظر آتی ہے۔ شمالی افریقہ اور مصر کے علاقوں میں اینٹی صوفی تحریکیں چلیں جس کے نتیجے میں تصوف کی روایت کمزور پڑی مگر بالکل ختم نہ ہو سکی۔ شمالی افریقہ کی سنوسی تحریک صوفیا ہی پر مبنی تھی مگر تصوف کے بعض امور کی ناقد بھی تھی۔

عالم عرب میں بیسویں صدی کے نصف آخر میں ایک غیر معمولی کام ہوا۔ علامہ ناصر الدین البانی (1914-1999)، شیخ شعیب ارناؤط

(b. 1928) اور بہت سے محققین نے حدیث کے صحیح، ضعیف یا موضوع ہونے کو متعین کرنے کے عمل کا آغاز کیا۔ اس سے پہلے صرف صحاح ستہ کی احادیث کی صحت کو پرکھا جا سکا تھا۔ عرب علماء نے اس دائرے کو بہت وسیع کر دیا اور تیسرے اور چوتھے درجے کی کتب حدیث کو اپنی تحقیق کا ہدف بنایا۔ مسند احمد، طبرانی، بیہقی اور دار قطنی وغیرہ کی کتب پر تفصیلی تحقیقی کام ہوا اور یہ جاننے کی کوشش کی گئی کہ ان کتب میں موجود کون سی حدیث صحیح ہے اور کون سی ضعیف؟ کون سی حدیث اصلی ہے اور کون سی جعلی؟

اس حقیقت کو بہت سے صوفی علماء بھی مانتے ہیں کہ ان کے ہاں چونکہ ضعیف اور موضوع روایات بکثرت پائی جاتی ہیں اور ان میں سے بہت سی روایات تو ایسی ہیں جو کہ عام آدمی کی زبان پر بھی جاری و ساری ہیں۔ عرب علماء کے اس کام کا براہ راست اثر تصوف پر یہ پڑا کہ ان احادیث کی اصلیت لوگوں کے سامنے آشکار ہو گئی۔ پہلے مرحلے میں صرف عالم عرب میں یہ معاملہ پیش آیا تو شام اور اردن کے صوفیاء نے البانی کی ذات کو ہدف بنانا شروع کیا۔ دوسرے مرحلے میں جب ان کتب کے تراجم دیگر زبانوں میں ہو کر عالم اسلام میں پھیلے تو ان حضرات پر ترکی اور پاکستان کے صوفیاء کی جانب سے شدید تنقید کی گئی۔ تاہم اس وقت تک یہ عمل جاری ہے اور فریقین کسی حتمی نتیجے تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ البانی اور ان کے ساتھیوں کا کام جیسے جیسے عالم اسلام کی نئی نسل تک پہنچ رہا ہے، ویسے ویسے ان ضعیف و موضوع احادیث کا طلسم ٹوٹ رہا ہے۔

وسطی ایشیا

تصوف کا ایک بڑا مرکز وسطی ایشیا تھا۔ 1917 میں روس میں کمیونسٹ انقلاب آیا تو لینن اور اسٹالن کی حکومتوں نے مذہب مخالف پالیسی اختیار کی۔ انہوں نے وسطی ایشیا کے مقبوضات جن میں موجودہ قازقستان، ازبکستان، ترکمانستان، تاجکستان، آرمینیا اور جارجیا کے علاقے شامل تھے، میں مذہب کو کچلنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مدارس اور خانقاہوں پر پابندی عائد کی۔ اس سے بھی تصوف کو زبردست نقصان پہنچا تاہم صوفیاء زیر زمین کام کرتے رہے۔ 1991 میں روس سے آزادی کے بعد صوفی سلسلے دوبارہ میدان عمل میں آ چکے ہیں اور خاص کر نقشبندی سلسلے کو وسط ایشیا میں بہت فروغ حاصل ہو رہا ہے۔

جنوبی ایشیا

تصوف کا سب سے بڑا مرکز ہندوستان تھا جہاں 1857 کی جنگ آزادی نے مسلمانوں کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ اس وقت یہاں کے اہل تصوف بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم تھے۔ ایک حصہ ان عام سجادہ نشینوں اور آستانوں کے مجاوروں پر مشتمل تھا جو قرون وسطی کی صوفی روایت کو لے کر چل رہے تھے۔ دوسرا حصہ سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل کے مریدین پر مشتمل تھا جو کہ مزار پرستی اور شرک و بدعت کے خلاف تھے۔ انہوں نے مسلح جدوجہد کر کے اسلامی ریاست قائم کرنے کی کوشش کی تھی اور 1831 میں بالا کوٹ کی جنگ میں ان کی بڑی تعداد جاں بحق ہو چکی تھی۔ پھر بھی سید صاحب کی تحریک کی باقیات برصغیر کے طول و عرض میں موجود تھیں۔

اہل تصوف کے پہلے گروہ نے انگریزوں سے بالعموم مصالحت کی پالیسی اختیار کی جس کے نتیجے میں ان کے مزارات اور آستانے قائم

رہے۔ دوسرے گروہ نے بھی کچھ عرصے بعد دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس کی مدد سے خود کو منظم کر لیا۔ 1906 میں پہلے گروہ کے عالم مولانا احمد رضا خان بریلوی (1856-1921) نے چار بڑے علمائے دیوبند پر کفر کا فتوی عائد کیا جس کے نتیجے میں دونوں گروہوں میں تفریق بالکل واضح ہو گئی اور اہل تصوف واضح طور پر بریلوی اور دیوبندی میں تقسیم ہو گئے۔ اس کی تفصیل کا مطالعہ آپ ماڈیول CS02 میں کر چکے ہیں۔ بعض صوفی حلقے ایسے بھی تھے جنہوں نے اس تقسیم میں کسی ایک گروہ کو اختیار کرنے کی بجائے غیر جانبداری کی پالیسی اختیار کی۔

دیوبندی صوفیا

دیوبندی صوفیاء میں مولانا اشرف علی تھانوی (1863-1943) ایک بڑے عالم اور صوفی تھے۔ انہوں نے تصوف کی تجدید کا عزم کیا۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ صوفیاء میں جو بدعات اور شرکیہ رسوم در آئی ہیں، ان سے پاک کر کے اسے خالص اسلامی تصوف بنایا جائے۔ ہمیں ان کی تصوف سے متعلق کتب تو دستیاب نہیں ہو سکیں تاہم اس کے بعض اقتباسات ہم یہاں عبدالرحمن کیلانی صاحب کی کتاب "شریعت و طریقت" کے حوالے سے پیش کر رہے ہیں جس سے اندازہ ہو گا کہ مولانا تصوف میں کس نوعیت کی اصلاحات کرنا چاہتے تھے۔

ذکر کے معنی یاد تو سب طریقہ سے ہوتی ہے، نہ کہ محض زبان ہی سے نام لے لے۔ کیا یہ یاد ہے کہ جس کی یاد کا دعوی ہو، نہ اس سے بات کرے، نہ اس کے خط کا جواب دے، نہ اس سے ملے، نہ اس کا کہنا مانے۔۔۔

افسوس! ستیاناس کر دیا تصوف کا ان جاہل صوفیوں نے اور فقیری کو ہاؤ وہو بنا رکھا ہے۔ کہتے ہیں، چلے کھینچو، بیوی کو طلاق دے دو، اولاد کو عاق کر دو، دروازہ کو تیغا کر دو اور ایک چنا روز کھاؤ۔ بدوں اس کے اصل فقیری نہیں ملتی۔۔۔

بہت کم کھانا بھی زہد نہیں نہ یہ مقصود ہے کہ ہمارے کم کھانے سے نعوذ باللہ خدا تعالی کے خزانہ میں توفیر [کثرت] تھوڑا ہی ہو جائے گی۔ ہاں اتنا بھی نہ کھائے کہ پیٹ میں درد ہو جائے۔ ہمارے حاجی [امداد اللہ مہاجر مکی] صاحب کا مذاق [ذوق] تو یہ تھا کہ نفس کو خوب آرام سے رکھے لیکن اس سے کام بھی خوب لے۔۔۔

لوگ استغراق کو بڑی چیز سمجھتے ہیں کہ جب تک ہم بے عقل و مدہوش نہ ہوئے تو کمال ہی کیا ہے۔ صاحبو! اللہ تعالی کام ہوش بڑھانے کے لیے لیا جاتا ہے نہ کہ کھونے کے لیے۔۔۔

لوگ کشف کو بڑا کمال سمجھتے ہیں، حالانکہ اس کو قرب [الہی] میں کچھ دخل نہیں۔۔۔ اصل چیز تو عبدیت ہے۔۔۔

خوارق [کرامات] کا ہونا ولایت کے لیے ضروری نہیں۔ بعض صحابہ سے عمر بھی ایک خرق عادت بھی واقع نہیں ہوا۔ خوارق اکثر جوگیوں سے واقع ہوتے ہیں۔ یہ ثمرہ ریاضت [مشق] کا ہے۔۔۔ عارفین کی بڑی کرامت یہ ہے کہ شریعت پر مستقیم ہوں۔۔۔

توجہ و تصرف بھی نہ کوئی مقصود و مامور امر ہے نہ فی نفسہ کوئی کمال و قرب اور ولایت و مقبولیت کی علامت بلکہ نفس و خیال کی ایک قوت ہے۔ جو خیال و توجہ میں یکسوئی کی مشق سے مقبول کیا، مردود سے مردود شخص بھی حاصل کر سکتا ہے۔ پرانے زمانے میں سحر یا جادوگری اور آج کل کے

مسمریزم اور عمل تنویم [ہپناٹزم] کا بر امدار یہی ہے۔۔۔ بزرگی کا معیار لوگوں نے یہ بھی تراش رکھا ہے کہ جو شخص آنکھیں چار ہوتے ہی مدہوش کر دے، اٹھا کر زمین پر پٹک دے، وہ بڑا بزرگ ہے۔ حالانکہ یہ بالکل لغو ہے۔ اگر یہ بزرگی ہے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ضرور اس کو برتنا چاہیے تھا۔۔۔

بعض سمجھتے ہیں کہ پیر بخشش کے ذمہ دار ہو جائیں گے حالانکہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ [رضی اللہ عنہا] کو فرمادیا تھا، "فاطمہ! اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ" تو بھلا اور کون پیر کسی مرید کو بچا سکتا ہے۔[5]

مولانا تھانوی ہی کے سلسلہ ارادت کے ایک صوفی بزرگ خواجہ عبدالحکیم انصاری (1977-1893) لکھتے ہیں:

ائمہ عظام کے بعد اولیائے کرام کا نمبر ہے۔ ہم ان کی بابت کیا لکھیں؟ ماشاءاللہ زندہ اور مردہ لاکھوں اور کروڑوں ہی ہیں اور ان میں سے ایک کو "ارباب من دون اللہ" میں کا ایک رب بنا دیا گیا ہے۔ ان بزرگان دین میں سب سے زیادہ قابل ذکر ذات ستودہ صفات جناب حضرت سید شیخ عبدالقادر جیلانی کی ہے جن کو لوگ "بڑے پیر" یا "غوث الاعظم دستگیر" کے نام سے پکارتے اور سمجھتے ہیں کہ یہ لوگوں کی بگڑی بنا سکتے اور اللہ تعالی کی طرف سے نازل کی ہوئی مصیبتوں کو ٹال سکتے ہیں۔ یہ لوگ اٹھتے بیٹھتے ہر وقت یا غوث الاعظم دستگیر کے نعرے لگاتے ہیں اور کبھی بھول کر بھی اللہ کا لفظ زبان پر نہیں لاتے۔ اب اگر آپ کی زندگی اور تعلیم کا مطالعہ اور تحقیق کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ دنیا کے تمام اولیاء میں سب سے زیادہ متقی، پرہیز گار اور کتاب و سنت کے پابند تھے اور آپ کی بزرگی و بڑائی ہر گز اس میں نہ تھی کہ آپ سفید کو سیاہ اور سیاہ کو سفید کر دکھاتے، لوگوں کو مرادیں بر لاتے، غریبوں کو امیر بناتے، بے اولادوں کو اولاد عطا کرتے، بیماروں کو شفا دیتے، مردوں کو زندہ کرتے یا بارہ برس کی ڈوبی ہوئی روایتی ناؤ نکال کر دکھا دیتے تھے۔ بلکہ آپ کی ساری عظمت و شان اس بات میں مضمر ہے کہ ساری عمر کوئی فعل آپ سے خلاف سنت سرزد نہیں ہوا، نہ کوئی قول خلاف شریعت آپ کی زبان مبارک سے نکلا۔[6]

دیوبندی حلقے ہی کے ایک بزرگ مولانا محمد الیاس کاندھلوی (1944-1885) نے 1926 میں تبلیغی جماعت قائم کی جو چند ہی عشروں میں عالم اسلام کی سب سے بڑی دعوتی تحریک بن گئی۔ تبلیغی جماعت کی دعوت کا مطالعہ ہم دینی تحریکوں سے متعلق ماڈیول CS06 میں کر رہے ہیں تاہم یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ تبلیغی جماعت کے پروگرام کا بڑا حصہ تصوف سے متاثر ہے۔ جماعت کی غیر معمولی کاوشوں کے نتیجے میں تصوف کی روایت کو ایک نیا سہارا ملا۔

بریلوی صوفیاء

ایک طرف دیوبندی صوفیاء، تصوف میں ترمیم و اصلاح کی کوشش کر رہے تھے مگر دوسری جانب بریلوی صوفیاء نے اسٹیٹس کو کو بر قرار رکھا۔ ان کی کاوشوں کا محور یہ رہا کہ مزارات اور آستانے، جو کئی صدیوں سے بر صغیر کے طول و عرض میں قائم تھے، کی حیثیت بر قرار رہے۔ مریدین کے جو حلقے قائم ہیں، بر قرار رہیں۔ ناقدین تصوف کی تنقیدات کا جواب بھی دیا گیا اور دیوبندی تصوف کی صورت میں انہیں جو چیلنج درپیش تھا، اس کا مقابلہ کرنے کی بھی ہر ممکن کوشش کی گئی۔

1980 کے عشرے میں بریلوی مکتب فکر کے ہاں تین زبردست تحریکوں کا آغاز ہوا جو اپنی اصل میں صوفی تحریکیں ہی ہیں۔ ڈاکٹر طاہر

القادری (b. 1951) کی "تحریک منہاج القرآن" نے جدید تعلیم یافتہ طبقے کو تصوف کی طرف مائل کیا اور مولانا محمد الیاس قادری (b. 1950) کی "دعوت اسلامی" نے نسبتاً کم تعلیم یافتہ طبقے کو۔ ان کے علاوہ ریاض احمد گوہر شاہی صاحب (2002-1941) نے "انجمن سرفروشان اسلام" قائم کی تاہم گوہر شاہی صاحب نے امام مہدی ہونے کا دعوی بھی کر دیا جس کی وجہ سے وہ بریلوی حلقوں میں بھی مقبول نہ رہے۔ ان تحریکوں کا مطالعہ آپ ماڈیول CS06 میں کر سکتے ہیں۔ یہاں اتنا بتانا ضروری ہے کہ اہل تصوف کی ان تینوں تحریکوں کے نتیجے میں تصوف کی مٹتی ہوئی روایت کو ایک نئی زندگی ملی۔

جنوبی ایشیا کے ناقدین تصوف

دوسری جانب برصغیر میں ناقدین تصوف بھی بہت متحرک رہے ہیں۔ سلفی تحریک شاہ ولی اللہ کے زمانے سے جنوبی ایشیا میں بھی سرگرم ہے اور تصوف پر تنقید کے نتیجے میں بہت بڑا اینٹی تصوف لٹریچر تیار ہو چکا ہے۔ پاکستان کے سلفی علماء میں علامہ احسان الٰہی ظہیر (1945-1987) نے "تصوف: تاریخ و حقائق" نامی کتاب لکھی۔ ان کے علاوہ سنجیدہ سلفی عالم عبدالرحمن کیلانی (d. 1995) نے "شریعت و طریقت" کے عنوان سے تصوف پر ایک مفصل تنقید سپرد قلم کی۔

تصوف پر تنقید کے معاملے میں ان علماء کا کردار بھی بہت اہم ہے جو کسی مخصوص مسلک سے تعلق نہ رکھتے تھے اور جنہیں ماڈیول CS02 میں ہم نے "ماورائے مسلک" علماء سے تعبیر کیا ہے۔ ان میں خاص کر علامہ اقبال (1938-1877)، مولانا ابو الکلام آزاد (1957-1888)، سید ابوالاعلیٰ مودودی (1979-1903) اور مولانا امین احسن اصلاحی (1998-1904) قابل ذکر ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد بذات خود پیر زادے تھے اور ان کے والد ایک بہت بڑے گدی نشین تھے۔ انہوں نے لوگوں کو آزادانہ انداز میں سوچنے سمجھنے کی ترغیب دی۔ اپنی کتابوں تذکرہ اور غبار خاطر میں انہوں نے تصوف کے بعض بنیادی پہلوؤں پر سوال اٹھائے۔ مولانا ایک زمانے میں زبردست مقبول ہوئے اور ان کی کتابیں جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں میں بڑے پیمانے پر پڑھی گئیں۔ علامہ اقبال کی شاعری تصوف سے متعلق دو متضاد رجحانات کی حامل ہے۔ ایک طرف وہ مولانا جلال الدین رومی (603-671/1207-1273) کو اپنا "مرشد رومی" قرار دیتے ہیں اور خود کو "مرید ہندی" سمجھتے ہوئے صوفیانہ نکات بیان کرتے ہیں۔ دوسری جانب وہ تصوف کے مختلف پہلوؤں پر کڑی تنقید کرتے نظر آتے ہیں۔

> [علامہ اقبال نے] فرمایا: تصوف ہمیشہ انحطاط کی نشانی ہوتا ہے۔ یونانی تصوف، ایرانی تصوف، ہندوستانی تصوف، سب انحطاط قومی کے نشان ہیں۔ اسلامی تصوف بھی اسی حقیقت کو عیاں کرتا ہے۔ اسلام کے اولین دور کے صوفی زہاد [زاہد کی جمع] تھے۔ زہد اور تقوی ان کا مقصد تھا۔ بعد کے تصوف میں مابعد الطبیعات (Metaphysics) اور [فلسفے کے] نظریات شامل ہو گئے۔ تصوف اب محض زہد نہیں رہتا، اس میں فلسفہ کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ ہمہ اوست [وحدت الوجود] مذہبی مسئلہ نہیں، یہ فلسفہ کا مسئلہ ہے۔ "وحدت اور کثرت" کی بحث سے اسلام کو کوئی سروکار نہیں، اسلام کی روح توحید ہے اور اس کی ضد کثرت نہیں بلکہ شرک ہے۔۔۔۔ تصوف نے سائنٹفک روح کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ڈاکٹر کے

پاس نہیں جاتے، تعویذ تلاش کرتے ہیں۔ گوش و چشم کو بند کرنا اور صرف چشم باطن پر زور دینا جمود اور انحطاط ہے۔ قدرت کی تسخیر جد وجہد سے کرنے کی جگہ سہل طریقوں کی تلاش ہے۔ "شجر ممنوعہ" میرا خیال ہے تصوف سے مراد ہے۔ (ملفوظات مرتبہ محمود نظامی)

آج کل کا مسلمان یونانی و ایرانی تصوف کی ان تاریک وادیوں میں بے مقصد و مدعا ٹامک ٹوئیاں مارتے پھرنے کو ترجیح دیتا ہے۔ جس کی تعلیم یہ ہے کہ گرد و پیش کے حقائق ثابتہ سے آنکھیں بند کر لی جائیں اور توجہ اس نیلی، پیلی اور سرخ روشنی پر جما دی جائے جسے "اشراق" کا نام دے دیا گیا ہے۔ یہ در حقیقت دماغ کے ان خانوں سے پھوٹ پھوٹ کر نکلتی ہے جو ریاضت کی کثرت و تواتر کے باعث ماؤف ہو چکے ہیں۔ میرے نزدیک یہ خود ساختہ تصوف اور یہ "فنائیت" یعنی حقیقت کو ایسے مقام پر تلاش کرنا جہاں اس کا وجود ہی نہ ہو، دراصل ایک بدیہی علامت ہے جس سے عالم اسلام کے روبہ انحطاط ہونے کا سراغ ملتا ہے۔

دنیائے قدیم کی تاریخ ذہنی کے مطالعے سے یہ نہایت اہم حقیقت آپ پر منکشف ہو جائے گی کہ زوال پذیر قوموں اور گروہوں نے ہر دور میں اس خود ساختہ تصوف اور فنائیت کے اوٹ میں پناہ لی ہے۔ جب روح حیات فنا ہو جاتی ہے اور زمان و مکان کے مسائل سے دست و گریباں ہونے کی ہمت باقی نہیں رہتی، تو داعیان انحطاط ایک مزعومہ ولایت و سرمدیت کی تلاش میں لگ جاتے ہیں۔[7]

مولانا مودودی نے براہ راست تصوف کو تنقید کرنے سے اجتناب کیا تاہم انہوں نے مذہبی رجحان رکھنے والے نوجوانوں میں تنقیدی طرز فکر کو عام کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ مولانا کی کاوشوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی عقل کو اہمیت دینے لگے اور اس کے ذریعے دین کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔ ان کے ذہنوں میں یہ سوالات پیدا ہوئے کہ اگر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے درجے کے شخص سے دو چادروں کا حساب لیا جا سکتا ہے تو پھر آج کے دور میں وہ کون سے پیر صاحب ہو سکتے ہیں جن کے بارے میں ذہن میں اعتراض کا لانا ہی جرم قرار پائے؟

مولانا امین احسن اصلاحی نے ایک قدم آگے بڑھ کر خالصتاً کتاب و سنت کی بنیاد پر تزکیہ نفس کا ایک غیر صوفی ماڈل پیش کیا۔ انہوں نے صوفیانہ ماڈل کی کمزوریوں پر جا بجا اپنی کتاب "تزکیہ نفس" میں تنقید کی ہے جس کا مطالعہ آپ پچھلے ابواب میں کر چکے ہیں۔ انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ پہلے جماعت اسلامی اور پھر اپنے حلقہ تدبر قرآن میں تزکیہ نفس کے اس ماڈل کو عملاً رائج بھی کیا۔

تصوف کے اثرات کو کم کرنے میں ایک اہم عنصر جدید تعلیم کا فروغ تھا جس کی بنیاد سر سید احمد خان (1817-1898) نے رکھی تھی۔ انہوں نے علی گڑھ تحریک کے ذریعے مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف مائل کیا۔ اس تعلیم میں اور کوئی خصوصیت ہو یا نہ ہو مگر یہ انسان کو تنقیدی انداز میں غور و فکر پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہ درست ہے کہ بہت سے جدید تعلیم یافتہ افراد بھی صوفی حلقوں سے وابستہ ہوتے ہیں تاہم یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے نزدیک دین و مذہب بس مان لینے کی چیز ہوتی ہے، کوئی عقلی اور شعوری دریافت نہیں ہوتی۔

تصوف اور انفارمیشن ایج

1990 کے عشرے میں جب انٹرنیٹ مسلم دنیا میں آیا تو دعوت دین کا جذبہ رکھنے والے سبھی حلقوں نے اسے اپنی دعوت پھیلانے کا

ذریعہ سمجھا۔ ان میں اہل تصوف اور ناقدین تصوف دونوں ہی حلقے شامل تھے۔ عرب و عجم میں اب یہ رجحان زور پکڑ چکا ہے کہ تمام کتابوں کو ڈیجیٹائز کر کے انٹرنیٹ پر بلا معاوضہ مہیا کر دیا جائے۔ اس وقت انٹرنیٹ پر اسلام پر سے متعلق سب سے زیادہ کتب عربی زبان میں دستیاب ہیں اور اس کے بعد اردو کا نمبر ہے۔ بقیہ زبانوں کے بارے میں ہمیں زیادہ علم نہیں ہے۔ غالباً انڈونیشی، فارسی اور بنگلہ زبانوں کی اسلامی کتب بھی بڑی تعداد میں دستیاب ہو چکی ہیں۔ ان کتابوں میں اہل تصوف کی کتب بھی ہیں اور ناقدین تصوف کی بھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ قارئین کے پاس دونوں فریقوں کی کتب آ چکی ہیں اور اب ان کے لیے یہ بہت آسان ہو گیا ہے کہ وہ ان کتب کا تقابلی مطالعہ کر کے کوئی رائے قائم کر سکیں۔

انفارمیشن ایج میں "آن لائن خانقاہ" کا ایک نیا تصور وجود پذیر ہو رہا ہے۔ بہت سے صوفی سلسلوں اور حلقوں نے اپنی ویب سائٹس قائم کر لی ہیں جن کے ذریعے ان کے شیوخ کے بیانات، تقاریر، کتب وغیرہ پھیلائی جا رہی ہیں۔ بعض صوفی سلسلوں نے باقاعدہ ٹی وی چینل بھی قائم کر رکھے ہیں۔ دوسری جانب ناقدین تصوف بھی انہی ذرائع کو استعمال کر رہے ہیں۔ انفارمیشن ایج سے تصوف کو فائدہ ہوا ہے یا نقصان، اس بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہو گا تاہم اس کا فیصلہ آنے والے چند عشرے کر دیں گے۔

اسائن منٹس

- تصوف کے آخری تین ادوار کی امتیازی خصوصیات کا چارٹ تیار کیجیے اور ان کا موازنہ پہلے تین ادوار سے کیجیے۔
- اس باب میں جن مشہور شخصیات کا ذکر ہوا ہے، ان کے حالات زندگی انٹرنیٹ پر تلاش کیجیے۔
- تصوف کی جو تاریخ ہم نے بیان کی ہے، اس کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔ آپ کے خیال میں کیا تصوف کی تاریخ کے ادوار یہی ہیں؟

---

[1] ریحان احمد یوسفی۔ انسان کا مسئلہ۔

[2] ابن تیمیہ۔ الرد علی البکری، بحوالہ تاریخ دعوت و عزیمت حصہ دوم از ابوالحسن علی ندوی۔

[3] ابن تیمیہ۔ اصحاب صفہ اور تصوف کی حقیقت۔

[4] سید ابوالاعلی مودودی۔ تجدید و احیائے دین۔ ص 120۔ لاہور: اسلامک پبلی کیشنز (1999)۔ www.quranurdu.com (ac. 30 Sep 2007)

[5] اشرف علی تھانوی۔ تجدید تصوف و سلوک بحوالہ شریعت و طریقت۔

[6] خواجہ عبدالحکیم انصاری۔ اسباب زوال۔ www.toheedia.net (ac. 3 May 2011)

[7] Islam and Mystycism بحوالہ اقبال اور تصوف۔

باب 20: ماڈیول CS05 کا خلاصہ

ذیل میں ہم ایک چارٹ پیش کر رہے ہیں جس میں اب تک ہم نے اہل تصوف اور ناقدین تصوف کے اختلافات کا جو مطالعہ کیا ہے، اس کا ایک خلاصہ آ جائے گا۔

	اہل تصوف	ناقدین تصوف
مسلم آبادی کا اندازہ	اکثریت	اقلیت
زیر اثر علاقے	جنوبی ایشیا، وسطی ایشیا، مشرقی یورپ، شمالی و وسطی افریقہ، جنوب مشرقی ایشیا	مشرق وسطی اور شمالی امریکہ کے مسلمانوں میں اکثریت جبکہ بقیہ ممالک میں اقلیت
توحید، رسالت، آخرت	مانتے ہیں	مانتے ہیں
وحدت الوجود	اکثر صوفیاء قائل ہیں، بعض وحدت الشہود کے قائل ہیں	وحدت الوجود و شہود سبھی کے مخالف ہیں
کشف و الہام	اعتماد کرتے ہیں	اعتماد نہیں کرتے مگر کشف و الہام کے وجود کو مانتے ہیں
جنت و جہنم	قائل ہیں، بعض صوفیاء تحقیر کرتے ہیں	مانتے ہیں
شفاعت	اعتماد کرتے ہیں	اعتماد نہیں کرتے مگر شفاعت کیے جانے کے قائل ہیں
مرشد کی نفسیاتی غلامی	بنیادی اصول ہے	سخت مخالف ہیں
تزکیہ نفس کے طریقے	مجاہدات، اوراد، وظائف، ریاضتیں، مراقبہ	قرآن و سنت کی تعلیم، خود احتسابی
ترک دنیا	اکثر صوفیاء قائل ہیں، بعض قائل نہیں	سخت مخالف ہیں
معیار تقوی	بہت بلند ہے	نارمل ہے
اوراد و اشغال	سختی سے پابندی کی جاتی ہے	پابندی نہیں کی جاتی سوائے چند مسنون اذکار کے

	اہل تصوف	ناقدین تصوف
نفس کے درجات	امارہ، لوامہ اور مطمئنہ نفس کے تین درجات ہیں۔ امارہ پہلا، لوامہ دوسرا اور مطمئنہ تیسرا درجہ ہے	امارہ برا نفس ہے، لوامہ اچھا نفس ہے جو برائی پر ملامت کرتا ہے، مطمئنہ وہ لوامہ ہے جو امارہ پر غالب آئے
مخفی علوم اور علم لدنی	بالعموم قائل ہیں	بالعموم قائل نہیں
جعلی اور ضعیف احادیث	بکثرت بیان کرتے ہیں	سخت مخالف ہیں
پابندی شریعت	اکثر صوفیاء پابندی شریعت کے قائل ہیں، ایک گروہ قائل نہیں	سختی سے قائل ہیں
باطنی نظام حکومت	قائل ہیں	سخت مخالف ہیں
مشاہدہ حق	بعض صوفیاء دنیا میں دیدار الہی کے قائل ہیں	قطعاً قائل نہیں
عملیات اور کرامتیں	اکثر صوفیاء ان کے حصول میں مشغول رہتے ہیں	مخالفت کرتے ہیں

تعمیر شخصیت

وہ شخص جو اپنے گروہ کو حق و باطل کا معیار بناتا ہے، متعصب کہلاتا ہے۔ تعصب حق پرستی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

اگلا ماڈیول

اس ماڈیول میں ہم نے تفصیل سے اہل تصوف اور ان کے ناقدین کے مابین اختلافات کا جائزہ لیا ہے۔ اگلے ماڈیول میں ہم انشاء اللہ مختلف قسم کی دینی تحریکوں کا مطالعہ کریں گے اور یہ دیکھیں گے کہ وہ کن نظریات کی تبلیغ کرتی ہیں اور ان کے باہمی تعلقات کیسے ہیں؟

تعمیر شخصیت

دوسروں کے ساتھ مہربانی سے پیش آیئے۔ اللہ آپ کے ساتھ مہربانی سے پیش آئے گا۔

ببلیو گرافی

قرآن وحدیث

1. قرآن مجید
2. ابن ماجہ۔**السنن**۔ (ac. 3 Oct 2011) http://www.almeshkat.net/books/
3. احمد بن حنبل۔**المسند**۔ (ac. 3 Oct 2011) http://www.almeshkat.net/books/
4. حاکم نیشاپوری۔**المستدرک علی الصحیحین**۔ (ac. 3 Oct 2011) http://www.almeshkat.net/books/
5. مالک بن انس۔**الموطا**۔ (ac. 3 Oct 2011) http://www.almeshkat.net/books/
6. محمد بن اسماعیل بخاری(194-256/810-870) ۔**الجامع الصحیح**۔ (ac. 3 Oct 2011) http://www.almeshkat.net/books/
7. محمد بن عیسی الترمذی(209-279/824-892)۔**السنن**۔(ac. 3 Oct 2011) http://www.almeshkat.net/books/
8. مسلم بن حجاج(204-261/819-875)۔**الجامع الصحیح**۔(ac. 3 Oct 2011) http://www.almeshkat.net/books/

قدیم اہل علم کی کتب

9. ابن القیم الجوزیہ(691-751/1292-1350)۔(تہذیب: عبدالمنعم صالح علی عزی)۔تهذيب مدارج السالكين۔ قاہرہ: دار البشیر (1997) (ac. 13 Oct 2011) www.waqfeya.com
10. ابن القیم الجوزیہ(691-751/1292-1350)۔مدارج السالكين۔بیروت: دار الکتب العلمیہ۔ (ac. 6 Oct 2011) www.waqfeya.com
11. ابن جریر طبری(d. 310/922)۔**تاریخ الامم والملوک**۔ مصر: دار المعارف۔ (ac. 1 Sep 2007) www.waqfeya.com
12. ابن جوزی(اردو ترجمہ: ابو محمد عبدالحق)۔**تلبیس ابلیس**۔لاہور: مکتبہ اسلامیہ۔(ac. 3 June 2011) www.kitabosunnat.com
13. ابن سعد(d. 230/845)۔**الطبقات الکبیر**۔ قاہرہ: مکتبہ الخانجی۔ (ac. 1 Sep 2007) www.waqfeya.com
14. ابن عربی(558-638/1164-1240)۔(تحقیق: ابو العلاء عفیفی) فصوص الحكم۔بیروت: دار الکتاب العربی۔ www.islamic-sufism.com (ac. 13 Oct 2011)
15. ابن عربی(558-638/1164-1240)۔الإنسان الكامل۔ (ac. 22 Apr 2011) www.4shared.com
16. ابن عربی۔(تحقیق: سعید عبدالفتاح) شق الجيب بعلم الغيب۔ قاہرہ: الانتشار العربی۔ (ac. 22 Apr 2011) www.4shared.com
17. ابن عربی۔(جمع وتالیف: محمود محمود الغراب)۔الحب والمحبة الإلهية۔دمشق: مطبعۃ الکاتب العربی(1992) (ac. 13 Oct 2011) www.ibnalarabi.com
18. ابن عربی۔الفتوحات المكية۔ (ac. 11 Mar 2007) www.4shared.com
19. ابن عربی۔تفليس إبليس۔ قاہرہ: مکتبہ عالم الفکر۔(ac. 22 Apr 2011) www.4shared.com

20. ابن قتیبہ الدینوری۔المعارف۔ (ac. 13 May 2011) www.al-mostafa.com

21. ابو القاسم القشیری(376-465/986-1072)۔(تحقیق: عبدالحلیم محمود اور محمود بن شریف)۔الرسالة القشيرية۔ قاہرہ: مؤسسہ دار الشعب(1989) (ac. 13 May 2011) www.al-mostafa.com

22. ابو حامد غزالی(450-505/1058-1111) (ترجمہ: ندیم الواجدی)۔احیاء العلوم الدین۔ کراچی: دار الاشاعت۔ (13 Oct 2011) www.scribd.org

23. ابو حامد غزالی۔(اردو ترجمہ: ابو الواصف عطاری) منهاج العارفين۔ (ac. 27 May 2011) www.faizaneattar.net

24. ابو حامد غزالی۔(اردو ترجمہ: سید ممتاز علی 1890) المنقذ من الضلال۔

25. ابو حامد غزالی۔(تحقیق: جمیل صلیبا، کامل عیاد) المنقذ من الضلال۔بیروت: دار الاندلس (1967) (ac. 13 Oct 2011) www.ghazali.org

26. ابو حامد غزالی۔أحياء العلوم الدين (عربی)۔ (ac. 22 Apr 2010) http://www.almeshkat.net/books/

27. ابو حامد غزالی۔أصناف المغرورين. (ac. 22 Apr 2010) www.scribd.com

28. ابو طالب مکی(d. 386/996)۔(تحقیق: عبد المنعم الحفنی) قوت القلوب۔ قاہرہ: دار الرشید(1991)۔ (ac. 22 Apr 2011) www.4shared.com

29. ابو نعیم اصفہانی(336-430/947-1038)۔حلية الأولياء وطبقات الأصفياء۔بیروت: دار الکتب العلمیہ(1988)۔ (ac. 13 Oct 2011) http://www.archive.org/details/hilyah

30. ابو یزید بسطامی(188-260/804-874)۔(تحقیق: قاسم محمد عباس)۔المجموعة الصوفية الكاملة ويليها كتاب تأويل الشطح۔ دمشق: دار المدی(2004)۔(ac. 22 Apr 2011) www.4shared.com

31. احمد زروق الفاسی(846-899/1442-1493)۔قواعد التصوف۔ (ac. 28 Mar 2007) www.scribd.com

32. احمد سرہندی المعروف بہ: مجدد الف ثانی(971-1034/1564-1624) (ترجمہ: محمد سعید احمد نقشبندی)۔مکتوبات امام ربانی۔ کراچی: مدینہ پبلشنگ کمپنی۔ (13 Oct 2011) www.archive.org

33. امیر علاء سنجری(ترجمہ: شمس بریلوی)۔فوائد الفوائد۔ دہلی: منظور بک ڈپو(1992) (13 Oct 2011) www.scribd.com

34. تقی الدین ابن تیمیہ(661-728/1263-1327)۔(ترجمہ: عبد الرزاق ملیح آبادی)۔اصحاب صفہ اور تصوف کی حقیقت۔لاہور: مکتبہ سلفیہ۔ (ac. 27 Apr 2011) www.kitabosunnat.com

35. تقی الدین ابن تیمیہ۔ مجموعۃ الفتاوی۔ (ac. 27 Dec 2006) www.al-mishkat.org

36. جلال الدین سیوطی(849-911/1445-1505)۔الخبر الدال على وجود القطب والأوتاد والنجباء والأبدال (من كتاب الحاوي للفتاوى)۔ http://www.islamweb.net/newlibrary/display_book.php?flag=1&bk_no=130&ID=566 (ac. 13 Oct 2011)

37. حکیم ترمذی(d. 320/932)۔(تحقیق: عبد الفتاح عبد اللہ برکہ)۔آداب المريدين وبيان الكسب۔ قاہرہ: مطبعۃ سعادۃ۔ http://attaweel.com/vb/showthread.php?t=27361 (ac. 13 Oct 2011)

38. شاہ ولی اللہ(1703-1762)۔ تفہیمات (عربی)۔ بجنور: مدینہ برقی پریس(1936)۔

39. شہاب الدین سہروردی(543-632/1148-1234)۔(تحقیق: عبد الحلیم محمود اور محمود بن شریف)۔عوارف المعارف. قاہرہ: دار المعارف۔ (ac. 6 May 2011) www.al-mostafa.com

40. عبد الرزاق بن احمد الکاشانی(d. 730/1330)۔شرح منازل السائرين لهروي۔ مخطوطہ۔(ac. 22 Apr 2011) www.4shared.com

41. عبد القادر جیلانی(470-561/1077-1166)۔فتوح الغیب۔ (ac. 31 May 2007) www.al-mostafa.com

42. عبد الکریم الجیلی(767-826/1365-1423)۔(تحقیق: صلاح بن محمد بن عویضہ)۔الإنسان الكامل في معرفة الأواخر والأوائل۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ(1998) (ac. 13 Oct 2011) www.al-mostafa.info

43. عبد اللہ انصاری الہروی(396-481/1006-1089)۔منازل السائرین۔بیروت: دار الکتب العلمیہ(1998)۔ www.al-mostafa.com (ac. 6 May 2011)

44. عبد الوہاب الشعرانی۔الطبقات الکبری۔ (ac. 6 May 2011) www.al-mostafa.com

45. عبد الوہاب الشعرانی۔کتاب المیزان للعارف۔ (ac. 14 May 2011) www.al-mostafa.com

46. محمد بن حسین السلمی(d. 412/1021)۔(تحقیق: مصطفی عبد القادر عطاء) طبقات الصوفية ويليه ذكر النسوة المتعبدات الصوفيات۔بیروت: دار الکتب العلمیہ (2002)

جدید اہل تصوف کی کتب

47. احمد بن مصطفی العلوی۔منہاج التصوف۔ (ac. 22 Apr 2011) www.islamic-sufism.com

48. احمد رضا خان بریلوی۔عورتیں اور مزارات کی حاضری۔کراچی: مکتبۃ المدینہ۔(ac. 27 May 2011) www.faizaneattar.net

49. احمد رضا خان بریلوی۔فتاوی افریقہ۔فیصل آباد: مکتبۃ نوریہ رضویہ۔(ac. 3 May 2010) www.nafseislam.com

50. احمد سعید کاظمی۔وحدت الوجود کیا ہے؟ (ac. 3 Aug 2008) www.alahazratnetwork.org

51. احمد سکیرج الانصاری الخزرجی۔مفتاح الفتوحات المکیۃ۔ (ac. 14 July 2007) www.4shared.com

52. ارشد القادری۔زلزلہ۔ (ac. 11 July 2011) www.rehmani.net

53. حکیم محمد اختر۔ولی اللہ بننے کے پانچ نسخے۔ (ac. 4 June 2008) www.khanqah.org

54. خواجہ عبد الحکیم انصاری۔آداب سلوک۔ (ac. 3 May 2011) www.toheedia.net

55. خواجہ عبد الحکیم انصاری۔اسباب زوال۔ (ac. 3 May 2011) www.toheedia.net

56. خواجہ عبد الحکیم انصاری۔حقیقت وحدت الوجود۔ (ac. 3 May 2011) www.toheedia.net

57. خواجہ عبد الحکیم انصاری۔روحانی سفر۔ (ac. 3 May 2011) www.toheedia.net

58. خواجہ عبد الحکیم انصاری۔صوفی ازم۔ (ac. 3 May 2011) www.toheedia.net

59. ریاض احمد گوہر شاہی۔روحانی سفر۔ (ac. 23 May 2011) www.goharshahi.pk

60. ریاض احمد گوہر شاہی۔روشناس۔ (ac. 23 May 2011) www.goharshahi.pk

61. ریاض احمد گوہر شاہی۔مینارہ نور۔ (ac. 23 May 2011) www.goharshahi.pk

62. ریاض احمد گوہر شاہی۔ **دین الٰہی**۔ www.goharshahi.pk (ac. 23 May 2011)

63. سید ابوالحسن علی ندوی۔ "**حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے حالات و کمالات**۔" ماہنامہ نظریہ پاکستان، مئی 2010

64. سید ابوالحسن علی ندوی۔ **تاریخ دعوت و عزیمت**۔ www.kitabosunnat.com (ac. 30 Sep 2011)

65. سید شبیر احمد کاکاخیل۔ **تصوف سے متعلق عام پوچھے جانے والے سوالات**۔ راولپنڈی: خانقاہ امدادیہ۔ www.tazkia.org (ac. 24 Apr 2011)

66. سید شبیر احمد کاکاخیل۔ **زبدۃ التصوف**۔ راولپنڈی: خانقاہ امدادیہ۔ www.tazkia.org (ac. 24 Apr 2011)

67. سید شبیر احمد کاکاخیل۔ **فہم التصوف**۔ راولپنڈی: خانقاہ امدادیہ۔ www.tazkia.org (ac. 24 Apr 2011)

68. سید شبیر احمد کاکاخیل۔ **مکائد شیطان**۔ راولپنڈی: خانقاہ امدادیہ۔ www.tazkia.org (ac. 24 Apr 2011)

69. شاہ گل حسن۔ **تذکرہ غوثیہ**۔ کراچی: دار الاشاعت۔ http://www.urduweb.org (ac. 13 Oct 2011)

70. شاہ ولی اللہ (1703-1762)۔ **حجۃ اللہ البالغہ**۔ بیروت: دار الجیل (2005)۔ www.waqfeya.com (ac. 11 Jan 2007)

71. عبد الرحمن بدوی۔ ابن العربي: حياته ومذهبه۔ قاہرہ: مکتبۃ الانجلو المصریہ (1965)۔ www.4shared.com (ac. 13 Oct 2011)

72. عبد القادر عیسی۔ حقائق عن التصوف۔ حلب: دار العرفان۔ www.daraleman.org (ac. 11 Mar 2006)

73. مجلس علمی۔ آداب مرشد کامل۔ www.dawateislami.net (ac. 4 June 2008)

74. محمد اقبال ہوشیار پوری۔ **اکابر کا سلوک و احسان**۔ لاہور: ادارہ اسلامیات۔ www.ahlehaq.org (ac. 13 Oct 2011)

75. محمد الیاس قادری۔ **پیٹ کا قفل مدینہ**۔ www.dawateislami.net (ac. 20 May 2011)

76. محمد زکریا کاندھلوی۔ **فضائل اعمال**۔ www.4shared.com (ac. 13 Oct 2011)

77. محمد طاہر القادری۔ **تبرک کی شرعی حیثیت**۔ لاہور: منہاج القرآن پبلی کیشنز (2006)۔ www.minhajbooks.com (ac. 3 May 2011)

78. محمد طاہر القادری۔ **تذکرے اور صحبتیں**۔ لاہور: منہاج القرآن پبلی کیشنز (2008)۔ www.minhajbooks.com (ac. 3 May 2011)

79. نظام الدین شامزئی۔ **فتنہ گوہر شاہی**۔ کراچی: مکتبہ لدھیانوی (2000)

80. ولید عبد اللہ۔ الفكر الصوفي عند النفري۔ المنتدی الثقافی العراقی فی دمشق 26 Aug 2000۔ www.islamic-sufism.com (ac. 13 Oct 2011)

81. یوسف سلیم چشتی۔ **اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش**۔ لاہور: مرکزی انجمن خدام القرآن۔ http://www.tanzeem.org/books/indexbo.asp (ac. 13 Oct 2011)

82. Al-Kasnazan, Muhammad. ***The Book of Attariqa Al-Alya Al-Qadriya Al-Kasnazaniya.*** www.kasnazan.com (ac. 2 May 2011)

83. Anjuman Sarfaroshan Islam. ***Syedna Riaz Ahmed Gohar Shahi: An Introduction.*** www.sarfarosh.com (ac. 2 May 2011)

ناقدین تصوف کی کتب

84. ابن لعل دین۔ **گوہر شاہی کی گوہر افشانیاں**۔ لاہور: دار التوحید۔ www.kitabosunnat.com (ac. 27 Apr 2011)

85. احسان الٰہی ظہیر۔ **تصوف: تاریخ و حقائق**۔ لاہور: ادارہ ترجمان السنۃ۔ www.kitabosunnat.com (ac. 27 Apr 2011)

86. امیر حمزہ۔ **آسمانی جنت اور درباری جہنم**۔ لاہور: دار الاندلس۔ www.kitabosunnat.com (ac. 27 Apr 2011)

87. امین احسن اصلاحی۔ **تزکیہ نفس**۔ فیصل آباد: ملک سنز۔ http://www.quranurdu.com(ac. 5 May 2008)

88. باذوق۔ **صوفی کون ہیں؟** http://www.urduvb.com/forum/showthread.php?t=1013 (ac. 6 Oct 2011)

89. ریحان احمد یوسفی۔ انسان کا مسئلہ۔ (ac. 22 May 2011) www.ishraqdawah.org

90. سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ **تجدید و احیائے دین**۔ لاہور: اسلامک پبلی کیشنز(1999)۔ (ac. 30 Sep 2007) www.quranurdu.com

91. سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ **تفہیم القرآن**۔ لاہور: اسلامک پبلی کیشنز۔(ac. 31 Dec 2009) www.quranurdu.com

92. طارق عبدالحلیم اور محمد العبدہ(ترجمہ: مدثر احمد لودھی)۔ **صوفیت کی ابتدا اور ارتقاء**۔(ac. 27 Apr 2011) www.kitabosunnat.com

93. عبدالرحمن عبدالخالق(ترجمہ: صفی الرحمن مبارک پوری)۔ **اہل تصوف کی کارستانیاں**۔ راولپنڈی: تنظیم الدعوۃ الی القرآن والسنۃ۔ www.kitabosunnat.com (ac. 27 Apr 2011)

94. عبدالرحمن کیلانی۔ **روح عذاب قبر اور سماع موتی**۔ لاہور: مکتبہ السلام(2005)۔ (ac. 27 Apr 2011) www.kitabosunnat.com

95. عبدالرحمن کیلانی۔ **شریعت و طریقت**۔ لاہور: مکتبہ السلام(2006)۔(ac. 27 Apr 2011) www.kitabosunnat.com

96. عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز۔ **تعویذ اور دم کے متعلق فتوی**۔ (ac. 1 May 2011) www.asliahlesunnat.com

97. عبیدالرحمن محمدی۔ **تبلیغی جماعت کا تحقیقی جائزہ**۔ لاہور: دار الاندلس۔(ac. 27 Apr 2011) www.kitabosunnat.com

98. عطاءاللہ ڈیروی۔ **صوفیت اور تبلیغی جماعت کا تباہ کن صوفیت کا عقیدہ**۔ (ac. 22 May 2008) www.ahya.org

99. محمد عزیر شمس۔ **مقدمہ زیارت قبر نبوی**۔ گوجرانوالہ: ام القری پبلی کیشنز(2010)

100. مقصود احمد۔ **پاکپتن کے بہشتی دروازے کی شرعی حیثیت**۔ اسلام آباد: مرکز دعوۃ التوحید۔ (ac. 27 Apr 2011) www.kitabosunnat.com

غیر جانبدار کتب

101. شبلی نعمانی۔ **سوانح مولانا روم**۔ کان پور: نامی پریس(1906)

102. Ahluwalia, Manjit Singh. ***Influence of Islam and Sufism on Sikhism.*** www.sikhinstitute.org (ac. 9 May 2011)

103. Underhill, Evelyn . ***Mysticism: A Study in the Nature and Development of Spiritual Consciousness.*** www.archive.net (ac. 22 Apr 2011)

تعمیر شخصیت
اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کیجیے۔ ان کا حق خدا کے بعد سب سے اہم ہے۔